اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ

جلد سوم

"رضا کار" بک ڈپو لاہور

قیمت چار روپے

نذرِ عقیدت

کردہ ام ایں نذرِ مولائے نجف
گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

اللّٰھم صلِّ علیٰ امیرِ المؤمنین و وصی رسولِ ربّ العالمین
عبدکؐ و ولیّکؐ واخی رسولکؐ و حجّتکؐ علیٰ خلقکؐ
وایتکؐ الکبریٰ والنّباء العظیم

الحمد للہِ الّذی جعلنا من المتمسّکین
بولایت امیر المومنین علی بن ابی طالب
علیہ السّلام

خاکپائے غلامانِ علیؑ
محمّد لطیف انصاری

حفظ کن تاریخ را پائندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو
اقبال

اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ

جلد سوم

حضرت علی مرتضیٰؑ و حضرت حسن مجتبیٰؑ

ارواحنا لہما الفدا

شیعہ نقطۂ نظر سے

سنہ ۱۳۸۶ھ — سنہ ۱۹۶۶ء

تالیف

پروفیسر خواجہ محمد لطیف انصاری

ناشر

رضاکار بک ڈپو لاہور

ضروری گذارش

مسلمانوں کے کسی فرد یا جماعت کی ذمہ داری اسلام پر نہیں عائد ہوتی اسلامی تعلیم کا نمونہ صرف سرکارِ رسالت محمد مصطفےٰؐ اور اہنا ئہ انفد اکا عمل ہے یا ایسے رہنمایان اسلام کی سیرت جو مذہبی طور پر معصوم مانے جاتے ہوں اور منصوص من اللہ ہوں اور وہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام ہیں۔ سرکارِ رسالتؐ کے بعد عموماً جو مسلمان سلطنتیں قائم ہوئیں، ان کے کارپرداز بالاتفاق معصوم نہیں تھے، اس لیے ان کے عمل سے اسلامی تعلیم کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا زیادتی ہے نیز ایسی سلطنتوں کی تاریخ کو ہم اسلام کی تاریخ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اس طرز کی تاریخ دراصل مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی تاریخ اسلام کی تاریخ ہے۔

محمد لطیف انصاری

عرضِ ناشر

ملت کے صاحبانِ فکر و نظر نے رضا کار بک ڈپو کی مطبوعات کی جو قدر افزائی فرمائی ہے وہ ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔

ہم ہر کتاب کی طباعت سے پہلے، اس کے موضوع، مواد اور اسلوبِ تحریر پر کافی غور و خوض کرتے ہیں۔ پھر کتابت، طباعت اور قیمت میں اپنی مطبوعات پڑھنے والوں کا احترام ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔

اس سے پیشتر ہم "ترجمہ اصل و اصولِ شیعہ" "اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ حصہ اول و دوم" "گلستانِ حکمت" "شہید دل کی باتیں" "لغات المذہب" وغیرہ کتابیں شائع کر چکے ہیں اور اب افرادِ قوم کی ہمت افزائی سے متاثر ہو کر "اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ حصہ سوم" تالیف پروفیسر خواجہ محمد لطیف صاحب قبلہ انصاری آپ کی نذر کر رہے ہیں۔ یقین ہے کہ خواجہ صاحب قبلہ کی یہ تالیف اور ہماری خدمت اربابِ ملت قدر کی نظر سے دیکھیں گے۔

اگر خدا نے مدد کی تو انشاء اللہ ہم قوم و ملت کی علمی خدمت میں چند بیش بہا علمی تخلیقات پیش کرنے میں کامیابی حاصل کریں گے۔

محمد صدیق

الحق مع علی و علی مع الحق یدور معہ حیثما دار (حدیث نبوی)

(حق علیؑ کے ساتھ ہے اور علیؑ حق کے ساتھ ہے حق اسی طرف پھرتا ہے جدھر علیؑ پھرے)

(متفق علیہ)

اسلام کی تاریخ

(شیعہ نقطۂ نظر سے)

دور حضرت علی مرتضیٰؑ

ارواحنا لہ الفدا

۱۸ ذی الحجۃ الحرام ۳۵ھ تا ۲۰ رمضان المبارک ۴۰ھ

۱۷ جون ۶۵۶ء تا ۲۹ جنوری ۶۶۱ء

علی ولی من الاولیاء امام الھدیٰ سید الاوصیاء امیر البر ایاء

جزیل العطایا، کریم السجایا، منی الاتقیاء

جمع اللہ لہ من شرف و فضل

ما بہ خص سوی احمد من کل نبی

(مفتی میر محمد عباس اعلی اللہ مقامہ)

منقبت

مانال ذو فطنة بالفکر لعبدمدة
ماقال مرتجلاً فی الوعظ والخطب
نورٌ من اللہ الا انہ بشر
نفس نبی ولٰکن لایقال نبی

مُفتی میر محمد عباس
اعلی اللہ مقامہ

تعارف

اس سے پیشتر "اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ" کے دو حصے شائع ہو چکے ہیں ان دو حصوں میں عہدِ نبوی سے لے کر حضرات خلفائے ثلاثہ کے عہد تک کے تمام حالات پوری شرح و بسط کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔

اب حصہ سوئم میں حضرت امیر المومنینؑ کی ولادت سے لے کر شہادت تک کے تمام حالات پر بالتفصیل روشنی ڈالی گئی ہے۔ رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد امیرالمومنین حضرت علیؑ پر کیا گزری؛ حضرات خلفائے ثلاثہ کے زمانہ حکومت میں حضرت کو کیا مصائب جھیلنے پڑے اور کن دشوار گزار منزلوں سے گزرنا پڑا لیکن اس کے باوجود آپ نے اسلام اور مسلمان حکومتوں کو تباہی و بربادی سے بچانے کے لیے کیا کیا کاوشیں کیں، ان پر پوری شرح و بسط اور تحقیق و تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

پیغمبرِ خداؐ کی وفات کے بعد ۲۵ برس تک خلافت نبوی کو کن کن حالات سے دوچار ہونا پڑا اور جب خلافتِ نبوی علیؑ کے ہاتھوں میں آئی تو باوجود اس کے کہ حالات انتہائی نامساعد تھے۔ طبیعتیں متغیر اور اسلامی تعلیمات بھلائی جا چکی تھیں مگر آپ نے زمامِ حکومت سنبھالتے ہی "عہدِ نبوی" کی یاد تازہ کر دی اور تاریخ شہادت دیتی ہے کہ اس دور کے مسلمان ایسا محسوس کرنے لگے تھے جیسے عہدِ نبوی پھر لوٹ آیا ہے۔

حضرت کی بیعت اور جنگِ جمل کا تفصیلی تذکرہ۔ امیر معاویہ کی بغاوت اور جنگِ صفین۔ پھر جنگِ نہروان کی تفصیلات ــــ ہر واقعہ کے اسباب و علل اور ان کے نتائج پر تبصرہ، امیرالمومنینؑ کی زندگی کے آخری حالات جانکاہ واقعۂ شہادت، آپ کی سیاست پر دشمنوں کے اعتراضات اور ان کے تحقیقی جوابات غرضیکہ امیرالمومنینؑ کی حیاتِ طیبہ کا کوئی قابلِ ذکر واقعہ ایسا نہیں ہے جو اس میں درج نہ ہو۔

پھر اس حصہ میں حضرت امام حسنؑ کی ولادت باسعادت سے لے کر آپ کے عہدِ خلافت اور زندگی کے دیگر واقعات پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ چھ ماہ کی مختصر مدتِ خلافت میں آپ پر کیا بیتی، مملکتِ اسلامیہ کو سدھارنے کیلئے آپ نے کیسی کیسی جانکاہ کوششیں کیں دشمنوں کے مکر و فریب اور دوستوں کی منافقت کا کیا عالم تھا، جاں نثارانِ امامؑ کن کن ہولناک مصائب میں مبتلا تھے، صلح کی تحریک امیر معاویہ کی طرف سے ہوئی تھی یا خود آپ کی طرف سے؟ کن اسباب کے تحت آپ نے صلح کی؟ ان تمام واقعات پر تاریخ کی روشنی میں محققانہ بحث کی گئی ہے پھر اموی حکومت کی سازش سے آپکو زہر دیکر شہید کر دیا گیا غرضیکہ امام حسنؑ کی زندگی کے تمام واقعات کو اسمیں درج کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر تیسری جلد کے مطالعہ سے شیعہ طلباء و طالبات عہدِ امیرالمومنینؑ اور حضرت امام حسنؑ کے تمام واقعات سے تاریخی حقائق کی روشنی میں مکمل طور پر آگاہی حاصل کر سکیں گے یقین ہے ہماری یہ پیش کش شیعہ طلباء و طالبات کے لیے انتہائی طور پر سود مند ثابت ہوگی۔ اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے عام حلقوں کو بھی اس کے مطالعہ سے فائدہ پہنچے گا۔

(صدیق)

فہرست

مسلمِ اوّل شہِ مرداں علیؓ — عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ
از ولائے دودمانش زندہ ام — در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام

(علامہ اقبالؒ)

تذکرۃُ المرتضیٰ

نام، کُنیت والقابات

اسمار آپ کا اسمِ سامی علیؑ ہے۔ اللہ کے اسمائے حُسنیٰ میں سے ایک اسم "العلیٰ" ہے۔ یہ اسمِ مبارک اسی سے مشتق ہے۔ چنانچہ حدیث شریف شبِ معراج میں سرکارِ رسالتؐ سے منقول ہے کہ شبِ معراج میرے پروردگار نے مجھ سے فرمایا:۔

اے محمدؐ! میں نے زمین والوں میں سے تجھے برگزیدہ کیا۔ اور اپنے ناموں میں سے ایک نام تیرے لیے مختص کیا۔ میں محمُود ہوں اور آپ محمدؐ ہیں۔ پھر میں نے دوبارہ زمین کے لوگوں کو دیکھا اور علیؑ ابن ابی طالبؑ کا انتخاب کیا اور اس کے لیے بھی ایک نام اپنے ناموں میں سے مختص کیا۔ پس میں اعلیٰ ہوں اور وہ علیؑ ہے۔[1]

روایت ہے کہ جب جناب امیرؑ پیدا ہوئے تو ابوطالبؑ نے کعبہ کا پردہ پکڑ کر یہ اشعار پڑھے:

---

[1] مناقب اخطب خوارزم، ارجح المطالب ص۱۰

ادعوك یاذو الغسق الدجیٰ والفلق المبلج المضیٔ
بین لنا حکمك المرضی ماذا تریٰ اسم ذا الصبی

"اے اندھیری رات اور صبح روشن کے مالک میں تجھے پکارتا ہوں، ہم سے اپنی رضا کا حکم فرما کہ اس شیر خوار بچّہ کا تیرے ہاں کیا نام ہے؟"

فہتفت بہ ھاتف :-

خاطبتنا بالولد السویٰ ، الطیب المہذب المرضی
ان اسمہ فی شوامخ العلیٰ ، علی اشتق من العلیٰ[1]

"ناگاہ غیب سے آواز آئی۔ تو نے ہم سے اس پاک، مہذب اور پسندیدہ بچہ کی نسبت پوچھا ہے، اس کا نام آسمان کی بلندیوں میں علیؑ (بلند) ہے جو اللہ کے نام "العلی" سے مشتق ہے۔"

یہ اسم بامسمیٰ ہے، علیؑ ہر رفعت، ہر شرف، ہر علو اور ہر فضیلت کے لحاظ سے علیؑ ہیں۔ اسی لیے مسلمان ہر مشکل میں انھیں یا علیؑ کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس سلسلہ میں مصنفِ شہیر رئیس احمد صاحب جعفری اسنی تحریر فرماتے ہیں:-

"میرا یہ عقیدہ ہے جس طرح اسلام اور داعئ اسلام علیہ التحیۃ والسلام کی ذات شیعوں اور سنیوں میں مشترک ہے۔ اسی طرح علیؑ اور حسنینؑ اور اہل بیت اطہارؑ کی ہستی گرامی بھی سنیوں اور شیعوں کا یکساں ناقابلِ تقسیم ترکہ ہے۔ آج سے ۱۶، ۱۷ سال پہلے لکھنؤ کی شیعہ سنّی آویزش کے زمانے میں مولانا ظفر علی خاں نے ایک بڑی اچھی نظم لکھی تھی۔ تلاش کے باوجود

---

[1] مناقب الصحابہ لفخر الاسلام ابوبکر محمد بن الحسین، ارجح المطالب ص ۱۱

اس وقت وہ دستیاب نہ ہو سکی، دو شعر حافظہ کے ذخیرہ میں محفوظ رہ گئے وہ پیش کرتا ہوں، انھیں پڑھیے اور واقعیت اور حقیقت کی داد دیجیے مولانا فرماتے ہیں :-

کچھ شیعوں ہی کے نہیں ہیں مشکلکشا علیؑ ٭ ہر رن میں نعرہ سُنّیوں کا بھی ہے یا علیؑ
جو دیدہ ور ہیں خاکِ درِ بوتراب ہیں ٭ اس میں ابوالکلام ہوں یا احمد رضا علیؑ

کیا یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت نہیں ہے[1]؟

علیؑ کے علاوہ آپ کے اسمائے گرامی اسد اور حیدر بھی ہیں۔ آپ کی والدہ معظمہ نے آپ کا نام اپنے باپ کے نام پر اسد رکھا[2]۔ آپ کی والدۂ محترمہ نے آپ کا نام حیدر بھی رکھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے خیبر کے روز اپنے رجز میں فرمایا ہے "میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر یعنی شیر رکھا"[3]۔

کنیت آپ کی مختلف کنیتیں ہیں، ابوالحسنؑ، ابوالحسینؑ، ابومحمدؐ، ابوالریحانتین، ابوتراب اور ابوالسبطین[4]۔

القابات کثرتِ القابات کثرتِ فضائل کی دلیل ہے۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام صاحبِ القاباتِ کثیرہ ہیں۔

امیرالمومنین[1]، امام المتقین[2]، ولی المتقین[3]، سید الصادقین[4]، سید المسلمین[5] سید المومنین[6]، سید العرب[7]، سید فی الدنیا والآخرۃ[8] - قائد الغر المحجلین[9] (آپ سفید رو اہلِ جنت کے قائد ہیں)، یعسوب المومنین[10] (مومنوں کے سردار) صدیق[11] الاکبر فاروق[12] الاعظم

---

[1] نہج البلاغہ کا مکمل ترجمہ ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز "شذرات" ص۵ [2] الیواقیت لابی احمد زاہدی ارجح المطالب ص۹ [3] تذکرۃ الخواص الامہ، ارجح المطالب ص۹۔
[4] ارجح المطالب ص۱۱ تا ص۱۴

خاتم الوصیین[13]، خیر الوصیین[14]، الوصی[15]، امام البررہ[16] (نکوکاروں کا امام) قاتل الفجرہ[17] (بدکاروں کا قاتل) صاحب الرایہ[18] (علمدار) مقیم الحجہ[19] (دلیل قائم کرنے والا) اسد اللہ[20] (اللہ کا شیر) حجۃ اللہ[21] (خدا کے بندوں پر خدا کی ہستی کی دلیل) رایۃ الہدیٰ[21] (ہدایت کا علم) ولی اللہ[22] صفوۃ اللہ[23]، شیخ المہاجرین والانصار[24]، قسیم النار والجنۃ[25] (جنت اور دوزخ کا تقسیم کرنے والا) وارث رسول اللہ[26]، خلیفۃ رسول اللہ[27]، منار الایمان[28] امام الاولیاء[29]، الہادی[30]، صاحب اللواء[31] (علمدار) ناصر رسول اللہ[32]، صالح المومنین[33] مولی المومنین[34]، منجز الوعد[35] (وعدہ پورا کرنے والا) قاتل الناکثین و القاسطین و المارقین[36] المرتضیٰ[37]، الشاہد[38]، الشہید[39]، الراکع[40]، الساجد[41]، الصفی[42]، الامین[43]، باب حطہ[44] مثیل ہارون[45]، نفس الرسول[46]، سیف اللہ[47]، ذوالاذن الواعیہ[48]، قاضی دین رسول اللہ[49] (رسول اللہؐ کے قرض ادا کرنے والا) وزیر رسول اللہ[50]، خیر البشر[51]، ذوالقرنین[52]، خاصف النعل[53] (رسول اللہؐ کا جوتا گانٹھنے والا) الصادق[54]، المومن[55]، الانزع البطین[56]، العابد[57] الزاہد[58]، کاسر الاصنام[59]، السابق[60]، الحبیب[61]، الفاری[62]، بیضۃ البلاد[63]، المہدی[64] طود النہی[65] (محل دانش) دابۃ الجنۃ[66]، ایلیا[67]، قباب عین الفتنہ[68]، امیر النحل[69] ذوالبرقۃ[70]، مثیل عیسیٰ[71] وغیرہا۔

اشعار

یا علیؑ نام تو خود نام حق است   ایں چو مصدر آمد آں چوں مشتق است

جلوہ گر چوں در تو نام خویش یافت   بہر تو نامے ز نام خود بشگافت

ذات تو زاں ذات مشتق آمدہ   نام تو زاں ذات مشتق آمدہ

ہمچو نام و ذات سبحاں اے ولی   نام تو چو ذات تو آمد علیؑ

(مظفر علی شاہ)

نسب (توارث صفات)

حضرت علی مرتضیٰؓ اور اجداد امجاد کا سلسلۂ نسب یہ ہے :-

علیؓ ابن ابی طالبؑ بن عبد المطلبؑ بن ہاشمؑ بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی - لوی کے بعد شجرۂ نسب اس طرح ہے، غالب بن فہر بن مالک بن نزر بن کنانہ بن خزیمہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان بن اد بن ادد بن اعور بن الیاسین بن الہمیسع بن سلیمان بن النساب بن حمل بن قیدار بن اسمٰعیلؑ ذبیح بن ابراہیم خلیل علیہ السلام -

چونکہ ابو طالبؑ کی شادی اپنے چچا کی لڑکی سے ہوئی تھی اس لیے حضرت علیؓ نجیب الطرفین ہاشمی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔

خاندان ہاشم کو عرب و قبیلۂ قریش میں جو وقعت و عظمت حاصل تھی وہ محتاج اظہار نہیں، خانہ کعبہ کی خدمت اور اس کا اہتمام بنو ہاشم کا مخصوص طغرائے امتیاز تھا اور اس شرف کے باعث ان کو تمام عرب میں مذہبی سیادت حاصل تھی۔[1]

خاندان رسالت کو قرآن حکیم میں "شجرۂ طیبہ" کے معزز نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس خاندان میں آدمؑ سے قائمؑ تک کوئی مشرک و کافر نہیں ہوا، یہی دعائے خلیلؑ و ذبیحؑ علیہما السلام کا نتیجہ امت مسلمہ تھی جس میں سے خاتم الانبیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے۔

والد ماجد حضرت علی مرتضیٰؓ کے والد ابو طالبؑ[2] مکہ کے نہایت ذی اثر سردار تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ہی کی آغوش شفقت

---

[1] سیر الصحابہ جلد ۱ خلفائے راشدین ص ۲۶
[2] بعض لوگوں نے آپ کا نام نامی عمران بھی بتایا ہے۔

میں پرورش پائی تھی اور بعثت کے بعد ان ہی کے زیرِ حمایت مکّہ کے کفرستان میں دعوتِ حق کا اعلان کیا تھا۔ ابوطالب ہر موقعہ پر آپ کے لیے سینہ سپر رہے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کفار کے پنجۂ ظلم وستم سے محفوظ رکھا۔ مشرکینِ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پشت پناہی اور حمایت کے باعث ابوطالب اور ان کے خاندان کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں، ایک گھاٹی میں ان کو محصور کر دیا، کاروبار اور لین دین بند کر دیا، شادی بیاہ کے تعلقات منقطع کر لیے، کھانا پینا تک بند کر دیا غرض ہر طرح پریشان کیا مگر اس نیک طینت بزرگ نے آخری لمحۂ حیات تک اپنے عزیز بھتیجے کے سر سے دستِ شفقت نہ اٹھایا۔[۱]

حضرت علیؑ کے والد ابوطالبؑ نے اس وقت آنحضرت کو دامنِ سرپرستی میں لیا جب آپ نے ابھی گلشنِ حیات کی آٹھ ہی بہاریں دیکھی تھیں اور والدین اور دادا سب کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو چکے تھے، ابوطالبؑ کو حضورِ انور سے انتہائی انس تھا اسلیے انھوں نے آپ کو کفار کی چیرہ دستیوں سے مامون و محفوظ رکھا۔[۲]

ابرہہ بن صباح نے جب خانہ کعبہ کی تخریب کے لیے فوج کشی کی تھی اس وقت آپ کی عمر ۳۵ سال تھی۔ آپ نے عزم، ہمت، خلوص، ایثار و اعلیٰ نصب العین کے لیے آخری قربانی کی بے نظیر مثال پیش فرمائی۔ آپ روحانیت، اصلاحی جد و جہد، ذہنی و معاشرتی انقلاب کی حیرت انگیز تاریخ کے ایک قابلِ فخر معمار ہیں۔ آپ قریش کے بزرگ، مکّہ کے رئیس اور جزیرۃ العرب کے سردار ہیں اور الکشم بن صیفی عربی فلسفی کے الفاظ میں "سید العرب والعجم" ہیں۔

۱ـ سیر الصحابہ جلد ا خلفائے راشدین صـ ۲۶۶ و صـ ۲۶۷

۲ـ تاریخ اسلام مؤلفہ ابو نعیم عبد الحکیم خاں نشتر جالندھری و عبد الحمید صاحب حمید ایم۔ اے ایم۔ او۔ ایل صـ ۲۱۷

آپ سیاسی رہنماؤں، مذہبی پیشواؤں، ادیبوں، شاعروں، خطیبوں، مُصلحوں کی صفِ اوّل میں سرِ فہرست ہیں۔

نبوت و رسالت نے ان کی آغوش میں آنکھیں کھولیں۔ کروٹیں لیں، شباب کی منزلیں طے کیں۔

امامت و ولایت و شہادت ان کے سدا بہار چمن کے گُل سرسبد ہیں۔ ان کی تائید و قربانی سے دُنیا رسالت و امامت کے فیض سے متمتع ہوئی۔[1]

حضرت ابوطالبؑ عرب کے عظیم فلسفی تھے، جب عرب فلسفی اکثم بن صیفی سے پوچھا گیا کہ آپ نے حکمت و ریاست، حلیم و سرداری کس سے سیکھی؟ اس پر اکثم نے کہا:۔

"من حلیف الحلم والادب سیّد العجم والعرب ابی طالب بن عبد المطّلب۔"[2]

"میں نے یہ صفات حلم و ادب کے مالک عرب و عجم کے سردار ابوطالب بن عبدالمطلب سے حاصل کیے۔"

حضرت ابوطالبؑ کو حضور سرورِ کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے انتہا محبت تھی۔

کان یحبّه حُبّاً شدیداً لا یحبّه ولده وکان لا ینام الّا فی جنبه ویخرج فیخرج معه وصبّ ابوطالب صبابة لم یصب مثلها شیٔ۔[3]

---

[1] حکیم الٰہی مولفہ علامہ کانپوری مدظلہ العالی ص ۹ [2] ہدیۃ الادب ص ۲۵ حکیم الٰہی ص ۱۳
[3] طبقات ابن سعد ص ۷۵، حکیم الٰہی ص ۱۲

حضرت ابوطالبؑ کو رسولِ خدا سے شدید محبت تھی۔ آپ اپنی اولاد سے بھی ایسی محبت نہیں کرتے تھے، رسولِ خدا کو اپنے پہلو میں سلاتے، جہاں کہیں جاتے رسول اللہؐ کو اپنے ہمراہ لے جاتے، جیسا عشق ان کو رسول اللہؐ سے تھا ایسا تعلق خاطر کسی چیز سے نہ تھا۔

بعثتِ رسولؐ کے دسویں سال ۲۶ رجب کو حضرت ابوطالبؑ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ سرکارِ رسالتؐ آپ کی وفات سے بجید متاثر ہوئے۔ حضرتؐ نے اس سال کا نام عام الحزن (غم کا سال) رکھا اور فرمایا۔

"جب تک ابوطالبؑ زندہ تھے، قریش میری ایذا رسانی سے عاجز تھے۔"[1]

مقامِ صد افسوس و تاسف ہے کہ مسلمانوں کے ایک طبقہ نے ایسے محسنِ اسلام اور مربی و ناصرِ رسولؐ کو کافر و مشرک کہا، یہ ناشکر گزاری کی بدترین مثال ہے۔ اور اموی روایات کی کورانہ تقلید کا نتیجہ ہے۔ روایات بھی ایسی ہیں کہ جب انھیں معیارِ درایت پہ پرکھا جائے تو وہ مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔

مثال کے طور پر ہم یہاں سیرت ابن ہشام کی ایک روایت نقل کرتے ہیں:-

"رسول اللہؐ نے حضرت ابوطالب کی وفات کے وقت نہایت اصرار کے ساتھ ان کو کلمۂ توحید کی دعوت دی، اس پر ابوطالبؑ نے کہا، عزیز بھتیجے! اگر مجھے قریش کی طعنہ زنی کا خوف نہ ہوتا تو نہایت خوشی سے تمہاری دعوت قبول کر لیتا۔"[2]

---

[1] حکیم الٰہی ص ۱۲ و ص ۱۳ بحوالہ جمع کا ریخ

[2] سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۲۸ سیرۃ الصحابہ جلد الخلفائے راشدین ص ۲۶۷

ذرا اس روایت پر غور فرمائیے، رسول اللہؐ عین وقتِ وفات حضرت ابوطالب علیہ السلام کو کلمۂ توحید کی دعوت دے رہے ہیں اور حضرت ابوطالب اپنے عزیز اور محبوب بھتیجے کی پُر اصرار دعوتِ توحید کو قریش کی طعنہ زنی کے خوف سے بستر مرگ پر مسترد فرماتے ہیں۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

اس روایت کا نفسیاتی جائزہ لیجیے، کیا بستر مرگ پر ایک ذہین و عقیل انسان کو عاقبت کا خیال دامنگیر ہوتا ہے یا لوگوں کے طعن و تشنیع کا، ایک عامی جاہل بھی ایسے موقعہ پر طعن و تشنیع کا خیال نہیں کرے گا۔ بلکہ متوجہ الی اللہ ہوگا۔ طعن و تشنیع کا خیال جینے والوں کو ہوتا ہے مرنے والوں کو نہیں۔ اس مضحکہ خیز واقعہ کو لکھنے کے بعد صاحبِ سیر الصحابہ حاجی معین الدین صاحب ندوی لکھتے ہیں:-

"سیرت ابن ہشام میں حضرت عباس سے یہ بھی روایت ہے کہ نزع کی حالت میں کلمۂ توحید ان کی زبان پر تھا، مگر یہ روایت بہت کمزور ہے"[1]

ہم ان دونوں روایتوں کو اہلِ فکر کے غور و فکر کے حوالے کرتے ہیں، ہمارا تو عقیدہ حضرت ابوطالب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق یہ ہے کہ وہ دعائے خلیلؑ و ذبیح علیہما السلام کے لحاظ سے اس امتِ مسلمہ کی ایک فرد تھے، جس میں سے خاتم الانبیاء علیہ افضل التحیۃ والسلام کو مبعوث ہونا تھا، ان کا اسلام بلا واسطہ اسلام ابراہیمی تھا، اس لیے ان کے اعلانِ اسلام کی ضرورت نہ تھی، وہ حضرت اسماعیل کے آخری وصی تھے، انھوں نے حضرت ختمی مرتبت کی تصدیق اس طرح فرمائی تھی جس طرح حضرت موسیٰ کے آخری وصی حضرت یحییٰ علیہ السلام نے جناب مسیح علیہ السلام کی فرمائی۔ حضرت ابوطالبؑ کی سا...

---

[1] سیر الصحابہ جلد اخلفائے راشدین ص ۲۶۷

زندگی صداقتِ رسول کی عملی تصدیق تھی، اس لیے آیۂ من جاء بالصدق وصدق به الخ کے مصداق تھے، وہ ایسے معصوم تھے کہ اللہ ان کے افعال کو اپنا کر اپنے حبیب پر احسان جتلا رہا ہے۔

اگر حیاتِ مستعار نے مہلت دی اور حالات نے اجازت دی تو میرا ارادہ سیرت حضرت ابوطالب عمران علیہ الصلوٰۃ والرضوان پر ایک مبسوط تالیف کا ہے جس میں ایک مستقل باب عصمت ابی طالبؑ کے عنوان پر ہوگا، (عصمت سے مراد عصمت صغریٰ ہے) اور اموی افترا کی کماحقہ قلعی کھول کر رکھ دی جائے گی۔ آج سے بیس پچیس برس پہلے میرے چند مقالے اسی موضوع پر "رہنما کار" میں شائع ہو چکے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ ھو ولی التوفیق وبیدہٖ ازمۃ التحقیق۔

والدۂ محترمہ حضرت علیؑ کی والدۂ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت اسد نے بھی حضرت آمنہ کے اس یتیم و معصوم کی ماں کی طرح شفقت و محبت سے پرورش کی۔ مستند روایات کے مطابق وہ مسلمان ہوئیں (بلکہ تھیں) اور ہجرت کر کے مدینہ گئیں اور ان کا انتقال ہوا تو رسول اللہؐ نے کفن میں اپنی قمیص مبارک دی اور قبر میں لیٹ کر اس کو متبرک کیا، لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ ابوطالبؑ کے بعد میں سب سے زیادہ اسی نیک سیرت خاتون کا ممنونِ احسان ہوں[1]۔

آپ حضرت عبدالمطلب کے بھائی اسد کی صاحب زادی اور ہاشمی الاصل و معزز ترین معظمہ تھیں۔ رسول خداؐ ان سے اپنی حقیقی ماں کی طرح محبت کرتے تھے[2]۔

---

[1] سیر الصحابہ جلد ۱ خلفائے راشدین ص ۲۶۷ و ص ۲۶۸

[2] تاریخ اسلام مؤلفہ پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم و پروفیسر محمد شجاع الدین ایم۔اے ص ۲۴۳

انس بن مالک روایت کرتے ہیں جب فاطمہ بنت اسد بن ہاشم حضرت علی مرتضیٰ کی مادرِ مہربان نے انتقال فرمایا تو رسول اللہؐ ان کی میت کے پاس گئے، سرہانے بیٹھ گئے اور فرمایا "اے میری ماں خدا تجھ پر رحم کرے، تو میری ماں تھی، میری ماں کے بعد"[1]

تاریخ ولادت و جائے ولادت و خصوصیات

۳۰ عام الفیل (غالباً ۵۹۸ء یا ۶۰۰ء) میں جبکہ رسول اللہؐ کی عمر ۳۰ سال تھی ۱۳ رجب کے دن حضرت علیؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ حضرت کے والد اور والدہ نے بھی بُت پرستی نہیں کی اور حضرت نے بھی کبھی بُت کو نہیں پُوجا اسی وجہ سے حضرت علیؑ کا نام آتا ہے تو کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں، یعنی خدا نے ان کے چہرے کو ہمیشہ بُتوں کے سجدہ سے پاک رکھا ہے[2]

علامہ ابن حجر وغیرہ نے لکھا ہے، واخرج ابن سعد عن الحسن بن زید قال لم یعبد الاوثان قط لصغرہ ومن ثم یقال فیہ کرم اللہ وجھہ - حضرت علیؑ نے کبھی کسی بُت کو نہیں پُوجا، اسی لیے آپ کا نام لے کر لوگ کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں[3]

جائے ولادت حضرت علی علیہ السلام کی عظیم الشان اور مخصوص فضیلت ہے کہ خانۂ کعبہ میں پیدا ہوئے[4]

---

[1] اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، اسوۃ الرسول جلد ۲ صہ ۵۲۱ [2] نور الابصار صہ ۷۶ تاریخ الائمہ ۲۳۳
[3] صواعق محرقہ صہ ۷۲، تاریخ الائمہ صہ ۲۳۳ - [4] مروج الذہب جلد ۵ صہ ۱۸۵، ازالۃ الخفا مقصد ۲ صہ ۲۵۱، مطالب السئول صہ ۳۷، تاریخ الائمہ صہ ۲۳۳

اس ولادت کے متعلق کسی شاعر نے خوب کہا ہے :۔

هو الذی کان بیت الله مولده
فطهر البیت من ارجاس اوثان

"علیؑ وہ ہیں جن کی ولادت اللہ کے گھر میں ہوئی، علیؑ وہ ہیں جنھوں نے اللہ کے گھر کو بتوں کی نجاست سے پاک کیا۔"

حضرت علیؑ کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ خانہ کعبہ میں تشریف لے جاتے تھے اور بتوں کو توڑ پھوڑ کر عیب دار کر دیتے تھے۔[1]

حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فتح مکہ کے دن جب خانۂ کعبہ میں داخل ہوئے، تو انھوں نے دیکھا کہ خانۂ کعبہ بتوں سے اٹا ہوا ہے۔ اور اس میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی مورتیں بھی ہیں، آپ نے ان مورتوں کو الگ کر کے باقی بتوں کا صفایا کر دیا۔ جو بت بلندی پر نصب تھے ان کی صفائی کے لیے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے شانۂ اقدس پر چڑھا کر ان بتوں کو گرانے کا حکم دیا، انھوں نے ارشادِ نبویؐ کے مطابق ان بتوں کو پاش پاش کر ڈالا اور خانۂ کعبہ کی کامل تطہیر ہو گئی۔[2]

حلیۂ مبارک رزام بن سعد الضبی سے منقول ہے کہ میں نے اپنے والد کو جناب امیر علیہ السلام کا حلیہ بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ جناب امیر میانہ قد سے کچھ اونچے تھے، ان کے شانے اور بازو بھرے بھرے اور گھنی داڑھی تھی۔[3] قدامہ بن عتاب سے روایت ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کے شانہ کی ہڈی

---

[1] مسند احمد حنبل جلد ۱ صفحہ ۸۴، سیر الصحابہ جلد ۱ خلفائے راشدین صفحہ ۲۷۔

[2] حاکم نے اس واقعہ کو بہ تفصیل مستدرک میں درج کیا ہے لیکن اسے شب ہجرت کا واقعہ لکھا ہے جو درایۃً غلط ہے، یہ واقعہ فتح مکہ کا ہے۔ [3] اسد الغابہ، ارجح المطالب صفحہ ۲۲۵

چوڑی تھی، ان کے بازو بھرے بھرے اور کلائیاں باریک، ان کی رانیں پُر گوشت اور پنڈلیاں پتلی تھیں، میں نے ان کو جاڑے کے موسم میں دیکھا تھا، وہ قطری قمیص پہنے ہوئے تھے۔ اور قطری تہ بند باندھے ہوئے تھے، ان کا عمامہ سیاہ دھاریوں والا تھا۔[1]

ابو الحجاج سے مروی ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کو میں نے خطبہ پڑھتے دیکھا کہ سب لوگوں سے خوبصورت تھے۔ اور روایت ہے کہ ایسے تھے کہ اپنی ڈاڑھی کو نہیں رنگتے تھے، آہستہ چلتے تھے، ان کے دانت ہنسی سے کھلے رہتے تھے۔[2]

ابو اسحٰق سبیعی کا بیان ہے کہ میں نے جناب امیر علیہ السلام کو دیکھا ہے گویا کہ ان کے سر اور ڈاڑھی کے بال بالکل سفید تھے، اور کبھی ریش مبارک کو خضاب بھی کیا کرتے تھے۔[3] علامہ ابن عبد البر استیعاب میں امیر علیہ السلام کے متعلق لکھتے ہیں کہ میں نے کیا خوب ان کے اوصاف لکھے ہوئے دیکھے ہیں کہ جناب امیر کا قد مبارک میانہ، ان کی آنکھیں بڑی بڑی اور کالی تھیں، ان کا چہرہ خوبصورتی میں چودھویں رات کے چاند کی مثل تھا، ان کا شکم مبارک بڑا اور ان کے کندھوں کی ہڈی چوڑی تھی، ان کی ہتھیلیاں سخت، موٹی موٹی آنکھوں والے تھے۔ ان کی گردن مثل ایک چاندی کی صراحی کے تھی، ان کے سر مبارک پر بال کم تھے مگر گدی اور سر کے پیچھے کی طرف سے بالوں سے بھرے ہوئے تھے، ان کی ڈاڑھی اس قدر گھنی تھی کہ کندھوں کے دونوں طرف پہنچتی تھی، دونوں کندھوں کی ہڈیاں شیر کے کندھوں کی ہڈیوں کی طرح تھیں، ان کی کلائی اور بازوؤں میں

---

[1] اسد الغابہ، ارجح المطالب ص ۲۲۵ ، [2] اسد الغابہ، ارجح المطالب ص ۲۲۵
[3] اسد الغابہ، ارجح المطالب ص ۲۲۵

فرق نہیں تھا یعنی دونوں ایک سے تھے اور ٹھوس اور مضبوط تھے۔ چلنے میں آگے کو جھک کر چلتے تھے، جب کسی کی کلائی پکڑ لیتے تھے تو اس شخص کا گلا گھٹ جاتا کہ وہ سانس نہیں لے سکتا تھا، وہ رنگ میں گندم گوں تھے، ان کی کلائی اور ہاتھ سخت تھے، جب جنگ کو جاتے تھے تو دوڑ کر نہایت ٹھنڈے دل سے جاتے تھے اور ایسے بہادر تھے کہ جس سے جنگ کی اس پر فتحیاب ہوئے[۱]

حضور کی شخصیت ایسی پُر رعب و دبدبہ تھی کہ میدانِ جنگ میں اسے دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی تھی، چنانچہ عمرو عاص نے اس امر کا اعتراف اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے :-

ولاسیما ابو حسن علی
لہ فی الحرب مرتبۃ التھابُ

"اور آلِ محمدؐ میں سے مخصوص حضرت ابو الحسن علی علیہ السلام ہیں جو میدانِ جنگ میں ایک پُرہیبت مقام رکھتے ہیں۔"

اشعار

سعدیا پیکرِ مطبوع برائے نظر است
گر نہ بیند چہ بود فائدۂ چشمِ بصیر (سعدی)

آں نہ صاحب نظر بود کہ کند
از چنیں روئے در بروئے فراز (سعدی)

از طینتِ آدم توئی لیکن از خوشش گوہری
ہارونِ دینِ مصطفےؐ لیکن ز موسیٰ برتری (حکیم ضیا عالم صاحب)

---

[۱] استیعاب - ارجح المطالب ص ۲۲۵ - ۲۲۶
[۲] دیوان ابن نابغہ وکتب مناقب و انیس الاعلام فی نصرۃ الاسلام جلد ۲

تقسیم حیاتِ عالیہ علویہ

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی زندگی محیط، تولد، نشو و نما، تربیت تحصیلات، فعالیت، فداکاری، مسافرت، سیاست، مبارزت، حکومت، شہادت، کلمات، آثار، اور تالیفات کے لحاظ سے پانچ ادوار پر منقسم ہے:-

۱۔ دورۂ زندگانی تربیتی :- ۱۰ سال۔ از تولد تا بعثت

۲۔ دورۂ زندگانی شاہدِ نبوت :- ۱۳ سال۔ از بعثت تا ہجرت

۳۔ دورۂ فداکاری :- ۱۰ سال از ہجرت تا رحلت سرکارِ رسالتؐ

۴۔ دورۂ تربیت امت :- ۲۵ سال از رحلت سرکارِ رسالتؐ تا آغازِ حکمرانی

۵۔ دورۂ حکومت و حکمرانی :- ۵ سال از آغاز حکومت تا شہادت

مدتِ عمر ۶۳ سال

" انسانی زندگی کا پیمانہ مہینے اور سال نہیں ہیں بلکہ وہ عظیم الشان کارنامے ہیں جو انسان اپنی زندگی میں انجام دیتا ہے۔"

(بابائے ملت محمد علی جناحؒ)

دورۂ زندگانی تربیتی

۱۰ سال، از ولادت تا بعثت

حضرت علی علیہ السلام کو اللہ نے دو عظیم الشان رجحاناتِ طبیعہ (Natural Tendencies) سے مشرف و ممتاز فرمایا تھا، عصمت و علمِ لدُنّی نگران رجحانات کے نشو و ارتقا کے لیے سرورِ انبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مامور فرمایا، چنانچہ خود سرکارِ رسالتؐ کا ارشاد ہے:۔

یاعلی ان اللہ امرنی ان اُدنیک واعلمک لتعیٰ وانزلت هٰذہ الایۃ وتعیھا اذن واعیۃ فانت اذن واعیۃ لعلمی[۱]

"اے علیؑ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم کو اپنے سے قریب رکھوں اور خزینۂ علمِ نبویؐ تم تک منتقل کر دوں"۔ اور اسی پر یہ آیت نازل ہوئی، "یاد رکھنے والے کان یاد رکھیں" اس وقت رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا "اے علیؑ! تو میرے علم کا یاد رکھنے والا کان ہے"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ علیؑ نصِ قرآن سے حضرت رسالتمآبؐ کے یاد رکھنے والے کان ہیں۔ اور رسول اللہؐ اللہ کی طرف سے مامور تھے کہ علی علیہ السلام کی تربیت فرمائیں، اس تربیتی مہم کے لیے رسول اللہؐ نے اپنے ابنِ عم علیؑ کو خود نہیں چنا تھا بلکہ اللہ نے انتخاب فرمایا تھا، چنانچہ ارشادِ رسالت ہے:۔

---

[۱] تفسیر درِ منثور جلال الدین سیوطی جلد ۶ ص ۲۶۰، طبع مصر، کفایۃ الطالب ص ۴۸، حلیۃ الاولیاء حافظ ابو نعیم جلد ۱ ص ۶۷

اختوت من اختاره الله لی علیکم علیاً [1]

"میں نے علیؑ کو صرف اپنی ذاتی پسند سے نہیں چنا، بلکہ اللہ کے انتخاب پر ان کو تم پر منتخب کیا ہے۔"

رسول اللہؐ نے اس فریضہ کو اس طرح ادا فرمایا جو ختم رسالت کے شایان شان تھا، علی علیہ السلام نے اپنے حصولِ کمالاتِ علمیہ کے دو سبب بیان فرمائے ہیں۔ ایک وہ ذاتی قابلیت و صلاحیت و رجحانِ علمِ لدنّی عطیۂ باری اور دوسرے سرکارِ رسالتؐ کا شغفِ تربیت، چنانچہ جنابِ امیرؑ کا ارشاد ہے:۔

"ان ربی وھب لی قلباً عقولاً ولساناً سؤولاً [2]

"میرے پروردگار نے مجھے وہ قلب عطا فرمایا جو معقولات کو حاصل کرنے والا ہے اور ایسی زبان دی ہے جو درک حقائق کے لیے اپنے معبود سے پے در پے سوالات کرتی ہے۔"

انی کنت اذا سألتہ انبأنی و اذا اسکت ابتدأنی [3]

"جب میں رسول اللہؐ سے سوال کرتا تھا تو حضرت مجھے بتلاتے تھے اور جب میں نہ دریافت کرتا اور خاموش ہو جاتا تو بغیر پوچھے خود سے مجھے بتلاتے۔"

اپنی استعدادِ علمی اور رسول اللہؐ کے فیضانِ تعلیم کو حضرت علی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک جگہ جمع کر کے اس طرح ارشاد فرمایا ہے:۔

---

[1] ابن ابی الحدید جلد اول صہ طبع مصر
[2] حلیۃ الاولیاء حافظ ابو نعیم جلد اول صـ ۶۸ طبع مصر
[3] صواعق محرقہ لابن حجر مکی صـ ۷۳ طبع مصر

علمنی رسول اللہ الف باب من العلم ففتح من
کل باب الف الف باب[1]

"رسول اللہؐ نے مجھے ہزار باب علوم کے بتلائے اور ہر باب سے
ہزار ہزار باب مجھ پر منکشف ہوئے۔"

حضرت علی علیہ السلام کو رسول اللہؐ نے کس طرح تربیت کیا، اس کو خود علیؑ سے
بہتر کون بیان کر سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد فرماتے ہیں:-

"مجھے اپنی منزلت خاصہ اور پیغمبرؐ سے قرابت قریبہ کی وجہ سے بارگاہ
رسالتؐ میں جو علو مرتبت اور مقام حاصل ہے اس سے تم اچھی طرح
واقف ہو میں ابھی بچہ ہی تھا کہ رسول اللہؐ نے مجھے گود میں لے لیا۔
مجھ کو حضرت اپنے سینے سے چمٹاتے اور اپنے فرش مبارک پر اپنے
پہلو میں لٹاتے، اپنے جسم منور کو میرے جسم سے مس کرتے اور اپنی خوشبو
مجھ کو سونگھاتے تھے، پہلے خود کسی چیز کو چباتے پھر میرے دہن میں دے
دیتے تھے، حضرتؐ نے میرے گفتار میں کوئی دروغ اور کردار میں کوئی
فساد نہیں پایا۔ رسول اللہؐ کی دودھ بڑھائی کے وقت سے خداوند عالم
نے اپنے فرشتوں میں سے ایک بزرگ فرشتے کو آپ کا ہم نشین و
ہم جلیس بنا دیا تھا، جس کے ساتھ آپ دن رات کل عالم کے اخلاق
کریمہ و محاسن عظیمہ پر چلتے تھے، اور میں جملہ حالات میں رسول اللہؐ
کی پیروی اس طرح کرتا تھا جیسے اونٹ کا بچہ اپنی ماں کی کرتا ہے۔ حضرت

---

[1] منہاج نہج البلاغہ صفحہ ۱

ہر روز اپنے پرچم اخلاق اور علم مکارم کو میرے لیے بلند فرماتے اور مجھے اس کی پیروی کا حکم دیتے۔ ہر سال کوہِ حرا میں آپ مقیم رہتے تھے، اس حالت میں حضرت کو صرف میں ہی دیکھتا اور ملتا کوئی دوسرا انہیں دیکھ سکتا تھا، یہ وہ وقت تھا جب کہ کسی گھرانے کے لوگ حلقۂ اسلام میں داخل نہ تھے سوائے رسول اللہ اور حضرت خدیجہؑ کے اور میں ان دونوں کا تیسرا تھا، تنہا میں ہی نورِ رسالت و وحی کو دیکھتا تھا، اور خوشبوئے نبوت کو سونگھتا تھا، جس وقت آنحضرتؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی میں نے شیطان کی چیخ سنی، میں نے دریافت کیا یہ کیسی فریاد ہے؟ فرمایا یہ شیطان ہے جو اپنی عبادت کے جانے سے مایوس ہوگیا ہے۔ یا علیؑ! بے شک یہ تمہارا ہی مرتبہ ہے کہ جو کچھ میں سنتا ہوں تم بھی وہی سنتے ہو، اور جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم بھی وہی دیکھتے ہو۔ تم نبی تو نہیں ہو لیکن نبیؐ کے مددگار اور وزیر ضرور ہو" [1]

حسین بن زید شہید کہتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ زید شہید سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ گوشت و کھجور کو چباتے جب وہ بالکل نرم ہو کر گھل جاتے تو اس کو دہنِ علیؑ میں دے دیا کرتے تھے۔ علیؑ اس زمانے میں رسول اللہؐ کی گود میں بالکل کمسن بچہ تھے [2]۔

---

[1] خطبۂ قاصعہ، نہج البلاغہ

[2] شرح ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۲۵۱ طبع مصر

دورۂ زندگی مشاہدۂ نبوّت

۱۳ سال، از بعثت تا ہجرت

مدینۃ العلم سے باب العلم تک کیونکر علوم کا فیضان ہوتا رہا، اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے خود علیؑ نے اپنے ایک مخصوص صحابی سلیم بن قیس الہلالی سے ارشاد فرمایا ہے جس کو سلیم نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں:—

"میں دن میں ایک مرتبہ رسول اللہؐ کے ساتھ تنہائی میں رہا کرتا تھا، اور ایک مرتبہ شب میں، کبھی رسول اللہؐ سے جدا نہ ہوتا تھا، جدھر رسول اللہؐ جاتے تھے میں ساتھ ہی ساتھ جاتا تھا، اصحاب رسولؐ اس سے واقف تھے، حضرتؐ کا یہ طریق عمل صرف میرے ہی ساتھ مخصوص تھا کسی دوسرے کے ساتھ حضرتؐ کا یہ برتاؤ نہ تھا، میں تخلیہ میں رسول اللہؐ سے سوال کرتا، اور حضرتؐ جوابات دیتے، اور جب میں خاموش ہو جاتا یا میرے سوالات ختم ہو جاتے تو رسول اللہؐ خود ہی اپنی توسیعی تقریر شروع کر دیتے، قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں جو حضرتؐ پر نازل ہوئی ہو اور حضرتؐ نے مجھ پر قرأت نہ کی ہو۔ اور مجھ کو نہ لکھوائی ہو۔ میں خود اس کو اپنے قلم سے لکھتا تھا، یہی نہیں بلکہ رسول اللہؐ نے ان کے فہم اور یاد رکھنے کی دعا بھی میرے حق میں فرمائی تھی۔ اس کی برکت سے قرآن مجھ کو بالکل حفظ ہو گیا تھا، اور کبھی سہو و نسیان نہیں ہوا۔ اس طرح تاویلِ قرآن (اصل و مراد حقیقی معنی کا) علم بھی رسول اللہؐ نے میرے سپرد فرمایا اور یہ سب امانات نبوت جیسے

سینہ میں محفوظ ہو گئیں، صرف حافظہ میں ہی نہیں محفوظ کیا بلکہ حضرتؐ نے مجھے لکھوایا اور میں نے لکھ لیا، غرض کہ خدا نے جو کچھ بھی اپنے رسولؐ کو بتلایا تنزیل، تاویل، ناسخ و منسوخ، حلال و حرام، امر و نہی، اطاعت و معصیت اور جو حالات اب تک گزرے یا قیامت تک ہوں گے ان سب کا علم میرے سپرد کیا اور میں نے سب کو محفوظ کر لیا، ایک حرف بھی نہیں چھوڑا، رسول اللہؐ نے میرے سینہ پہ ہاتھ رکھ کر یہ دعا فرمائی کہ خدا میرے سینہ کو علم و فہم، فقہ و حکمت اور نور سے بھر دے اور کبھی بھی مجھ پر جہل و نسیان نہ طاری ہو۔[۱]

اسی حقیقت کو امیرالمومنین علی مرتضیٰؑ نے مہاجرین و انصار کے سامنے اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیان فرمایا:۔

"میرے سینہ میں جو علم ہے کاش میں اس کا طلبگار کسی کو پاتا، میری موت سے پہلے جو کچھ مجھ سے پوچھنا ہے پوچھ لو، یہ سینہ علم کا گنجینہ ہے۔ یہ لعابِ رسولؐ ہے، یہ وہ ہے جسے مجھے رسول اللہؐ نے اس طرح بھرایا ہے جس طرح پرندہ اپنے بچہ کو بھرایا کرتا ہے۔ مجھ سے پوچھو میرے پاس اولین و آخرین کا علم ہے، میرے لیے اگر مسند بچھا دی جاتی تو میں اہلِ تورات میں تورات سے، اہلِ انجیل میں انجیل سے، اہلِ زبور میں زبور سے، اہلِ قرآن میں قرآن سے فیصلہ کرتا، یہاں تک کہ ہر کتاب پکار اٹھتی کہ علیؑ نے وہی فیصلہ کیا ہے جو حکمِ الٰہی کے مطابق ہے۔"[۲]

۱؎ کتاب سلیم بن قیس الہلالی صفحہ ۴۹ طبع نجف اشرف ۲؎ مناقب ابن شہر آشوب جلد ۲ صفحہ ۴۵

اس ارشاد میں چند امور قابلِ غور ہیں :-

رسول اللہؐ سے اپنے حصول علم کو ایک نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کیا، فرمایا
مجھ میں رسول اللہؐ نے اس طرح علم بھرا جس طرح پرندہ اپنے بچّہ کو بھرایا کرتا ہے، یوں
نہیں کہا کہ جس طرح گائے اپنے بچھڑے کو دودھ پلایا کرتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ گائے جو
خوراک حاصل کرتی ہے وہ مختلف حالتوں سے گزر کر اور متغیر ہو کر دودھ کی صورت
اختیار کرتی ہے مگر پرندہ جو خوراک حاصل کرتا ہے اسے بلا تغیر اپنے بچے میں منتقل
کردیتا ہے۔ اس تمثیل میں یہ بتلایا ہے کہ رسول اللہؐ جس طرح علوم بارگاہِ احدیت سے
لیتے تھے بلا تغیر و تبدل انھیں مجھ میں منتقل فرما دیتے تھے۔

یہ کہ حضرت ہر اہلِ کتاب کا فیصلہ اس کی اپنی کتاب سے کرتے جہاں کثرتِ علم
کی دلیل ہے وہاں ایک عظیم الشان بین الاقوامی قانون International Law
کی شکل کا حل بھی ہے یعنی ہم اپنے قانون کو غیر مذاہب و ملل پر زبردستی ٹھونسنے کو
تیار نہیں، مگر ہمارا اصول مبنی بر عدل ہے۔ کہ جو معاہدہ جس قانون کے مطابق ہوا ہو
اسی پر اس کا فیصلہ صادر کیا جائے۔ اس پر علامہ مجتبیٰ احسن صاحب کاموپوری
لکھتے ہیں :-

" بین الاقوامی صداقت پر یہ عبور اور اپنی منطق اور دماغی اقتدار
پر یہ وثوق کہ قدیم و جدید صحائفِ زندگی سے اپنے دل و دماغ کی بات
کو دنیا کے مختلف خیال اور مختلف عقیدے کے انسانوں کا عقیدہ
بنا دینے پر مجھے قدرت ہے، یہ کوئی معمولی دعویٰ نہیں۔ اس دعویٰ کا
جس قدر عملی ثبوت حضرت علیؑ سے ظاہر ہوا اس سے دنیا حیران ہے

اگر حضرت علیؑ کو کافی فارغ البالی، مکمل سکون و اطمینان کی دنیا مل گئی ہوتی تو خدا کو ہی اس کا علم ہے کہ یہ دنیا افکار و خیالات اور بلند نظریات و اصول کے اعتبار سے کتنی اونچی ہو جاتی۔[1]

ان حقائق میں کون ہے جو علی علیہ السلام کے علم کا اندازہ لگا سکے۔ ہاں اگر کہہ سکتے ہیں تو رسول اللہ ص کے ارشاد اس امر میں ہماری رہبری کر سکتے ہیں، چنانچہ رسالت کی زبان وحی ترجمان اس تعلیمی دور سے علیؑ نے جو فیضان حاصل کیا اس کے نتائج میں اس طرح رطب اللسان ہے:-

(۱) "انا مدینۃ العلم وعلی بابها فمن اراد العلم فلیاته من بابه۔"[2]

"میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں، پس جو شہر میں آنا چاہتا ہے وہ دروازے سے آئے۔"

(۲) "انا دار الحکمۃ وعلی بابها"[3]

"میں حکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔"

(۳) "انا دار العلم وعلی بابها۔"[4]

"میں علم کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔"

---

[1] حکیم الٰہی ص۹۴ و ص۹۵۔ [2] صحیح ترمذی جلد ۲ ص۲۱۴، استیعاب ابن عبدالبر برحاشیہ الاصابہ ج ۲ ص۱۳، اسد الغابہ ابن اثیر الجزری ج ۴ ص۲۲، الریاض النضرہ جلد ا ص۱۹۲، ذخائر العقبیٰ محب الطبری ص۷۷۔ الکفایہ محمد بن یوسف الکنجی الشافعی ص۹۸، صواعق محرقہ ابن حجر مکی ص۷۳ طبع مصر
[3] صحیح ترمذی جلد ۲ ص۲۱۴، حلیۃ الاولیا حافظ ابو نعیم جلد ۱ ص۶۴ طبع مصر، مصابیح السنۃ امام بغوی جلد ۲ ص۲۷۵، صواعق محرقہ ابن حجر مکی ص۷۳ طبع مصر [4] مصابیح السنۃ امام البغوی و ذخائر العقبیٰ محب الطبری ص۷۷

(۴) "انا میزان العلم وعلی کفتاہ"[1]

"میں علم کا ترازو ہوں اور علیؑ اس کے پلڑے ہیں"

(۵) "انا میزان الحکمۃ وعلی لسانہ"[2]

"میں حکمت کا ترازو ہوں، علیؑ اس کی لسان ہیں"

(۶) "انا مدینۃ الفقہ وعلی بابھا"[3]

"میں شہر فقہ ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔"

(۷) "علی اخی وھو منی وانا من علی فھو باب علمی ووصی"[4]

"علیؑ میرے بھائی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں، اور وہی میرے شہر علم کا دروازہ ہیں اور میرے وصی ہیں۔"

مِن جو حرف جار ہے عربی زبان میں مختلف معنی میں مستعمل ہے۔ مِن جنسیہ اس لحاظ سے "علی منی وانا من علیؑ" کے یہ معنی ہوں گے کہ "علی میری جنس سے ہے اور میں علیؑ کی جنس سے ہوں۔" من بتعیضیہ اس لحاظ سے "علی منی وانا من علیؑ" کے یہ معنی ہوں گے کہ "علیؑ میرا حصہ ہے اور میں علیؑ کا حصہ ہوں" یعنی علیؑ جزو رسالت ہے۔ من بدلیہ اس لحاظ سے "علی منی وانا من علیؑ" کے یہ معنی ہوں گے کہ "علیؑ میرا بدل ہے اور میں علیؑ کا بدل ہوں"

---

[1] فردوس الاخبار الدیلمی، کشف الخفا العجلونی جلد ۱ صفحہ ۲۰۴۔

[2] شرح دیوان علی علامہ میبذی، والرسالۃ العقلیہ لامام الغزالی

[3] تذکرہ خواص الامہ سبط ابن جوزی صفحہ ۲۹۔ (۴) کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۱۰۴

(۸) "علی باب علمی ومبین لامتی ما ارسلت بہ من بعدی" [1]

"علیؑ میرے بعد علم کا دروازہ ہیں، اور جس امر کی رسالت میں نے کی ہے اس کی وضاحت میرے بعد کرنے والے ہیں"

(۹) "یا ام سلمہ اشھدی واسمعی ھذا علی امیر المومنین وسید المسلمین وعیبۃ علمی (وعاء علمی) وبابی الذی اوتی منہ" [2]

"اے ام سلمہ سُنو اور گواہ رہو یہ علیؑ مومنین کے امیر ہیں، مسلمانوں کے سردار ہیں، میرے علم کے مظروف و محافظ ہیں اور میرے ایسے دروازہ ہیں جس کے ذریعہ مجھ تک پہنچتے ہیں"

علامہ مناوی "عیبۃ علمی" کی شرح میں لکھتے ہیں:-

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ علیؑ میرے علم کے مظروف ہیں یعنی میری باتوں کو سمجھنے والے اور ان کو محفوظ رکھنے والے محل راز اور میرے نفائس وعلوم کے معدن ہیں۔ ابن درید کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کا یہ ایسا بلیغ کلام ہے کہ اس سے پہلے کسی نے بھی اس مطلب کو یوں ادا نہیں کیا جس میں آنحضرت یہ ظاہر کرتے ہیں کہ علیؑ آپ کے امورِ باطن کے ایسے راز دار ہیں کہ آپ کے سوا کوئی

---

[1] کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۱۵۶، القول الجلی فی فضائل علی لسیوطی حدیث ۲۸

[2] اخرجہ ابو نعیم فی الحلیۃ والخوارزمی فی المناقب، والیافعی فی الذین والکنجی فی المناقب والحموی فی فرائد السمطین وحسام الدین المحلی وشہاب الدین فی توضیح الدلائل۔

دوسرا اس پر مطلع نہیں ہے۔ اور علیؑ کی یہ انتہائی مدح ہے جس کی وجہ سے آپ کے دشمنوں کے دل بھی آپ کی عظمت کے معترف ہیں۔[۱]
شیخ محمد الحفنی لکھتے ہیں :۔

"حدیث عیبہ سے مراد یہ ہے کہ حضرت کے علم کے منظروف و محافظ ہیں، کیونکہ آنحضرتؐ شہرِ علم ہیں، اسی بنا پر صحابہ مشکلاتِ علوم میں علیؑ کے محتاج رہا کرتے تھے۔"[۲]

(۱۰) "اعلم امتی من بعدی علی ابن ابی طالب۔"[۳]
"میری امت میں میرے بعد سب سے زیادہ علم رکھنے والے علی ابن ابیطالب ہیں۔"

(۱۱) "علی ابن ابی طالب اعلم الناس باللّٰہ والناس"[۴]
"علیؑ خدا اور انسانوں کے متعلق اعلم الناس ہیں۔"

(۱۲) "اقضاکم علی ابن ابی طالبؑ"[۵]
"علی ابن ابی طالبؑ تم میں سب سے زیادہ فیصلہ کرنے والے ہیں۔"

(۱۳) "لیھنک العلم ابوالحسن لقد شربت العلم شربًا وانھلتہ منھلاً۔"[۶]
"اے ابوالحسن تم کو علم گوارا ہو بے شک علم و معارف سے تم یوں سیراب ہوئے جو سیراب ہونے کا حق ہے۔"

---

[۱] فیض القدیر علامہ المناوی جلد ۴ صفحہ ۲۰۶ [۲] حاشیہ شرح العزیزی جلد ۲ صفحہ ۴۱۵
[۳] منتخب کنز العمال صفحہ ۳۲ مناقب اخطب خوارزم صفحہ ۴۸ [۴] منتخب کنز العمال صفحہ ۳۲
[۵] استیعاب جلد ۳ صفحہ ۳۸ [۶] حلیۃ الاولیاء ابو نعیم جلد ۱ صفحہ ۶۰ طبع مصر مناقب اخطب خوارزمی

(۱۴) "قسمت الحکمۃ عشرۃ اجزاء و اعطی علی تسعۃ اجزاء و الناس جزء واحد و علی اعلم بالجزء واحد منھم"[1]

"علم و حکمت کو دس حصوں میں تقسیم کیا گیا، نو حصے تو سب کے سب علیؑ کو ملے اور تمام انسانوں کو صرف ایک حصہ، لیکن اس ایک حصہ میں بھی سب سے زیادہ علیؑ کو عطا ہوا ہے۔"

حضرت علیؑ کے علمی فضائل کا حضور کے اپنے زمانے کے لوگوں کو بھی اعتراف تھا۔ رسول اللہؐ کے مشہور صحابی عبد اللہ ابن مسعودؓ جن کا لقب "اوعیۃ العلم" ہے فرماتے ہیں:-

"قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے اور ہر حرف ظاہر و باطن پر مشتمل ہے، صرف علیؑ کی ذات ہے جو علم ظاہر و باطن سے واقف ہے۔"[2]

حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ جو مسلمانوں میں محیط العلم من الصحابہ حبر الامۃ اور ترجمان القرآن کے القابات سے مشہور ہیں، فرماتے ہیں:-

علم کے دس حصے ہیں:-

نو حصے تو علیؑ کو ملے اور دسواں حصہ ایسا ہے جو تمام مخلوق کو عطا ہوا۔
اس دسویں حصہ میں بھی علیؑ کو سب سے زیادہ ملا۔[3]

حضرت عبد اللہ ابن عباس سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ آپ کا علم علیؑ کے علم کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ اس پر فرمایا:-

---

[1] منتخب کنز العمال بر حاشیہ مسند احمد ابن حنبل جلد ۵ ص ۳۳ و حلیۃ الاولیا جلد ۱ ص ۶۵ طبع مصر
[2] حلیۃ الاولیا رحافظ ابو نعیم جلد ۱ ص ۶۵ طبع مصر [3] استیعاب جلد ۲ ص ۴۰

"کنبۃ قطرۃ المطر الی البحر المحیط"[1]

"جیسے بارش کا ایک قطرہ بے پناہ سمندر کے مقابلہ میں حقیر اور بے مایہ ہے ویسے ہی میرا علم علیؑ کے علم کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔"

یہ علیؑ ہی ہیں ایسے مشکلکشا جنھوں نے مشکلات علوم میں خلفاء کی مشکل کشائی فرمائی جس کی بنا پر مسلمانوں کے خلیفۂ ثانی حضرت عمر فرمایا کرتے تھے لاابقانی اللہ لمعضلۃ لیس لھا ابوالحسن[2] جس عقدۂ لاینحل کی مشکل کشائی کے لیے علیؑ نہ ہوں، اس وقت کے لیے خدا مجھے باقی نہ رکھے۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر یہ بھی فرمایا کرتے، لولا علی لھلک عمر[3]، اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

مسلمانوں کے خلیفۂ ثانی حضرت عمر نے حضرت علیؑ کی فضیلت علمی کا ان الفاظ میں بھی اعتراف کیا ہے:۔

هذا اعلم نبینا وبکتاب نبینا۔[4]

"وہ ہمارے نبیؐ اور ہمارے نبیؐ کی کتاب کے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔"

شام کے گورنر امیر معاویہ جو علی علیہ السلام کی مرکزی حکومت سے ہمیشہ برسرپیکار رہے حضرت علیؑ کی فضیلتِ علمی کے ان الفاظ میں معترف ہیں:۔

---

[1] ترجمہ علی ابن ابی طالب احمد ذکی صفوت ص ۹۰ طبع مصر شرح ابن ابوالحدید جلد ۱ طبع مصر

[2] ریاض النضرہ جلد ۲ ص ۱۹۶ و ص ۱۹۷، فیض القدیر شرح جامع الصغیر للمناوی جلد ۳ ص ۴۶

[3] ترجمہ علی ابن ابی طالب احمد ذکی صفوت ص ۹۰ تذکرہ خواص الامہ سبط ابن الجوزی ص ۸۷

[4] زین الفتیٰ فی شرح سورۂ ہل اتیٰ لابو محمد احمد بن محمد بن علی العاصمی۔

كان رسول الله يعزه بالعلم عزاً۔[1]

"رسول اللہؐ نے علیؑ کو علم سے ایسا معزز کیا جو معزز کرنے کا حق ہے۔"

ان ہی معاویہ کو جب حضرت علیؑ کی شہادت کی خبر ملی تو ان کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکل پڑا:۔

ذهب الفقه والعلم بموت ابن ابی طالب[2]

"ابی طالب کے بیٹے علیؑ کی موت سے علم و فقہ کا خاتمہ ہو گیا۔ حضرت امیرالمومنین علی مرتضیٰؑ کے کمال علم و فضل کا اعتراف منصف مزاج علمائے اہلسنت کو بھی ہے، چنانچہ مشہور عالم اہل سنت علامہ مصطفیٰ بک نجیب مصری علی علیہ السلام کی محیر العقول شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"کہنے والا آخر اس امام کے متعلق کیا کہے، ثنا و صفت بیان کرنے والا آپ کے کمال ثنا و صفت کو بیان کرنے سے عاجز و قاصر ہے۔ رسول اللہؐ کا یہ ارشاد کہ آپ مدینۂ علم کے در ہیں، آپ کے کمال فضل و شرف کے لیے کافی ہے۔ آپ ہی علم میں سب سے اوّل، شجاعت میں سب سے اوّل، جود و سخا میں سب سے اوّل، حلم و درگزر میں سب سے اوّل، فصاحت و بلاغت میں سب سے اوّل، بندگی و عبادت میں سب سے اوّل، زہد و ریاضت میں سب سے اوّل، آپ کمالِ صحت و یقین کی وجہ سے اپنی رائے اور تدبیر پر قائم رہتے

---

[1] صواعق محرقہ لابن حجر مکی ص۱۰۱ طبع مصر، ذخائر العقبیٰ المحب الطبری ص۷۹
[2] استیعاب ابن عبد البر جلد ۳ ص۴۵

والے تھے، سب سے بہتر آپ کی فکر و تدبیر تھی۔ اگر خوفِ خدا اور پرہیزگاری کا خیال نہ ہوتا تو آپ عرب میں سب سے بڑے ڈپلومیٹ ہوتے ہر قلب میں آپ کے لیے جگہ ہے۔ اور ہر ایک انسان آپ کو دوست رکھتا ہے۔ آپ حجابِ عظمت میں ایسی بزرگیوں کے ساتھ جلوہ نما ہوئے کہ بہت سے لوگ آپ کے متعلق حیرانی میں مبتلا ہو گئے اور حدِ عقل و شریعت سے نکل کر آپ کو معبود سمجھنے لگے، ذمی یہود و نصاریٰ آپ کو دوست رکھتے تھے۔ فلاسفہ آپ کی عظمت و بزرگی کے سامنے سرنگوں ہیں۔ سلاطینِ روم اپنے محلوں اور عبادتگاہوں میں آپ کی تصویر بناتے تھے اور لشکر کے سردار آپ کے مبارک نام کو تلوار پر کندہ کراتے ہیں اور اس کو اپنے لیے خیر و برکت، فتح و نصرت کا سبب سمجھتے ہیں۔" [1]

علامہ شیخ شہاب الدین احمد الاشبہی لکھتے ہیں:-

"امیر المومنین علی ابن ابیطالب رضی اللہ عنہ و کرم اللہ وجہہ آیاتِ خدا میں سے ایک آیت اور معجزاتِ رسول اللہ میں سے ایک معجزہ ہیں۔ آپ کے ساتھ تائیدِ الٰہی شاملِ حال تھی۔ غم و اندوہ کو آپ دور کرنے والے تھے، ستونِ اسلام کو آپ ہی نے محکم کیا۔ اور آپ ہی کشتیِ اسلام کے لنگر تھے۔" [2]

---

[1] حیاۃ الاسلام جزو اوّل ص۹ طبع مصر
[2] مستطرف جلد ا ص۱۹۱ طبع مصر

علامہ کفوی شافعی لکھتے ہیں :۔

"حضرت علیؑ نہایت حاضر جواب تھے، اور فی البدیہہ خطبہ کہتے تھے اور آپ رسول اللہؐ کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھے۔ تبحر علمی کی وجہ سے بھی معجزہ تھے، اور لڑائیوں میں شجاعت کی وجہ سے بھی معجزہ تھے"۔ [۱]

عمرو بن بحر جاحظ جو تیسری صدی میں عربی ادب کا سب سے بڑا امام تھا امیرالمومنین کے صرف ایک فقرہ پر سر دُھنتا ہے اور یونان و روما و ہند و ایران کے ذخیرۂ فکر اس کے سامنے سبک سمجھتا ہے۔ اور وہ فقرہ یہ ہے :۔

"قیمۃ کلّ امرءٍ ما یحُسِنُ" "ہر انسان کی قیمت اس کا حسنِ عمل ہے"

اس پر جاحظ لکھتا ہے :۔

"لا اعلم فی کلام الناس احکم من ھٰذہٖ الکلمۃ" [۲]

"مجھے کسی انسان کے کلام میں اس سے زیادہ حکیمانہ فقرہ نہیں ملا۔"

مسلمانوں کا کیا ذکر غیر مسلم مفکرین بھی حضرت علی علیہ السلام کی ممتاز و مخصوص رفعتوں اور بلندیوں کے معترف ہیں۔

عیسائی ادیب عبدالمسیح انطاکی مدیرِ شہیر جریدۃ العمران مصر، حضرت علی مرتضیٰ ع کے متعلق اظہارِ خیالات کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"حکمتیں حضرت علیؑ سے منقول ہیں اور وہ بغیر بحث و اختلاف سید الحکماء ہیں، اطمینان و ناگوار زندگی کے ہر دور کے متعلق ان سے

---

[۱] طبقات علامہ کفوی شافعی [۲] تاریخ خطیب بغدادی حکیم الٰہی ص ۲۵

حکمتیں مروی ہیں، آپ کے خطوط و اقوال و خطبے حکمتوں سے اس کثرت سے بھرے ہوئے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت جہاں بیٹھ جاتے تھے حکمت کا خزانہ لٹ جاتا تھا، بلکہ آپ کے تمام اقوال و اعمال حکمت کے دریا تھے جو وسیع تجربہ اور آزمائش اور کامل ترین زیرکی کے سرچشمے سے پھوٹ نکلے تھے۔" [1]

استاذ پروفیسر فواد فرام بیروت کے عیسائی ادیب نے نہج البلاغہ کے ایک انتخاب میں لکھا ہے:-

"آج ہم منتخبات نہج البلاغہ کی اشاعت سے اپنے کلام کی ابتداء کرتے ہیں۔ یہ کلام امام علیؑ ابن ابی طالب کا ہے جو اسلام کے پہلے مفکر ہیں" [2]

مستشرق شہیر گابریل انکیری (GABRIEL - ENKIRI)

اپنی قابلِ قدر کتاب شہسوارِ اسلام (Lechevaliarde Islam)

میں جو فرانسیسی زبان میں امیر المومنینؑ کے حالات میں انھوں نے لکھی ہے، لکھتے ہیں:-

"علی کی بلند شخصیت میں دو بلند صفتیں "علیٰ حدِ کمال" ایسی پائی جاتی ہیں کہ جن کا ایک مقام پر جمع ہونا انسانی فہم و فراست سے باہر ہے اور تاریخ عالم میں سوائے علیؑ کے اور کوئی دوسری مثال نہیں ملتی، علیؑ ہی کی ذات ہے جو قہرمانِ جنگ، فاتح اور جرنیل ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ایک زبردست عالم ایک فصیح ترین خطیب بھی تھی، کیا

---

[1] حکیم الٰہی صفحہ ۹۴

[2] علی ابن ابی طالبؑ فواد فرام لبستانی حکیم الٰہی صفحہ ۹۵۔

رولنڈ[1] "ROLAND" بایارڈ[2] "BAYARD" کے متعلق
یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ توریت و انجیل کی تشریح و تعبیر کر سکتے ہیں
اور بالائے منبر فصیح و بلیغ تقریر کر کے قانونِ مدنی (Civil
Procedue Law) و قانونِ تعزیرات (Criminal
Procedue Law) کے عقدوں کی گرہ کشائی کر سکتے ہیں
یا یہ ممکن ہے کہ مقدس تھامس ڈاکن (Saint Thomas
Daquir)[3] مقدس جان کریسوسٹوم (Saint John
Chrisastom)[4] یا بشپ بوسویٹ (Bishop Bossuet)[5]
میدانِ جنگ میں ایک جانباز سپاہی کی حیثیت سے شمشیر بکف دشمنوں پر
حملہ کرتے اور انکی صفوں کو خاک و خون میں ملاتے نظر آئیں۔ یہ تو صرف

---

۱ رولنڈ یورپ کا مشہور بہادر جو اپنی شجاعت و شمشیر زنی میں ضرب المثل ہے اور جس کی داستانِ حماست و دلاوری کے قصے ایک مستقل کتاب میں محفوظ ہیں۔ رولنڈ کی مشہور تلوار کا نام "دورانڈل" تھا بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ پتھر کی چٹان پر اپنی تلوار کی ضرب لگاتا تھا تو اس میں شگاف پڑ جاتا تھا۔

۲ بایارڈ مشہور فرانسیسی جنگجو سردار جو ۱۴۷۳ء میں پیدا ہوا تھا اس بہادر نے شارل ہشتم لوئی دوازدہم اور فرانسوا اول کے زمانے کی جنگوں میں بڑے کارہائے نمایاں کیے یہاں تک کہ اسکی شجاعت و حماست کی تعریف دشمن بھی کرتے تھے۔

۳ مقدس تھامس ڈاکن عیسائی مذہب کا ایک مشہور قدیس مرتاض و عابد تھا۔

۴ مقدس جان کریسوسٹوم دنیائے عیسائیت کا مشہور زاہد تارک دنیا عبادت گزار تھا۔

۵ اسقف بوسویٹ فرانس کا مشہور و معروف بشپ اور کامیاب مصنف طلیق اللسان مقرر بلیغ مذہبی تقریروں میں اپنی نظیر آپ تھا۔

علیؑ ہی کی ایک مثال ہے جس کو تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔[1]

اس دورِ تعلیمی میں رسول اللہ کی صحبت اور علی علیہ السلام کی خداداد مذہبی صلاحیت و قابلیت نے اُنھیں جس مقام پر پہنچایا اس کا مستشرقینِ مغرب Orienatlists of west) کو بھی اعتراف ہے۔ فرانس کا مشہور مستشرق اور مصنف السنر (EELSNBR) اپنی شہرۂ آفاق تالیف دینِ محمدی کے تاثرات (LES EFFECTS DE LARELIGION DE MOHAMMED) میں لکھتا ہے :-

"Ali was bean ideal of chivalary, and personification of gallantry, bravery and gencrosity.
Pure, gentle and learned without fear and without reproach, beset the world the noblest example of chivalrous grandear of charactor. His spirit was a pure reflection of that of Muhammed, it overshawed the Islamic world and formed the onimating genius of succeeding ages."

---

[1] منہاج نہج البلاغہ ص۱۲

"علیؑ علیہ السلام شجاعت کا حسین نمونۂ عمل تھے، اور دلیری، بہادری، حماست
اور فیاضی کا مجسمہ تھے، وہ ایک مخلص، شریف اور نڈر فاضل شخصیت تھے،
انھوں نے دنیا کے سامنے شجاعانہ کارناموں کے باعظمت کردار کی شریف ترین
مثال پیش کی، ان کے کردار میں رسول اللہؐ کے کردار کا خالص عکس موجود تھا
وہ اسلامی دنیا پر چھا گئے اور آنیوالی نسلوں کے لیے زندہ فہم و فراست
کو پیش کیا۔"

گبن (Gibbon) اپنی تالیف "تاریخ زوال و انقطاع سلطنت روما جلد ۵
The History of the Decline fall of Roman Empire vol: V
میں علی علیہ السلام کے متعلق رقمطراز ہے :۔

The Zeal and virtues of Ali
were never out stripped by any
recent proselyte. He united the
qualfications of a poet a soldier
and a saint. His wisdom still
breathes in a Collection of
moral and religions saying
and every antagonist in
combat of tongue or of sword
was udddued by his eloquence

and valour. From the frist hour of mission to the last rites of his funeral the apostled was never forsaken by his generous friend, whom he delighted to name his brother, his vicegerant and faithful Aaron of second moses.

"شغف، جد و جہد اور اقدار میں موجودہ دور کا بھی کوئی مصنّف مذہب علی علیہ السلام پر سبقت نہیں لے جاسکا، ان میں ایک شاعر، ایک جانباز سپاہی اور ایک مرتاض ولی کی خوبیاں جمع تھیں، ان کی حکمت و دانش اب بھی ان کے اخلاقی اور مذہبی مجموعہ میں زندۂ جاوید موجود ہے۔ سیف و زبان کے مرحلوں میں انھوں نے اپنے حریفوں کو اپنی شجاعت و فصاحت سے نیچا دکھلایا ہے۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تحریکِ انقلاب کی ابتدا سے ان کی تجہیز و تکفین کے آخری فرائض تک اپنے اس فیاض دوست کو پہلو تہی کرتا ہُوا نہیں پایا جسے رسول اللہؐ نے اپنی پسندیدگی سے بھائی، اپنا وصی، خلیفہ اور جانشین کہا اور اس وفادار کو وہ منزلت دی جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔"

ایک فاضل عیسائی، فؤاد فرام البستانی جو بیروت کے کیتھولک

قدیس یوسف کالج کے عربی لٹریچر کے پروفیسر ہیں اپنے مقالہ علیؑ ابن ابیطالب میں جو انھوں نے ۱۹۳۶ء میں لکھا ہے لکھتے ہیں :-

علیؑ ابن ابی طالبؑ ایک پُر کشش شخصیت رکھتے ہیں روات و مورخین کے قلم ان کی شخصیت کے گرد و پیش چکر لگاتے رہے ہیں۔ ناقدین و مفکرین کی عقلیں آپ کی ذات کے سمجھنے میں کوشاں رہتی ہیں آپ کی سیرت سے زاہد و سالک بھی ہدایت پاتے رہے ہیں۔ آپ کے علم کے زیر سایہ ادب آموزوں کی بڑی جماعت چلی ہے مدت دراز سے مختلف فرقوں کی مختلف رائیں اور مناظرہ و مجادلہ نے ان کے مرتبہ کو گھٹانے کی بجائے اور بڑھایا اور کثیف و صاف مباحثوں کے پیچھے سے آپ کی عقل کا اور اظہار ہوا آپ دل کے بڑے تھے انتہائی مخلص تھے قوی ایمان تھے اسلام کی غیرت سے گھلے جاتے تھے اور اپنے ابن عم (رسول اللہؐ) کی خوشنودی کی فکر میں بھی گھلے جاتے تھے۔"

یہ دورۂ زندگی ۱۳ سال کا ہے بعثت سے ہجرت تک اس عہد تعلیمات و تبلیغات محمدی میں بھی آپ نے مذہب و ملت کی ایسی خدمات انجام دیں کہ اس زمانے کے کسی آدمی کی زندگی میں اس کا عشر عشیر بھی آپ کو جستجو کے باوجود نہ ملے گا۔ ان خدمات کا ہم مختصر تذکرہ اپنی اس تاریخ کے پہلے حصہ میں کر چکے ہیں، تذکرہ کے طور پر لطف اندوز ہو جیئے :-

سب سے پہلے آپ نے رسالت کی تصدیق کی جس پر قرآن کریم ان الفاظ میں شاہد ناطق ہے :-

والذی جاء بالصدق بہ اولئٰک ھم المتقون۔

(الزمر آیت ۳۳ پ ۲۴ ع ۱)

"اور وہ (رسولؐ) جو صداقت لے کر آیا اور وہ شخص جس نے اس صداقت کی تصدیق کی یہی لوگ تو پرہیزگار ہیں۔"

حافظ ابن مردویہ نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس شخص نے میری تصدیق کی ہے وہ علی ابن ابی طالبؑ ہیں[1]

علامہ اقبال بھی اس کے متعلق اس طرح رطب اللسان ہیں :-

مسلم اول شہ مرداں علیؑ

عشق را سرمایۂ ایماں علیؑ

انگلستان کے شہرۂ آفاق مورخ ایڈورڈ گبن نے اس واقعہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے :-

"ایک نوجوان ہیرو کی ہمت و جرأت کے ساتھ آپ کے خیالات کی صداقت کا اعتراف کیا۔"[2]

اس کے بعد دعوتِ ذوالعشیرہ میں تصدیقِ رسالت فرمائی اور اس سے رسول اللہؐ نے انہیں تاجِ خلافت واخوت و وصایت سے سرفراز فرمایا۔[3]

۵ھ میں حضرت عمر نے اپنے اسلام کا اعلان فرمایا، اسی سال مشرکین مکہ کی سختی

---

[1] تفسیر درمنثور سیوطی جلد ۶ صفحہ ۳۲۸ سطر ۲۴ طبع مصر

[2] History of Decline and fall of Roman Empire

[3] Successors of Muhammed by washing Iron

اور تفسیر خازن، تفسیر واحدی، تاریخ کامل وغیرہ۔

بڑھ گئی، قریش نے جمع ہو کر رسول اللہؐ کا معاشی بائیکاٹ کیا۔ اس زمانے میں ضروریات زندگی بہم پہنچانا حضرت علی مرتضیٰؑ کے سپرد تھا، جو مکہ کے گرد و نواح کی آبادیوں میں دور دور نکل جاتے تھے، گیہوں اور کھجوریں جو کچھ میسر آتا اپنی پیٹھ پر رکھ کر لاتے، رات کو رسول اللہؐ کے بستر پر سوتے تاکہ اگر کوئی قتل کے ارادہ سے آئے تو رسول اللہ پر اپنی جان نثار کر دیں۔

تعجب ہے کہ اس وقت تک بہت سے مالدار حضرات مسلمان ہو چکے تھے پھر بھی کسی کی مالی امداد کا تذکرہ تاریخ میں نہیں ملتا، حالانکہ اس وقت سے بڑھ کر رسول اللہؐ کی مالی امداد کا کونسا وقت تھا؟ حضرت عمر کے اسلام لانے کو اسلام کے وقار کے بڑھ جانے کی دلیل قرار دیا جاتا ہے حالانکہ واقعات اس کے برعکس ہیں، رسول اللہؐ کے خاندان کا بائیکاٹ اسی سال ہوا جس سال حضرت عمر نے اسلام کا اعلان فرمایا تھا، اس زمانے میں رسول اللہؐ کے مصائب بہت بڑھ گئے تھے۔

دورۂ فداکاری ۱۰ سال

از ہجرت تا رحلت سرکار رسالتؐ

اس زمانے کے واقعات کو بھی ہم اپنی اس تاریخ کے پہلے حصہ میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں صرف چند باتیں یاد دہانی کے طور پر لکھتے ہیں:۔

شب ہجرت فداکاری کا سب سے اہم اور سب سے پہلا واقعہ شب ہجرت بستر رسولؐ پر سو کر رسول اللہؐ کی جان بچانا تھا، جسے اللہ نے جان بیچنے سے تعبیر کیا اور جس سے فرشتوں پر فخر و مباہات فرمائی۔ اگرچہ فداکاری

نہ ہوتی تو اسلام ایک ایسا خواب ہوتا جو ہمیشہ شرمندۂ تعبیر رہتا۔ اس سلسلہ میں سنی مصنف رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:۔

"حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ بائیس تئیس برس کی تھی، اس عنفوانِ شباب میں اپنی زندگی کو قربانی کے لیے پیش کرنا فدویت وجاں نثاری کا عدیم المثال کارنامہ ہے۔ رات بھر مشرکین کا محاصرہ قائم رہا اور اس خطرہ کی حالت میں یہ نوجوان نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ محوِ خواب رہا۔ غرض تمام رات مشرکین قریش اس دھوکے میں رہے کہ خود حضرت سرورِ کائنات استراحت فرما ہیں، صبح ہوتے ہوتے اپنے ناپاک ارادہ کی تکمیل کے لیے اندر آئے لیکن یہاں یہ دیکھ کر متحیّر رہ گئے کہ شہنشاہِ دوعالم کی بجائے آپ کا جاں نثار بھائی قربان ہونے کے لیے سر بکف سو رہا ہے۔"[1]

علیؑ کا اعلان

اس فداکارانہ کارنامہ میں آپ نے اعلان بھی فرمادیا تھا کہ وہ تازیست ایسی فداکاریوں کو جاری رکھیں گے۔ چنانچہ بسترِ رسالتؐ سے یہ اعلان ان الفاظ میں نشر ہو رہا تھا:۔

"میں نے اپنی جان کے عوض اس عالی مرتبہ شخص کو بچایا جو پاؤں سے کنکریوں کو روندنے والوں اور خدا کے پرانے گھر اور حجرِ اسود کا طواف کرنے والوں میں سب سے افضل ہیں۔

یہ میں نے ہر چیز سے قطع نظر کر کے محض دینِ خدا کی امداد کی نیت سے

---

[1] نہج البلاغہ کامکمل اردو ترجمہ تذکرۂ بوتراب ص۱، مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۴

ایسا کیلب اور آئندہ بھی میں ٹھان لی ہے کہ جب تک قبر میں تکیہ لگا کر نہ لیٹوں[1]۔"

رسول اللہ کا رازدار اور شریک و سہیم معاملات

رسول اللہؐ سے قریش کو حد درجہ عداوت تھی تاہم یہ دیانت و امانت کی رفعت تھی کہ جس شخص کو اپنا مال یا اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا آپ ہی کے پاس لاکر رکھتا تھا، اس وقت بھی آپ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں۔ آپ کو قریش کے ارادہ کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی اس بنا پر جناب امیرؑ کو بلا کر فرمایا مجھکو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے میں آج مدینہ کو روانہ ہو جاؤں گا، تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو جاؤ صبح کو سب امانتیں جا کر واپس دے آنا۔ یہ ظاہر ہے کہ امانتوں کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہ تھا، صرف اشارہ کیا، علیؑ جانتے تھے کہ کس کس کی امانت ہے اور کس کس قدر ہے اس سے معلوم ہوا کہ علیؑ رسول اللہؐ کے رازدار تھے۔ معاملات میں شریک و سہیم تھے اور ہمیشہ نائب کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔

اخوتِ رسالت

حضرت علیؑ آنحضرتؐ کے تشریف لے جانے کے بعد دو یا تین دن مکہ میں مقیم رہے اور آنحضرتؐ کی ہدایت کے مطابق جن لوگوں سے آپکا کاروبار اور لین دین تھا، ان کے معاملات سے فراغت حاصل کی اور تیسرے یا چوتھے دن مکہ کو خیرباد کہہ کر عازم مدینہ ہوئے۔ رسول اللہؐ نے مہاجرین میں جب بھائی چارہ کرایا تو حضرت علیؑ کو اپنا بھائی بنایا[2]۔

---

[1] تاریخ خمیس جلد ۱ ص ۳۲۶ مدارج النبوۃ ص ۷۲، مدارج النبوۃ رکن ۴ ص ۳، نور الابصار ص ۱۲۸ و ص ۱۲۹، فصول المہمہ ص ۳۴ [2] ابن سعد، تذکرۂ علی ص ۱۳

صعوباتِ سفر مکہ سے روانہ ہو کر سرکارِ رسالتؐ نے قبا میں قیام فرمایا۔ حضورؐ کو قبا میں تشریف لائے تین دن گزرے تھے کہ علی مرتضیٰؓ بھی مکہ سے پاپیادہ چل کر خدمتِ بابرکت رسالت میں حاضر ہوئے۔ زرقانی نے اس مہاجر و مجاہد فی سبیل اللہ کی وہ حالت جس میں وہ خدمتِ عالیہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ ان الفاظ میں بیان کی ہے :۔

"جناب علی مرتضیٰؓ راتوں کو چلتے تھے اور خوفِ کفار سے دن کو چھپے رہتے تھے۔ جب حاضر خدمت عالیہ رسالت ہوئے تو زحمتِ پیادہ پائی سے آپ کے دونوں پاؤں زخمی ہو گئے تھے۔ آں حضرتؐ نے آپ کا یہ حال مشاہدہ فرما کر آپ کے پاؤں کو دستِ مبارک سے چھو کر اللہ سے دعائے شفا کی۔ آپکے پاؤں اچھے ہو گئے تو پھر آپ کو مطلق شکایت نہ ہوئی۔"[1]

پہلی مسجد کے معمار خلیل و اسماعیلِ مدینہ ہجرت کے چھٹے یا ساتویں مہینے سرکارِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک مسجد تعمیر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ آپ نے اس کی بنیاد رکھی اور اپنے رفقا کے ساتھ خود اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ تمام صحابہ جوش کے ساتھ شریکِ کار تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اینٹ اور گارا لا لا کر دیتے تھے اور یہ رجز پڑھتے تھے۔[2]

لا یستوی من یعمر المساجدا یدأب فیہ قائما و قاعدا
ومن یری عن الغبار حائدا

---

[1] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۲۲ [2] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۴۲۶

"جو شخص مسجد تعمیر کرتا ہے کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر اس مشقت کو برداشت کرتا ہے اور جو گرد و غبار کے باعث اس کام سے جی چراتا ہے وہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔"

غزوۂ بدر اس غزوہ میں سرکارِ رسالت محمد مصطفٰےؐ ۳۱۳ جان نثاروں کے ساتھ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے، سرکارِ ولایت حیدر کرارؑ علمدار تھے، رسول اللہؐ نے انھیں چند مجاہدین کے ساتھ غنیم کی نقل و حرکت کا پتہ چلانے کے لیے بھیجا علی مرتضیٰؑ نے اس فریضہ کو حسن و خوبی سے انجام دیا کہ مشرکین سے پہلے پہنچکر اہم فوجی مقامات پر قبضہ کر لیا۔ اس غزوہ میں جناب امیرؑ نے اپنی شجاعت کے خوب جوہر دکھلائے۔ اس لڑائی میں ستر نامور کافر مارے گئے جن میں ۳۵ صرف حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ نے قتل کیے۔ اور باقی ۳۵ کو سارے مسلمانوں نے مل کر مارا۔ اس لیے علامہ شبلی لکھتے ہیں، غزوۂ بدر کے ہیرو (اسد اللہ الغالب) علیؑ ابن ابی طالب ہیں۔[1]

حضرت مناظر گیلانی اس غزوہ کی اہمیت پر اپنی تالیف "امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت علیؑ کی پچھلی زندگی پر تنقید کرنے والے ان کی زندگی کے ابتدائی خدمات پر اپنے آپ کو کیوں اندھا بنا لیتے ہیں۔ وہ اسلامی اٹلس Atlas میں ایران و مصر، شام و عراق کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن میں پوچھتا ہوں کہ قادسیہ میں جو کامیابی مسلمانوں کی نصیب ہوئی کیا بدر کی فیصلہ کن کامیابی کے بغیر نصیب ہو سکتی تھی؟"[2]

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول ص ۲۵۷ [2] تواریخ معاویہ ص ۵۷ و ص ۵۸

غزوۂ اُحد یہ لڑائی غزوۂ بدر کی شکست کے انتقام میں ہوئی تھی۔ ابوجہل، عتبہ شیبہ اور حنظلہ جیسے نامور قریش اس میں تہ تیغ ہوئے تھے۔ شعرا انتقام لینے کے لیے کفار کو بھڑکا رہے تھے، کفار کے لشکر کو ابوسفیان کی زوجہ حضرت معاویہ کی ماں اور یزید کی دادی اپنی سہیلیوں کے ساتھ محرک جذبات اشعار گا گا کر شجاعانِ عرب کو بھڑکا رہی تھیں۔ غنیمت کی طمع میں مسلمانوں کے ایک گروہ نے اہم فوجی مقامات کو خالی کر دیا تھا۔ اسلامی لشکر کے بہادروں کی یہ حالت تھی کہ قرآن حکیم کی زبان میں جان کے خوف سے پہاڑ پر چڑھے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے، رسول اللہؐ اس جنگ میں زخمی ہوئے، جب کفار نے رسول اللہؐ پر حملہ کیا تو علی مرتضیٰؓ نے اپنی فداکاری سے رسول اللہؐ کی جان بچائی۔ اور اپنے ثباتِ قدم سے اس عظیم شکست کو فتح سے بدل دیا۔

کاظمہ، مثنیٰ، ولجہ اور الیس کی لڑائیوں پر فخر کے شادیانے بجانے والوں سے کوئی پوچھے کہ اگر حضرت خالد بن ولید کے اس حملہ سے جو انھوں نے جنگِ اُحد میں پہاڑی کو خالی کرنے والے مسلمانوں پر کیا تھا، مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو کیا حضرت خالد فاتح عراق ہو جاتے؟ اگر خاکم بدہن رسول اللہؐ اُحد میں شہید ہو جاتے تو وہ تنظیم کس طرح عالمِ وجود میں آتی جس نے انبار، عین التمر اور دومۃ الجندل میں فتوحات حاصل کیں؟ فتدبر لاتکن من الجاھدین۔

مناظر گیلانی لکھتے ہیں:۔

غزوۂ خندق "سچ کہتے تھے ابوہریرہ کہ جب کسی ملک کے فتح کی خبر مدینہ پہنچتی تھی، کہ خبر گو آج آئی ہے لیکن فتح کا

یہ واقعہ تو اس دن پیش آچکا تھا جب مدینہ کے اطراف میں رسولؐ اور رسولؐ کے ساتھی خندق کھودنے میں مصروف تھے۔ تم نے تو دجلہ کے کنارے دیکھا کہ سعد بن ابی وقاص اپنی فوج کو تیراتے ہوئے مدائن کی طرف لے جا رہے ہیں، لیکن دیکھنے والوں نے اس واقعہ کو اسی دن دیکھ لیا تھا جب مدینہ کی خندق پھاند کر عمرو بن عبد وُد سا سورما اس شخص سے مبارزت طلب کر رہا تھا جس نے ایک ہی وار میں سو سے برابر سمجھے والے اس پہلوان کو دو ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ یقیناً حافظے کمزور بھی ہوتے ہیں لیکن کیا اتنے کمزور کہ ہر دوسرے قدم کو اٹھانے کے بعد دماغ سے یہ بات نکل جائے کہ دوسرا قدم اٹھ ہی نہیں سکتا۔ اگر پہلا قدم نہ اٹھتا۔ یہ فطرت کی انتہائی دنائت اور گندگی ہے کہ جس نے سارے جسم کے کانٹوں کو نکالا اس کے احسانوں کا صرف اس لیے انکار کر دیا جائے کہ آنکھ جب کھلی تو ہمارے سامنے صرف وہی تھا۔ جس نے آخر میں آنکھ کے کانٹوں کو کھینچ لیا تھا۔"[1]

اقتصادیات اور سیاسیات کا انقلاب آفریں ہیرو معمارِ سلطنتِ اسلامیہ فاتح خیبر حیدرِ کرار

فتح خیبر اسلامی اقتصادیات و سیاسیات میں ایک انقلابِ عظیم تھا۔

اقتصادیات فتح خیبر سے پہلے مسلمانوں کی معاشی حالت کے متعلق حضرت عبد اللہ ابن عمر ارشاد فرماتے ہیں:۔

---

[1] تواریخ المعادیہ گویا جہان آبادی ص ۵۰

"ہم نے کبھی سیر ہو کر کھانا نہ کھایا مگر فتح خیبر کے بعد"[1]

حضرت ام المومنین بی بی عائشہ ارشاد فرماتی ہیں :-

"جب خیبر فتح ہوا تو ہم نے کہا اب ہم سیر ہو کر کھجوریں کھائیں گے"[2]

فتح خیبر کے بعد جو مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اس میں معاشرتی اسباب کا تو ذکر نہیں صرف سونا (جو سلطنت کی ریڑھ کی ہڈی ہے) بعض روایات کے لحاظ سے ... قنطار تھا اور خیبر کی سالانہ آمدنی ہزاروں وسق کھجور اور ہزاروں وسق اناج تھا۔ فاتح خیبر کے دبدبہ سے یہودیوں میں مسلمانوں سے لڑنے کی تاب و تواں نہ رہی اس لیے انھوں نے اپنی فدک، وادی القریٰ اور تیما جیسی زرخیز و حاصل خیز نوآبادیاں (Colonies) مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔ جس سے اسلامی مالیات میں ایک عظیم الشان ارتقا ہوا، ایسا ارتقا جس سے مسلمان اس قابل ہوئے کہ ایران و روما جیسی منظم و متمدن سلطنتوں سے جنگ کر سکیں۔ مناظر گیلانی لکھتے ہیں :-

"مسلمان خوش ہوتے ہیں کہ یرموک ندی کے کنارے پر ان کے دشمنوں کو معجزانہ شکست اٹھانا پڑی، لیکن یرموک کی خوشی پر شادیانے بجانے والوں سے کوئی پوچھے کہ

ارے محسن کشو!

یرموک پر تم پہنچ بھی سکتے تھے اگر کھولنے والا تم پر خیبر کے پہاڑی قلعوں کے دروازوں کو نہ کھول دیتا؟"[3]

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۰۹ طبع اصح المطابع دہلی۔

[2] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۰۹ طبع اصح المطابع دہلی [3] تواریخ المعادیہ صفحہ ۵۸

ہمارے زمانے میں دو عالمگیر لڑائیاں ہوئی ہیں۔ اس میں مقبوضات رکھنے والوں اور مقبوضات نہ رکھنے والوں میں تصادم تھا۔ (Conflict of haves and have nots) ایک طرف اتحادی تھے اور دوسری طرف جرمنی اور اس کے حلیف، جرمنی کو جو سائنٹیفک حیثیت سے اتحادیوں پر برتری رکھتا تھا کیوں شکست ہوئی؟ صرف اس لیے کہ اس کے پاس ذرائع کی کمی تھی، معلوم ہوا کہ متمدن سلطنتوں میں جب تصادم ہوتا ہے تو اقتصادی حالات کا بھی بڑا اثر پڑتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی معاشی حالت وہی رہتی جو فتح خیبر سے پہلے تھی اور جسے حضرت عبداللہ بن عمر اور ام المومنین حضرت عائشہ نے بیان فرمایا ہے تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ ایران و روم کی متمدن سلطنتوں کو شکست دیکر اتنی بڑی سلطنت قائم کر سکتے؟ حقیقت یہ ہے کہ جب فاتح خیبر، درِ خیبر کو اپنی ضرب سے وا کر رہے تھے تو مسلمانوں پر غیر ملکی فتوحات کے دروازے بھی کھل رہے تھے۔

سیاسیات خیبر کی فتح کے معاشی نتائج کی طرح اس کے سیاسی نتائج بھی بہت عظیم الشان تھے۔

۱۔ یہودی جو عرب میں صیہونی حکومت کے خواب دیکھ رہے تھے ان کے خواب پریشان ہو گئے۔ عرب کو یہودی سامراجیت سے بچانا اور صیہونی غلامی سے آزاد کرنا فاتح خیبر کا زریں کارنامہ ہے۔

۲۔ غزوۂ خیبر اسلامی سلطنت کا سنگِ بنیاد ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:۔
"یہ پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلم رعایا بنائے گئے اور طرزِ حکومت کی بنیاد قائم ہوئی۔ خیبر اس قاعدہ کے مطابق اسلام کا پہلا غزوہ ہے۔[1]"

---

[1] سیرۃ النبی جلد ا صفحہ ۳۵۲

اس بیان سے ظاہر ہے کہ اس سے پہلے جس قدر اسلام کو جنگی فتوحات حاصل ہوئیں ان میں اسلام کو نظامِ حکومت کے قیام کا موقعہ نہ ملا۔ یہ غزوہ خیبر ہے جس میں مسلمان راعی بنے اور یہود نے اپنا رعایا ہونا تسلیم کیا۔ اس لحاظ سے فاتح خیبر کو "اسلامی سلطنت کا معمار" (Builder of Islamic State) کہنا مبالغہ نہیں اگرچہ اس سے قبل فتوحات میں بھی حضرت علیؑ ہی نمایاں نظر آتے ہیں۔

توسیع سلطنت

جنگِ خیبر نہ صرف اسلامی سلطنت کے قیام کا سبب ہوا بلکہ توسیعِ سلطنتِ اسلامیہ کا بھی۔ چنانچہ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"فتح خیبر کے دبدبے سے جو علاقے تیما، وادی القریٰ، اور فدک مسلمانوں کے ہاتھ آئے، وہ بھی نہایت زرخیز تھے[1]۔"

قادسیہ کی فتح پر ناز کرنے والے مسلمان بتلائیں کہ اگر خیبر فتح نہ ہوتا تو ایسے ذرائع مسلمانوں کو کیسے میسر ہوتے کہ ایرانیوں کو شکست دیکر بے شمار مالِ غنیمت حاصل کر سکتے۔ جن میں وہ جواہرات بھی تھے جو سپہ سالار رستم کی نعش سے اتارے گئے تھے۔ انکی مالیت ستر ہزار اشرفی تھی، اس کے علاوہ جواہرات، اسلحہ اور بے شمار گھوڑے مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے۔

صُلح حُدیبیہ

جس میں حضرت علی مرتضیٰؑ صلح نامہ کے کاتب تھے، مشرکین نے لفظ رسول اللہؐ پر اعتراض کیا۔ سرورِ کائناتؐ نے اسے مٹا دینے کا حکم دیا لیکن حضرت علیؑ نے محبت و معرفت سے متاثر ہو کر عرض کیا، خدا کی قسم میں اسکو نہیں مٹا سکتا۔ یہ حضرت علی علیہ السلام کے اس انتہائی عشق کی دلیل ہے جو آپ کو

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد ا صفحہ ۲۶۸

سرکارِ دو عالم محمد مصطفےٰؐ ارواحنا لہ الفداء سے تھا۔

فتح مکہ مولودِ کعبہ کے ہاتھ سے سرکارِ رسالتؐ نے تطہیر بیت اللہ کرائی اور دُنیا کے سامنے یہ منظر پیش کیا۔

علیؑ بر دوشِ احمد چشمِ بد دُور
عیاں شد معنئ نورٌ علےٰ نور

فتح حنین فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین کا معرکہ پیش آیا۔ اس میں پہلے مسلمانوں کو فتح ہوئی لیکن جب وہ مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف ہوئے تو شکست خوردہ غنیم نے غافل پاکر پھر اچانک حملہ کر دیا۔ اس حملے سے مسلمان اس طرح پریشان ہوئے کہ بارہ ہزار کے لشکر میں سے صرف چند نفوس ثابت قدم رہ سکے، مگر حضرت علی علیہ السلام نے اپنی پامردی اور استقلال سے شکست کو فتح سے بدل دیا۔

غزوۂ تبوک سرکارِ رسالتؐ نے تبوک روانہ ہونے سے پہلے امیرالمومنین علی المرتضیٰؑ کو اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر فرمایا اور تمام نظامِ ملکی ان کے ہاتھ میں دے کر روانہ ہوئے۔

مہمِ یمن اور اشاعتِ اسلام تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو مہیں روانہ فرمائیں ان میں یمن کی مہم پر خالد بن ولید مامور ہوئے لیکن چھ مہینے کی مسلسل جدوجہد کے باوجود اشاعتِ اسلام میں کامیاب نہ ہوسکے۔ پھر حضورؐ نے حضرت علیؑ کو بلاکر یمن جانے کا حکم دیا۔ حضرت علیؑ کے یمن پہنچتے ہی یہاں کا رنگ بالکل بدل گیا۔ جو لوگ خالد کی شب شاہہ کوشش سے اسلام کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے وہ حضرت

علی مرتضیٰؑ کی صرف چند روزہ تعلیم و تلقین سے اسلام کے فیدائی ہو گئے اور قبیلہ ہمدان مسلمان ہو گیا۔[1]

سورۂ برأت

جناب رسالتمآبؐ نے حضرت ابوبکر کو ۹ھ کے موسم حج میں سورۂ برات کی چالیس آیات کی تبلیغ پر مامور فرمایا لیکن حضرت ابوبکر کے روانہ ہوتے ہی وحی نازل ہوئی کہ تبلیغ یا آپ کریں یا علیؑ۔ آپ نے اسی وقت حضرت علیؑ کو حضرت ابوبکر کے پیچھے روانہ کیا اور حکم دیا کہ حضرت ابوبکر سے سورۂ برات کی آیات لے لیں اور خود تبلیغ کریں۔ حضرت علیؑ خاص ناقۂ رسولؐ پر سوار ہو کر چلے اور ایک دن اور ایک رات کے سفر کے بعد حضرت ابوبکر کے پاس جا پہنچے اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے حکم کے مطابق آیات لے کر مکے تشریف لائے اور آیاتِ الٰہی و پیغامِ خداوندی سے عوام کو مطلع کیا۔[2]

واقعۂ مباہلہ

مباہلہ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ تھا، جب نجران کے عیسائی اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے قرآنی دلائل سے قائل نہ ہوئے تو رسولؐ نے انھیں مباہلہ کی دعوت دی اور کہا کہ تم اپنے بیٹوں کو لاؤ، ہم اپنے بیٹوں کو لاتے ہیں، تم اپنی خواتین کو لاؤ، ہم اپنی خواتین کو لاتے ہیں، تم اپنے نفسوں کو لاؤ، ہم اپنے نفسوں کو لاتے ہیں، پھر ہم جھوٹوں کے لیے بددعا کریں۔ جناب رسالتمآبؐ بیٹوں کی

---

[1] زرقانی جلد ۲ صفحہ ۱۲۳ [2] ارجح المطالب باب ۲ صفحہ ۵۰۸ از خصائص نسائی، کنز العمال ص ۲۴۶، حدیث ۴۰۴ و ص ۲۴۷ حدیث ۴۱۴۔ فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۲۴۵، تفسیر سورۂ برائت، تاریخ حبیب السیر جلد ۱ جزو ۴ ص ۲، طبقات ابن سعد جلد ۲ ق ۱ ص ۱۲۱، صحیح بخاری پ ۲ ص ۲۳۸۔ کتاب الصلوٰۃ پ ۱۹، کتاب التفسیر ص ۱۴۲، تاریخ ابوالفدا جزو اول ص ۱۵۰، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۳۳۔ تاریخ خمیس جلد ۱ ص ۱۵۶، تفسیر درِ منثور سیوطی ج ۳ ص ۲۰۹ و ص ۲۱۱، تاریخ کامل جلد ۲ ص ۱۱۸، تاریخ طبری جلد ۳ ص ۱۴۲

بجائے حسنین علیہما السلام کو، خواتین کی بجائے سیدہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو اور نفسوں کی بجائے حضرت علی علیہ السلام کو لے کر وارد میدان مباہلہ ہوئے، تو ان نورانی صورتوں کو دیکھ کر عیسائی اس قدر مرعوب ہوئے کہ اعتراف شکست کیا اور جزیہ دینا منظور کیا۔ یہ واقعہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

واقعۂ غدیرِ خم حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر جب سرکارِ رسالت مقامِ خم غدیر پر پہنچے تو حکم ہوا:۔

"اے رسولؐ! وہ پیغام جو تجھ پر بھیجا گیا ہے، امت تک پہنچا دو۔ اگر تم نے عملاً ایسا نہ کیا تو خدا کی رسالت ہی ادا نہ کی، اللہ تمہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔"

جناب رسالت مآبؐ نے اس پر خطبہ ارشاد فرمایا، اور علی علیہ السلام کی خلافت کا ان الفاظ میں اعلان کیا:۔

"جس کا میں مولا ہوں، اس کا یہ علیؑ مولا ہے"

دستار بندی خطبہ میں جناب رسالت مآبؐ نے دستار بندی کی رسم ادا کی۔ حضرت علیؑ کے سر پہ عمامہ باندھا اور اس کی تحت الحنک پیچھے کی طرف لٹکا دی[1]

ہدیۂ تبریک اس واقعہ پر تمام صحابہ نے حضرت علیؑ کو مبارک باد پیش کی اور امہات المومنین نے بھی ہدیہ تبریک پیش کیا[2]

---

[1] ریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۲۱۷، الاصابہ جلد ۲ ترجمہ علی، کنز العمال جزء ۶ صفحہ ۹ حدیث ۱۲۰۹ و ۱۲۱۴ مسند ابو داؤد طیالسی وغیرہ [2] قرۃ العین شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مسند احمد حنبل تذکرہ خواص الامۃ، معارج النبوۃ، تاریخ احمدی۔

قصائد شعرائے دربارِ رسالتؐ نے قصائد پڑھے، حسان بن ثابت انصاری کے قصیدۂ تہنیت کا ایک شعر یہ ہے :-

وقال لہ قم یا علی فاننی
رضیت من بعدی اماماً وھادیاً

"سرکارِ رسالتؐ نے فرمایا، اے علیؑ اٹھو! کیونکہ میں اس بات پر راضی ہوں کہ تم میرے بعد امام و ہادیٔ خلق ہو۔" [۱]

عمرو عاص نے مبارکبادیں قصیدہ پڑھا جس کا ایک شعر یہ ہے :-

وضربتہ کبیعتہ بخم
معاقدھا من القوم الرقاب

"حضرت علیؑ کی ضربت ایسی ہے جیسی ان کی خم غدیر کے دن بیعت جس نے قوم کی گردنوں کو جھکا دیا ہے۔" [۲]

بلکہ سعد بن عبادہ انصاری نے بھی اس واقعہ کو نظم کیا۔ [۳]

اس سارے واقعہ کے بعد آیۂ اکمالِ دین و اتمامِ نعمت نازل ہوئی۔ اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

"آج میں نے تمہارے دین کو کامل کردیا اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کردیا اور میں نے تمہارے لیے دینِ اسلام کو پسند کیا۔"

---

[۱] الازہار فی عقدۃ الاشعار جلال الدین سیوطی [۲] مناقب اخطب خوارزم
[۳] تذکرہ خواص الامۃ باب ۲ صفحہ ۲۰، حبیب السیر، روضۃ الاحباب، مسند احمد حنبل الجزء ۴ صفحہ ۲۸۱۔

واقعہ تجہیز جیش اسامہ سرکارِ رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی علالت سے ایک روز پہلے جیش اسامہ کی ترتیب فرمائی سوائے علیؑ و بنو ہاشم سب صحابہ کو شامل ہونے کا حکم دیا، اس لشکر میں خصوصیت سے بڑے بڑے مہاجر و انصار حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت سعد بن وقاص، حضرت ابوعبیدہ جراح وغیرہم جیسے صحابی ایک ایسے غلام زادہ کے زیر کمان جس کی عمر صرف انیس برس کی ہے روانہ کیے جا رہے ہیں لیکن اس صورت میں یہ اکابرِ ملت جانا نہیں چاہتے۔ سرکار رسالتؐ کو یہ بات پسندیدہ نہ تھی چنانچہ علالت کے باوجود مسجد میں تشریف لے گئے اور منبر پر بیٹھ کر خطبہ ارشاد فرمایا۔[1]

قضیۂ قرطاس عبداللہ ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہؐ پر شدتِ مرض بڑھی تو رسالت کدہ میں حضرت عمر اور دوسرے صحابہ موجود تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا، آؤ میں تمہارے لیے ایسا وثیقہ لکھ دوں کہ اس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو، حضرت عمر نے کہا کہ حضورؐ پر بیماری کی کیفیت طاری ہے اور ہمارے لیے کتاب خدا کافی ہے۔ اس پر حاضرین میں اختلاف ہوا، جب بہت شور و غل ہوا تو حضور نے فرمایا میرے پاس سے چلے جاؤ۔ (مسلم و بخاری وغیرہ)

حضرت علیؑ کی یاد اس مرض کے دوران میں سرکارِ رسالتؐ نے فرمایا کہ علیؑ کو میرے پاس بلاؤ۔ حضرت عائشہ نے کہا، کاش آپ حضرت

---

[1] مدارج النبوۃ جلد ۲ ص ۵۲۰ و ص ۵۲۱۔ تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۱۷۱۔ تاریخ طبری جلد ۳ ص ۱۸۸ و ص ۱۸۹۔ تاریخ کامل جلد ۲ ص ۱۲۰، حبیب السیر جلد ۱ جزو ۳ ص ۷۷۔

ابوبکر کو بلاتے، اور حضرت حفصہ نے کہا کاش آپ حضرت عمر کو بلاتے۔ پس اتنے میں یہ حضرات وہاں جمع ہو گئے۔ حضرت نے جب حضرت علیؑ کو نہ دیکھا تو فرمایا کہ تم لوگ واپس چلے جاؤ، اگر تمھاری ضرورت ہوئی تو میں خود تمھیں بلا لوں گا۔

سرکارِ رسالتؐ کی زندگی کے آخری لمحات

رسول اللہؐ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں حضرت علیؑ کے پاس تھے، حضور کا سر مبارک آغوش علیؑ میں تھا کہ حضرت نے رحلت فرمائی۔ حضرت عائشہ سے منقول ہے کہ جب جناب رسالت مآبؐ کا وقتِ وفات قریب آیا تو آپ نے فرمایا، میرے حبیب کو میرے پاس بلاؤ، میں نے حضرت ابوبکر کو بلا بھیجا تو حضرت نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر تکیہ پر رکھ لیا۔ اور پھر فرمایا کہ میرے حبیب کو میرے پاس بلاؤ۔ میں نے حضرت عمر کو بلایا، آپ نے سر اٹھا کر انھیں دیکھا پھر تکیہ پر سر رکھ لیا، اور پھر فرمایا کہ میرے حبیب کو بلاؤ۔ جب علیؑ آئے اور رسول اللہؐ نے انھیں دیکھا تو وہ کپڑا جو اوڑھے ہوئے تھے آپ نے اٹھا لیا، اور علیؑ کو اس میں داخل کر لیا، اور علیؑ کو اپنے سینہ سے لگائے رہے۔ یہاں تک کہ آپ نے انتقال فرمایا، اس وقت بھی آپ کا ہاتھ علیؑ کے اوپر تھا۔[1]

تجہیز و تکفین

یہ امر تاریخی مسلمات میں سے ہے کہ جناب رسالت مآبؐ کو آخری غسل جناب امیرؑ نے دیا اور حضور کو قبر میں اتارا۔[2]

---

[1] ارجح المطالب باب ۴ صفحہ ۶۹۳، طبقات ابن سعد ق ۲ جلد ۲ صفحہ ۵۱، مدارج النبوۃ جلد ۲ صفحہ ۵۵۱ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ، معارج النبوۃ رکن ۴ باب ۱۴ فصل ۳ صفحہ ۲۵۳، وسیلۃ النجات صفحہ ۱۳ و صفحہ ۲۲

[2] تاریخ خمیس بجز ثانی صفحہ ۸۹ و صفحہ ۹، الاستیعاب الجز ثالث اول ترجمہ علی، تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۲۰۴ و صفحہ ۲۰۵۔ طبقات الکبریٰ، ابن سعد ج ۲ ق ۲ صفحہ ۶۱ صفحہ ۹۱ صفحہ ۷۶ و صفحہ ۸

اما میکہ روزِ وفاتِ پیمبر
خلافت گزارد بماتم نشیند (فیضی)

دورۂ تربیتِ امت

۲۵ سال، از رحلت سرکارِ رسالت تا آغازِ حکمرانی

اس دورۂ حیات میں جناب امیر علیہ السلام کی پوزیشن سیاسی طور پر حزبِ اختلاف کے قائد (Leader of opposition Party) کی تھی۔ حضرت علی علیہ السلام کا یہ یقین و اعتقاد تھا کہ ان کو سرکارِ رسالت علیہ الصلواۃ والسلام نے اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر کر دیا تھا، خلافت ان کا حق تھا، اس پر تمام امتِ اسلامیہ کا اجماع ہے کہ جناب علی مرتضیٰؑ نے بیعتِ حضرت ابی بکر سے تخلف کیا اور ان کے ہمراہ خاندانِ بنی ہاشم کے افراد نے بھی بیعت نہیں کی اور جب ان سے بعد تجہیز و تکفین رسولؐ بیعت طلب کی گئی تو انھوں نے صاف انکار کیا اور بیتِ فاطمہؑ میں جمع ہو گئے[۱] جناب امیر علیہ السلام نے جب بھی انھیں موقعہ ملا اپنا حق جتلایا اور ظاہر کیا کہ خلافت صرف ان کا حق ہے۔ مجلسِ شوریٰ میں جو آپ نے احتجاج کیا وہ سب کتبِ تواریخ میں درج ہے۔ آپ نے اپنے حقوق و فرائض ایک ایک کر کے گنوائے اور ہر فضیلت کے ذکر کے بعد فرماتے تھے

---

[۱] تاریخ طبری الجزء الثالث صفحہ ۱۹۹ و صفحہ ۲۰۰، تاریخ ابوالفدا الجزء الاول صفحہ ۱۵۶، تاریخ الخمیس الجزء الثانی صفحہ ۱۸۵ و صفحہ ۱۸۶، تاریخ ابن کثیر شامی الجزء الخامس صفحہ ۲۴۶۔

آیا تم میں سے کوئی ایسا ہے؟ اور وہ سب اقبال کرتے تھے کہ کوئی نہیں ہے، یہ بھی آپ نے فرمایا کہ سرکارِ رسالت مآبؐ نے خلافت ان کے لیے مخصوص کردی تھی۔[1]

حضرت علیؑ کی اس گفتگو اور احتجاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ شبلی اپنی تالیف المامون صـ۶ پر لکھتے ہیں:—

"جب عبدالرحمٰن ابن عوف نے جو اس نزاع کے طے کرنے کے لیے ثالث مقرر ہوئے تھے حضرت عثمان کا ہاتھ پکڑ لیا، تو حضرت علیؑ نے صبرِ جمیل کیا اور تن بہ تقدیر راضی ہو گئے۔"

اس عبارت میں دو الفاظ قابلِ ملاحظہ ہیں۔ "صبرِ جمیل" اور "تن بہ تقدیر"۔

فقد ابر دا دلاتکونوا من الجاھدین۔

اپنے اس اختلاف کے باوجود حضرت علی علیہ السّلام نے مفادِ ملک و ملت کے لیے مسلمان حکمرانوں سے ہمیشہ تعاون کیا اور بہترین قائدِ حزبِ اختلاف کا نمونہ پیش کیا۔ چنانچہ دورِ حاضر کے دو مشہور مورخوں پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم اور پروفیسر محمد شجاع الدین نے حضرت علی مرتضیٰ کے اس تعاون کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے اور اپنی منصفانہ روش کا ثبوت پیش کیا ہے۔

"حضرت علی خلفائے ثلاثہ کے ہمیشہ ممد و معاون رہے، اور انھوں نے ہر طرح سے ان کی حکومت کو کامیاب بنانے کی کوشش کی اور یہ امر ان کی وسیع القلبی پر دلالت کرتا ہے، حضرت عمر کا قول ہے

---

[1] تاریخ طبری الجزء الخامس صـ۳۵ تا صـ۳۸، تاریخ ابی الفدا الجزء الثانی صـ۱۶۵ و صـ۱۶۶۔ کتاب الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ صـ۲۲، تاریخ حبیب السیر جلد ا جزو ۴ صـ۲۷ و صـ۲۸۔ شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید الجزء الثانی صـ۴۰۹۔ صواعق محرقہ لابن حجر مکی باب التاسع فصل ثانی صـ۷۵

کہ "اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا" وہ ہمیشہ آپ پر اعتماد کرتے تھے۔[۱]

حالانکہ جب اقتدار حضرت کے ہاتھ سے نکل گیا جسے وہ اپنا حق سمجھتے تھے تو اسوقت کچھ لوگ ان کے پاس آتے تھے اور انھیں ہوش دلانا چاہتے تھے اور انھیں اسطرح اُبھارتے تھے کہ آپ حصولِ سلطنت کے لیے کوشش کیجیے جو آپ کا واقعی حق ہے نیز یہ کہ ہم آپ کی مدد کے لیے تیار ہیں، ان میں سچے دوست بھی تھے اور نمائشی بھی۔ ایک طرف رسول اللہؐ کے چچا حضرت عباس ابن عبدالمطلب کہتے ہیں کہ اپنا ہاتھ بڑھاؤ میں تمھاری بیعت کرلوں، اس کا مسلمانوں پر بڑا اثر پڑے گا، اور وہ کہیں گے کہ پیغمبر کے چچا نے ان کے ابن عم کی بیعت کرلی، پھر کسی کو عذر نہ ہوگا، اور دوسری طرف بنی امیہ کا سردار ابوسفیان بن حرب ہے اور وہ آکر اس طرح جذبات کو ہیجان میں لانے کی کوشش کرتا ہے "غضب کی بات ہے کہ آپ لوگوں کے ہوتے ہوئے دوسرے خاندانوں نے غلبہ حاصل کرلیا، خدا کی قسم! میں آپ کی امداد کے لیے مدینہ کو سوار اور پیادوں سے بھر دوں گا۔" مگر وہ جذبات سے بلند، وہ خود غرضی کے لوث سے پاک، وہ اسلام کا سچا محافظ اور فرض شناس انسان ان لوگوں کے کہنے میں نہیں آتا، وہ ابوسفیان کو اس طرح ڈانٹ کر جواب دیتا ہے کہ خدا کی قسم تو ہمیشہ اسلام اور اہلِ اسلام کا دشمن رہا ہے[۲] گویا حضرت علی مرتضیٰ اپنی روش سے مسلمانوں کو بتلا رہے ہیں کہ ہمارے حقوق ہاتھ سے جائیں ہمارے ذاتی مفاد کو نقصان پہنچے مگر ہم ہمیشہ اسلام کے مفاد پر نظر رکھتے ہیں اور اس کے لیے

---

[۱] تاریخ اسلام حصہ اوّل ص۱۸۴ و ص۱۸۵

[۲] استیعاب جلد ا ص۳۴۵ و جلد ۲ ص۱۰۷ طبع مصر، صواعق محرقہ ص۳۷ طبع مصر

ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہتے ہیں۔

اس دور میں جبکہ آپ ایک معمولی شہری کی حیثیت سے مدینہ طیبہ میں رہتے تھے، اشاعتِ علوم میں مصروف رہے۔ چنانچہ رائٹ آنریبل مسٹر سید امیر علی مرحوم لکھتے ہیں۔

"جس زمانے میں اسلام دور دراز ممالک میں پھیل رہا تھا، علیؑ مدینہ میں عربوں کی ابھرتی ہوئی قوم کی دماغی قوت کو بڑھا رہے تھے، مدینہ کی جامع مسجد میں علیؑ اور ان کا عم زاد بھائی اور شاگرد عبداللہ ابن عباس ہفتہ وار فلسفہ، منطق، فصاحت و بلاغت، حدیث و فقہ پر لیکچر دیا کرتے تھے، یہ ابتدا تھی، اس دماغی تحریک کی جس نے بعد میں بہت زور شور کے ساتھ بغداد میں ظہور کیا۔" ؎۱

اس دور میں رسول اللہؐ کی وفات کے بعد حضرت علی علیہ السلام گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے، انھوں نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا، وہ ہر وقت ایک گوشے میں بیٹھے قرآن کے متفرق اجزاء کو جمع کرتے رہتے تھے، اگر کوئی پوچھتا تھا تو فرماتے تھے میں نے عہد کیا ہے کہ ردا دوش پر نہیں ڈالوں گا جب تک کہ قرآن کو اسکی اصلی ترتیب اور شانِ نزول کے مطابق جمع نہ کرلوں، اس سے علی مرتضیٰؑ دنیا کو بتلا رہے تھے کہ چاہے حالات کتنے ناساز گار ہوں مگر ہمیں اسلام کی خدمت میں مصروف رہنا ہے، ہمارا اور قرآن کا ساتھ ہے، اس لیے قرآن کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ اس فرض کو کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

؎۱ سپرٹ آف اسلام ص۴۹

پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم اور پروفیسر شجاع الدین لکھتے ہیں :۔

"اگرچہ حضرت علیؑ اپنے حق خلافت کے قائل تھے لیکن اسلام کی محبت نے ان کے سینہ کو فراخ اور ان کے قلب کو وسیع بنا دیا تھا، وہ کسی کے جبر سے نہیں بلکہ اسلام کی بہبودی اور بہتری کے خیال سے خاموش رہے اور خلیفۂ وقت کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ اگر وہ حصول تخت کے لیے حضرتِ ابوبکر کے خلاف تلوار نکالتے تو اسلام عرب کے ریگزاروں ہی میں جذب ہو کر رہ جاتا۔ اسلام میں تفرق پیدا نہ کرنے اور مسلمانوں کو باہمی سرپھٹول سے بچا کر اعدائے دین کے خلاف سرگرم عمل رکھنے کے لیے حضرت علیؓ نے اپنے رجحانات اور خیالات کی قربانی کی۔ یہاں تک کہ انھوں نے حضرت عباس اور ابوسفیان کی ترغیب اور امداد کے وعدوں کی پرواہ نہ کی۔ اس ایثار و قربانی کی جس قدر بھی قدر کی جائے کم ہے" [۱]

وہ اس دور میں حزب اقتدار کو مفید سیاسی مشورے دیتے رہے۔ چنانچہ جب حضرت عمر ابن خطاب نے جنگ روم میں خود جانے کا ارادہ کیا تو جناب امیرؑ سے مشورہ کیا اس موقعہ پر آپ نے یہ کلمات ارشاد فرمائے :۔

"اللہ تعالیٰ اہلِ اسلام کا ضامن اور ان کے حدود و اطراف کا نگہبان ہے اور ان کے ان رازوں کا (جن سے دشمن آگاہ ہونے کی جدوجہد کر رہا ہے) پوشیدہ رکھنے والا ہے اور اس خدائے بزرگ و برتر

---

[۱] تاریخ اسلام صفحہ ۱۷۵، ۱۷۶

نے اس زمانے میں مسلمانوں کی مدد کی جب کہ وہ تعداد میں کم تھے، اور دشمن سے انتقام نہیں لے سکتے تھے، اور انھیں مغلوب ہونے سے بچائے رکھا، حالانکہ وہ کم تھے، اور قوتِ دفاع سے محروم تھے، جب اللہ نے اس وقت مدد فرمائی تو اب کیوں نہ فرمائے گا، کیونکہ وہ خدائے متعال زندہ ہے، اس پر موت کبھی طاری نہیں ہوگی۔

اگر تم خود دشمن (قیصر روم) سے لڑنے کے لیے گئے اور اس سے بھڑ گئے اور شکست کھا گئے تو دور دست شہروں اور سرحدوں کے مسلمانوں کو کہیں پناہ نہ مل سکے گی، تمھارے کشتہ ہونے یا شکست یاب ہونے کے بعد کوئی مرجع نہیں ہوگا۔ کہ مسلمان فتنہ و فساد سے بچنے کے لیے اس کی طرف مراجعت کر سکیں۔ لہٰذا مصلحت یہ ہے کہ تم خود تو نہ جاؤ، ہاں اپنے بجائے مردِ جنگ دیدہ و دلیر کو ان کی طرف بھیج دو، اور اس کے ساتھ ایسے لوگوں کو روانہ کردو جو جنگ کے شدائد اور سختیوں کو جھیل سکیں اور اپنے سردار کی نصیحتوں اور ہدایتوں کو قبول کر سکیں، اور اگر یہ لوگ غالب آ گئے تو فھو المقصود اور کیا چاہیے۔ اور اگر کچھ اور پیش آیا تو تمھاری ذات مسلمانوں کی بدستور مددگار رہے گی، دوسرا لشکر فراہم کر کے دوبارہ جنگ چھیڑ سکو گے۔[1]

جہاد اسلام میں جہاد کے صرف دو مقصد ہیں جیسا کہ قرآنِ حکیم نے بھی اس کی توضیح کی ہے:۔

۱۔ ایک کفارِ مکہ سے بطور قصاص کے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۲، مترجم رئیس احمد

۲۔ دوسرے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت و دفاع کے لیے۔
کفار مکہ سے قصاص لینے کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ اس طرح ہے۔
واقتلوا هم حیث ثقفتموهم واخرجوهم من حیث
اخرجوکم والفتنة اشد من القتل۔
(سورہ البقرہ پ ۲ ع ۲۴)
"تم ان کو قتل کرو جہاں پاؤ، اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دو۔
جس طرح انھوں نے تمھیں گھروں سے نکالا تھا۔"
اور دفاع کے متعلق قرآنی ارشاد کے یہ الفاظ ہیں:۔
"وقاتلوهم حتیٰ لا تکون فتنة" (سورہ انفال)
"ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے"
یہ دفاعی جنگ ہوگی۔
بجبر اشاعت اسلام کے لیے جنگ قطعاً ممنوع ہے۔ اس امتناع
کے لیے یہ آیت کافی ہے۔
"لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی"
(سورۃ البقرہ پارہ ۳ رکوع ۲)
"دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ نہیں ہے، گمراہی سے ہدایت ظاہر
ہو گئی۔"
علامہ شبلی نے اس کے متعلق کہ اسلامی جہاد کیا ہے لکھا ہے:۔
"اسلام کا اصلی مقصد تبلیغ و دعوت ہے، اب اگر کوئی قوم اس

دعوت کی سدِراہ نہ ہو تو اسلام کو نہ تو اس سے جنگ ہے نہ اس کے رعایا بنانے کی ضرورت ہے صرف معاہدۂ صلح کافی ہے جس کی بہت سی مثالیں اسلام میں موجود ہیں۔ لیکن جب کوئی قوم خود اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اس کو مٹا دینا چاہے تو اسلام کی مدافعت کے لیے تلوار ہاتھ میں لینی پڑتی ہے اور اس کو اپنے زیرِاثر رکھنا پڑتا ہے[1]

تمام امتِ اسلامیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ جناب رسول اللہ کے تمام جہاد دفاعی تھے۔

حضرات خلفائے ثلاثہ کے زمانے کی لڑائیاں اس معیار پر پوری نہیں اترتیں، ان کی غرض و غایت یہ تھی کہ:-

۱۔ حکومت پر نکتہ چینی کرنے کی فرصت لوگوں کو نہ ملے۔
۲۔ لوگوں کی نظروں میں کارپردازانِ حکومت ہردلعزیز ہو جائیں۔
۳۔ مالِ غنیمت کی وجہ سے لوگ خوش رہیں۔ اور حکومت مستحکم ہو جائے۔

جناب امیر علیہ السلام نے اربابِ اقتدار کی اس پالیسی سے کبھی اتفاق نہیں کیا۔ مگر حزبِ اختلاف کے سلیم اور صحیح الرائے قائد کی حیثیت سے ملک کے دفاع کی حفاظت ان کا اوّلین فریضہ تھا۔ اس لیے غزوۂ روم میں انھوں

---

[1] سیرت النبی حصہ اول جلد اول تقطیع کلاں۔ صفحہ ۳۵۲

نے سیاسی رئیس مملکت کو صحیح مشورہ دیا، اس مشورہ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ مشورہ دفاعی مفاد کے لیے تھا۔

یہ مشورہ گذشتہ زمانۂ نبوی کی جنگوں کے مشاہدات کی بنا پر ہے۔ چونکہ حضرت عمر جنگجو سپاہی نہیں تھے بلکہ مرکز میں رہ کر تجہیزِ عساکر میں کامل مہارت رکھتے تھے ع "ہر کسے را بہر کارے ساختند" حضرت عمر نے جنگِ فارس میں جب خود شریک ہونا چاہا اور اس باب میں آپ سے مشورہ کیا تو آپ نے فرمایا:۔

"اگر آپ نے اس سرزمین مدینہ سے باہر قدم نکالا تو عرب اطراف و جوانب سے ٹوٹ پڑیں گے، عہد توڑ دیں گے، اور فساد و تباہ کاری پر مائل ہو جائیں گے، اور یہ ان رخنوں سے زیادہ اہم ہو جائیں گے جو اس وقت آپ کے سامنے ہیں"[۱]

اس دور کے متعلق ایک فاضل عیسائی پروفیسر فواد افرام البستانی لکھتے ہیں:۔

"انّ الخلفاء لم یستغنوا عنہ بل کانوا یستشیرونہ فی الامور الصعبۃ فھو الذی اشار علیٰ عمر باتخاذ الھجرۃ مبدءً لتاریخ الحوادث وقیل انّہ اول من اشار الیہ بجمع القرآن"۔[۲]

"خلفاء حضرت علیؑ سے بے نیاز نہ تھے بلکہ مشکل مسائل میں ان سے مشورہ لیتے تھے، انھوں نے بھی خلیفہ دوم کو مشورہ دیا تھا، کہ اسلامی

---

[۱] نہج البلاغہ ص ۱۴۶

[۲] علیؑ ابن ابی طالب لفواد افرام بستانی

سال بن ہجرت سے شروع کیا جائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خلیفۂ دوم کو حضرت علیؑ نے ہی جمع القرآن کا مشورہ دیا تھا۔"

خلیفۂ سوم کی یورش کے وقت تاریخ حضرت علیؑ کو ہمارے سامنے ایک غیرت مند شریف انسان کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ انھوں نے دونوں فریق میں سمجھوتہ کی گفتگو کی اور جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو اپنے دونوں بیٹوں کو خلیفہ کی حفاظت کے لیے بھیجا۔[1]

ہاں جب اصول کی بات آجاتی تو خلفا کی مخالفت بھی کرتے تھے مگر ایسے انداز سے کہ جس سے نظمِ ملک و ملت کو نقصان نہ پہنچے۔ حضرت عثمان نے حضرت ابوذر غفاری کو اس بنیادی اور اساسی اختلاف کے باعث جو تاریخ اسلام کا نہایت ہی اہم اور قابلِ غور واقعہ ہے۔ جلا وطن کر دیا تھا اور اسی عالمِ جلا وطنی میں اس عظیم و جلیل صحابیٔ رسولؐ نے وفات پائی۔ جب انھیں جلا وطن کیا گیا تو حکومت نے اس امر کی ممانعت کر دی تھی کہ کوئی انھیں رخصت نہ کرے لیکن اس مخالفت کے باوجود جناب امیر علیہ السلام، حسنین علیہما السلام کے ساتھ ان کی مشایعت کے لیے تشریف لے گئے اور وقتِ رخصت انھیں ارشاد فرمایا:-

"اے ابوذر! اللہ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لیے تم نے عتاب اختیار کیا پس اسی سے امیدوارِ کرم بھی رہو جس کے لیے تم نے یہ عتاب اختیار کیا ہے۔ یہ لوگ اپنی دنیا پر تم سے ڈرتے ہیں۔ اور تم ان لوگوں سے اپنے دین کے لیے خائف

[1] علی ابن ابی طالب لفواد فرام بستانی

ہو ، پس یہ لوگ اپنی جس چیز کے لیے تم سے ڈرتے ہیں ، اسے (یعنی دنیا کو) ان کے حوالے کردو ، جس چیز (دین) کی خاطر تم ان سے خائف ہو ، اسے لے کر چلے جاؤ۔ وہ چیز جس کے یہ بہت حاجتمند ہیں تم نے انھیں نہیں دی اور جو کچھ انھوں نے تمھیں دیا اس سے بالکل بے نیاز ہو ، اور بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ کل (قیامت میں) نفع میں کون رہا اور کس پر حسد کرنے والے زیادہ ہیں ۔ اور اگر آسمان و زمین کے دروازے کسی کے لیے بند ہو جائیں اور وہ شخص متقی اور پرہیزگار ہو خدا ضرور اس کے لیے راہ خلاصی پیدا کریگا ؛

اس بات کا خیال رکھو کہ تم سے خواہ کوئی اُنس نہ رکھے مگر حق مانوس ہو اور تم سے کوئی نہ بھاگے مگر باطل فرار کرے ، پس اگر تم نے ان کی دنیا قبول کرلی تو یہ تمھیں دوست رکھیں گے اور اگر اس دنیا کی کوئی چیز تم نے ان سے لے لی تو یہ تمھیں امن دے دیں گے ؟"

المختصر اس عہد میں باوجودیکہ حضرت علیؑ ابن ابی طالب زمانے کی سرد مہری سے شکستہ دل ضرور تھے لیکن جب کسی علمی مسئلہ میں کسی مہم کے متعلق مشورہ میں نیز مقدمہ کے فیصلہ میں ان کی ضرورت پڑجاتی اور ان سے امداد کی خواہش کی جاتی تو فوراً بلا عذر اور بلا دریغ امداد دینے کے لیے تیار ہو جاتے ۔ حالانکہ یہ امر جذباتی انسانوں کے رویہ کے خلاف ہے ۔ وہ اگر کسی منصب کے حصول سے جس کے وہ امیدوار ہوں محروم کردیے جائیں تو وہ متعلقہ افراد سے خفا ہو کر الگ ہو جائیں گے ۔ اور اگر اس منصب سے تعلق رکھنے

والے معاملات میں ان سے مدد طلب کی جائے تو وہ اپنی سابقہ رنجش کی بنا پر تعاون سے انکار کر دیں گے۔

اگر مسلمانوں نے ابتدا میں اقتدار علیؑ ابن ابی طالب کے سپرد کیا ہوتا تو اسلام کی تاریخ موجودہ تاریخ سے بالکل جداگانہ ہوتی۔ مسلمانوں نے حضرت علیؑ کی اس حیثیت سے فائدہ نہ اٹھایا، تو اس فیض کے بحرِ بیکراں نے ایک دوسرا انداز اختیار کیا۔ انھوں نے اپنی سیرت سے حزبِ اختلاف کے قائد کا بہترین نمونۂ عمل پیش کیا۔

مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کی سلطنتوں کی تباہیوں کا باعث حزبِ اختلاف کا عدم تعاون اور مخالفین کی مبنی باغراض ریشہ دوانیاں رہی ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی سلطنتوں کے استحکام کے لیے دورِ حاضر میں اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ حزبِ اختلاف حضرت علیؑ علیہ السلام کی سیرت اور اسوۂ حسنہ پر عمل کرے۔ جناب امیر علیہ السلام کے اس دورۂ زندگانی کے متعلق دورِ حاضر کے شیعہ رئیس القلم علامہ محمد سبطین اعلی اللہ مقامہ لکھتے ہیں:-

"اس کے بعد تیسرا فرض فرائض خلافت کو ادا کرنا تھا، مگر حالات بدل چکے تھے، اس لیے فطرۃً ادائیگی فرائض میں تغیر ضروری تھا۔ سیاست اسلام ہاتھ میں نہ رہی تھی کہ احکام کا اجرا اور نفاذ کلی اختیار میں ہوتا، اس کے علاوہ جو کچھ بھی خدمت دینِ اسلام کی ہو سکتی تھی کرتے رہے، ہمیشہ اپنے علم و فضل و کمال سے اسلام و پیغمبر اسلامؐ کی تصدیق کرتے رہے۔ ہر ایک منکر و مخالف کو جواب دیتے تھے۔

اور خاموش خدمت کرتے رہتے ۔ جو سوال ہوتا جواب دیتے ۔ قولاً و عملاً ثابت کرتے ع "سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے"

چونکہ محافظِ اسلام حقیقی رہتے کبھی ان مسلمان بادشاہوں نے مشورہ لیا تو بہترین مشورہ دیا حضرت عمر بیت المقدس کے حملے کے وقت خود جانے لگے تو فرمایا مناسب نہیں کہ بادشاہ خود جائے ۔ تم بعد فتح جانا ۔ سرداران لشکر کو بھیجو ہر ایک علمی مسئلہ اور قضیہ میں یہ مسلمان بادشاہ علیؑ ہی سے مدد لیتے رہتے ۔ اور بیسیوں مرتبہ حضرت عمر کو یہ کہنے کا موقع ملا

لولا علی لھلک عمر ۔ اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتے[1]"

ا ۔ حضرت کے پاس ایک عورت لائی گئی جس نے چھ ماہ کے بعد بچہ جنا حضرت عمر نے حکم دیا کہ اسے رجم کر دیا جائے ۔ جب حضرت علیؑ کو اس امر کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالےٰ ہے :-

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین ان یتیم الرضاعۃ

"یعنی بچہ کی رضاعت کا زمانہ پورے دو سال ہے" اور پھر یہ بھی خدا نے فرمایا ہے :-

"حملہ و فصالہ ثلاثون شہرًا"

"کہ حمل و رضاعت کا زمانہ تیس مہینے ہے"

دو سال یعنی چوبیس مہینے رضاعت کے نکال لینے کے بعد چھ ماہ حمل

---

[1] خلافت الٰہیہ حصہ سوم ص ۲۹ و ص ۲۹۱

باقی بچے، لہٰذا معلوم ہوا کہ چھ مہینے میں بھی بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور فرمایا:-

"پروردگارا! تو نے مجھے اس مشکل کے وقت باقی نہ رکھنا جس کے حل کرنے کے لیے ابو الحسنؑ (علیؑ) نہ ہوں۔"[1]

ابو ظبیان سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک زناکار عورت حضرت عمر کے پاس لائی گئی۔ آپ نے اس کے رجم کیے جانے کا حکم دے دیا۔ جب لوگ اس کو پتھر مارنے کے لیے لے چلے تو راہ میں حضرت علیؑ سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے اس عورت کا ماجرا دریافت کیا۔ جب آپ کو اس کے قضیہ کا علم ہوا تو آپ نے اس کو چھڑوا دیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اس کو اس لیے چھوڑا کہ وہ فلاں قبیلہ کی ایک دیوانی عورت ہے اور سرکارِ رسالتؐ نے ارشاد فرمایا ہے:-

"رفع القلم عن ثلاث (۱) النائم حتیٰ یستیقظ، (۲) وعن الصبی حتیٰ یحتلم (۳) وعن المجنون حتیٰ یفیق۔"

"تین شخصوں سے قلمِ تکلیف اٹھا لیا گیا ہے (۱) ایک سونے والا یہاں تک کہ بیدار ہو (۲) دوسرے نابالغ یہاں تک کہ بالغ ہو (۳) تیسرے دیوانہ یہاں تک کہ عاقل ہو جائے۔"

یہ سنکر حضرت عمر نے فرمایا، اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔[2]

---

[1] تذکرہ خواص الامہ صفحہ ۱۳۰، ریاض نضرہ ج ۲ صفحہ ۱۹۴، ابوتراب صفحہ ۱۲۳

[2] ریاض نضرہ ج ۲ صفحہ ۱۹۶، تذکرہ خواص الامہ صفحہ ۵۷، مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۷۹، ابوتراب صفحہ ۱۳۱ و ۱۳۲

۳- ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک ایسا مشکل مسئلہ درپیش ہوا جس کی وجہ سے آپ کبھی کھڑے ہو جاتے اور کبھی بیٹھ جاتے تھے، اور آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ آخر میں آپ نے تمام اصحاب نبیؐ کو جمع کیا اور وہ مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا اور سب سے رائے طلب کی، لیکن سب نے بالاتفاق کہا:۔

"انت المفزع وانت المنزع" "اے امیرالمومنین! آپ ہی تو سب کی پناہ گاہ ہیں، آپ ہی علم کا سرچشمہ ہیں۔"

یہ سنکر حضرت عمرؓ غضب ناک ہو گئے اور فرمایا، خدا کا خوف کرو جو ٹھیک ٹھیک بات اس مسئلہ کے متعلق معلوم ہو بتا دو۔ اس پر لوگوں نے کہا اے امیرالمومنین! ہمیں اس مسئلہ کے متعلق کچھ معلوم نہیں، تب حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ خدا کی قسم مجھے خوب معلوم ہے کہ اس مشکل کا حلال اور اس مسئلہ کا خبیر اس کی پناہ گاہ اور اس کی تہ تک پہنچنے والا کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا، آپ کی مراد علیؑ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ فرمایا، خدا کی قسم وہی ہیں۔ اور کیا کسی شریف زادی نے ان جیسا انسان پیدا کیا ہے؟ آؤ ان کی خدمت میں چلیں۔ لوگوں نے کہا، ان کے پاس چلنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ خود آجائیں گے۔ خلیفہ نے جواب دیا، افسوس ہے تم پر، تم کو نہیں معلوم کہ وہ بنی ہاشم و شجرۂ رسالت کی شاخ سبز ہے۔ اور وہ چشمۂ علم ہے جس کے پاس پیاسا جاتا ہے، وہ نہیں چل کر آتا، انھیں کے گھر میں حکم الٰہی نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ سب کے سب حضرت علیؑ کی خدمت میں

روانہ ہوئے۔ دیکھا کہ آپ ایک باغ میں پانی دے رہے ہیں اور اس آیۂ کریمہ کو بار بار پڑھ کر رو رہے ہیں، ایحسب الانسان ان یترک سدیٰ (کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ ایسا ہی چھوڑ دیا جائے گا)

اس وقت حضرت علیؑ نے شریح قاضی سے کہا، کہ ابوالحسنؑ سے پورا قصہ بیان کرو۔ شریح نے عرض کیا، یا علیؑ! میں دارالقضا (کچہری) میں بیٹھا ہوا تھا کہ یہ شخص آیا، اور اس نے بیان کیا کہ میرے پاس میرے ایک دوست نے سفر کرتے وقت اپنی دو بیویاں سپرد کیں، جن میں سے ایک تو انتہائی عالی خاندان شریف زادی ہے اور دوسری کنیز ہے۔ میرے دوست نے مجھ سے کہا تھا، کہ تم ان کے اخراجات پورے کرتے رہنا، یہاں تک کہ میں سفر سے واپس لوٹوں۔ یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا اور میں ان کی خبر گیری کرنے لگا، شبِ گذشتہ ان دونوں عورتوں نے بچہ جنا، ایک کے ہاں لڑکا ہوا دوسری کے ہاں لڑکی۔ اب دونوں عورتیں زیادہ میراث کی طمع میں لڑکی سے اپنی برائت کرتی ہیں اور لڑکے کی دعوے دار ہیں۔ حضرت نے یہ سن کر قاضی شریح سے فرمایا، پھر تم نے فیصلہ کیا کیا؟ شریح نے جواب دیا کہ اگر میرے پاس علم ہوتا تو میں آپ کے پاس کیوں آتا۔ یہ سن کر حضرت نے زمین پر پڑا ہوا تنکا اٹھایا، اور فرمایا۔ ان القضا

فی ھٰذا الیس من ھٰذا ۔ اس قضیہ کا فیصلہ اس تنکے کے اٹھا لینے سے زیادہ سہل ہے۔ پھر آپ نے ایک پیمانہ منگوایا اور ان میں سے ایک عورت سے کہا، اس پیمانہ کو اپنے دودھ سے بھر دو، پھر آپ نے اس کو تولا، پھر دوسری عورت سے بھی اتنا ہی دودھ لیا، اور اس کو بھی تولا، تو اس کا دودھ پہلی عورت کے دودھ سے وزن میں آدھا نکلا، اس وقت حضرت نے کنیز سے فرمایا، (جس کا دودھ بعد میں لیا تھا) تو اپنی لڑکی اٹھا لے اور پہلی عورت سے کہا، تو اپنا لڑکا اٹھا لے۔ پھر قاضی شریح کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا، کیا تم کو نہیں معلوم کہ لڑکی کا دودھ لڑکے کے دودھ سے آدھا ہوتا ہے۔ اس کی میراث بھی آدھی ہوتی ہے۔ اس کی عقل بھی آدھی ہوتی ہے، اس کی شہادت بھی آدھی ہوتی ہے بلکہ ہر امر میں اس کا حصہ نصف ہی ہوتا ہے۔ اس فیصلہ کو دیکھ کر بڑے متعجب ہوئے اور یہ جملہ اپنی زبان پر جاری کیا۔

"اے ابوالحسنؑ! مجھ کو خدا اس گھڑی زندہ نہ رکھے جب کوئی مشکل آن پڑے اور آپ نہ ہوں، نہ اس شہر میں لے جائے جہاں آپ نہ ہوں"[1]

حضرت علی علیہ السلام کے سلاطین کے ساتھ تعاون کے متعلق

---

[1] کنزالعمال ج ۳ ص ۱۷۹، مصباح الظلام ج ۲ ص ۵۶

علامہ محمد سبطین اعلیٰ اللہ مقامہٗ لکھتے ہیں :-

"حضرت عثمان کی محصوری کے زمانے میں ان پر اہلِ مدینہ نے پانی بند کر دیا، چونکہ شرع محمدی میں یہ امر ناجائز ہے، حضرت علیؑ نے حسنینؑ کے ہمراہ پانی ان کو پہنچوایا، اور اسی واسطے کہا ہے جو کہا ہے اور کہنے والا بھی مروان ہے کہ سب سے زیادہ عثمان سے دشمنوں کو دفع کرنے والے علیؑ ہی تھے" [1]

---

[1] نصائح الکافیہ، خلافتِ الہیہ حصہ سوم ص ۳۹۱ -

دورۂ حکومت حکمرانی

۵ سال

از آغاز حکومت تا شہادت

اسلام کی تاریخ

۱۸ ذی الحجۃ الحرام ۳۵ھ — ۲۰ رمضان المبارک ۴۰ھ

۱۷ جون ۶۵۶ء — ۲۹ جنوری ۶۶۱ء

امید کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے
یہ خاکباز ہیں رکھتے ہیں خاک سے پیوند
خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیلِ جبروتی و جذبہ ہائے بلند

(علامہ اقبالؒ)

نظریۂ حکومت

یا مقصدِ سلطنت!

الآیہ:- الذین ان مکنّٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللّٰہ عاقبۃ الامور (۲۲: ۴۳)

"وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین میں تمکین دیں تو ان کا کام یہ ہوگا کہ نماز کو قائم کریں گے، اور زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے لوگوں کو روکیں گے، امور کا انجام اللہ کے لیے ہے"

نظریہ:- Government of God by the selected representatives of God for the creation of God.

"اللہ کی حکومت اللہ کے چنے ہوئے نمائندوں کے ذریعے سے اللہ کی مخلوقات کے لیے"

بیعت کے بعد جناب امیر علیہ السلام نے اپنی حکومت کا مقصد ان الفاظ میں بیان فرمایا:-

لم تکن بیعتکم ایای فلتۃ ولیس امری وامرکم واحداً انی اریدکم للّٰہ وانتم

تُرِیدُوْنَنِی لِاَنْفُسِکُمْ اَیُّهَا النَّاسُ اَعِیْنُوْنِی عَلٰی اَنْفُسِکُمْ وَایْمُ اللّٰهِ لَاُنْصِفَنَّ الْمَظْلُوْمَ مِنْ ظَالِمِهٖ وَلَاَقُوْدَنَّ الظَّالِمَ بِخِزَامَتِهٖ حَتّٰی اُوْرِدَهٗ مَنْهَلَ الْحَقِّ وَاِنْ کَانَ کَارِهًا" (نہج البلاغہ ۱۳۶)

"میرے ہاتھ پر تمھاری بعیت بے سوچے سمجھے نہ تھی، پھر بھی میرا اور تمھارا معاملہ یکساں نہیں ہے، کیونکہ میں تمھیں خدا کے لیے چاہتا ہوں اور تم مجھے اپنے نفسوں کے لیے چاہتے ہو۔

اے لوگو اپنے نفسوں کے خلاف میری مدد کرو، خدا کی قسم میں ستمگر سے ستم دیدہ کا حق حاصل کرنے کے لیے از روئے عدل و انصاف حکومت کرنا چاہتا ہوں، ظالم کو نکیل پکڑ کر کھینچوں گا، یہاں تک کہ اسے چشمۂ حق پر لے آؤں گا، اگرچہ یہ بات اسے گراں کیوں نہ گزرے۔"

جناب امیر علیہ السلام کسی دنیاوی سیاسی بادشاہ کے جانشین نہیں تھے، بلکہ روحانی تاجدار رسول اکرمؐ کے خلیفہ اور وصی تھے، وہ رسولؐ امین جس کی بعثت کے مقاصد سورۂ جمعہ میں سرکارِ احدیت نے تین بیان کیے ہیں:-

(۱) تزکیہ (۲) تعلیم کتاب، اور (۳) تعلیم حکمت

سرکارِ طاؐ جو مکارمِ اخلاق کا مجموعہ تھے، اتمام مکارمِ اخلاق اور تزکیہ و طہارتِ خلق کے لیے آئے تھے، اس عرش نشین کو فرشِ خاک پر رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا، نبوی اسوۂ حسنہ نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا مکمل ترین پیغام تھا

رسالت و نبوت سعیٔ جہانگیری و طلبِ حکومت دنیوی نہیں ہے۔ اس لیے خلافت نبوی بھی تاج و تخت کے لیے جدال و قتال نہیں، بلکہ اگر ضرورت پڑے، تو اصول و آئینِ اسلام کی حفاظت کے لیے تاج و تخت کو ٹھکرانا اور حکومت سے دست بردار ہو جانا خلافتِ سرکارِ رسالت کا طرۂ امتیاز ہے۔ جناب امیر علیہ السلام کا مقصدِ حکومت انسان کو انسانی اطاعت سے بے نیاز کر کے خالقِ یگانہ و یکتا کی آستانِ احدیت پر جھکانا تھا، پتھر کے بتوں کو ہی نہیں بلکہ حکومت کے دیوتاؤں کو انسانی نظروں سے گرانا تھا، اسی لیے جناب امیرؑ فرما رہے ہیں۔ انی ارید کم للّٰہ میں تمہیں اللہ کے لیے رعایا بنانا چاہتا ہوں اور انسانی غلامی سے آزاد کرنا چاہتا ہوں، میں تمہیں انسانی حکومت کے جوئے کے نیچے لانا نہیں چاہتا۔ بلکہ خدا کے سامنے جھکانا چاہتا ہوں جس کا میں نمائندہ ہوں جس کا میں نقیب ہوں، امیر المومنین تاج و تخت اپنے لیے حاصل نہیں کرنا چاہتے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ خلافتِ ثانیہ کے بعد ہی حاصل کر چکے ہوتے۔ جب ان کی بادشاہت کو انسانی اعمال کی پیروی سے مشروط کیا گیا تو انھوں نے ایسی سلطنت کو جو انسانی حکام کے طریقِ کار پر چلنے کا مطالبہ کر رہی تھی ٹھکرا دیا، تیسری خلافت کے موقع پر وقت ایسا آیا کہ علی مرتضیٰ اس جاہ و جلال والی حکومت کو حاصل کر لیتے جبکہ حضرت عمر نے قبل وفات چھ آدمیوں کی کمیٹی بنا کر سلطنت کو ان میں منحصر کر دیا تھا، مگر حضرت علی مرتضیٰؑ کی اصول کی پابندی اور عظمت تھی کہ وہ کتاب و سنت کے علاوہ کسی کی پیروی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے، انھوں نے سلطنت کو اپنے ہاتھ سے دے دیا، یہ

ایک بڑے نظریہ اور اصول کا سنگِ بنیاد تھا، اور وہ یہ کہ وہ حکام اسلام کی سیرت کو اس حد تک قابلِ قبول مانتے تھے، جس حد تک وہ کتاب و سنت کے مطابق ہو اس کا مطلب یہ تھا کہ شریعت اور حکامِ وقت کی سیرت دو جداگانہ چیزیں ہیں، حکومتِ وقت کا آئین اور اس کا عمل عین شریعت نہیں بلکہ شریعت کو متبوع اور حکومت کے عمل کو اس کا تابع ہونا چاہیے۔

اسلام ایک انقلابی تحریک تھی، اس تحریک کا مقصد تزکیۂ انسانیت، تزکیۂ افکار، تزکیۂ اعمال، انفرادی تزکیہ اور اجتماعی تزکیہ، تزکیۂ معاشرت، تزکیۂ تمدن تزکیۂ سیاست و تزکیۂ معیشت، مادی تزکیہ، روحانی تزکیہ، نفسانی تزکیہ، جسمانی تزکیہ، تزکیۂ افکار و تزکیۂ اذہان، اگر اسلام کی تحریک انقلاب کا مقصد عرب میں ایک ایسی حکومت کا قیام ہوتا جو ہفت اقلیم یعنی ساری دنیا کو فتح کر کے دنیا کے تمام مادی وسائل پر قبضہ کر کے عرب نیشن اور خصوصاً اقتدارِ حکومت کے تعیشات کے لیے وقف کر دے تو یقیناً وہی طلبِ دولت و ہوسِ حکومت تھی۔ جو بغیر تخصیص اکثر حکومتوں اور سلطنتوں میں موجود رہی ہے۔ انسان کے تمدن کی یہ ایک خرابی ہے کہ انسانی حکمرانی کے لیے قتل و خونریزی ہو۔ ایک قوم اپنے مفاد کے لیے دوسری قوم پر یورش کرے، لوٹ کھسوٹ ہو یا ایک قوم کے دائرہ میں دولت و حکومت کی ہوس رکھنے والے افراد میں دھینگا مشتی اور جنگ و جدال ہو، یہ وہ سیاست کی تباہ کاریاں ہیں۔ جو اس تہذیب و تمدن مغربی کے زمانے میں بھی نہایت شدت سے سرگرم عمل رہی ہیں، بیسویں صدی کی دو عالمگیر جنگیں اسی تمدنی خرابی کی پیداوار

ہیں، گذشتہ دو عالمگیر جنگوں کا سبب مقبوضات رکھنے والے اور مقبوضات نہ رکھنے والے ممالک کا جنگ و جدل تھا (Conflict of haves and haves not) ایسی لڑائیوں اور ایسی فتوحات کوئی ایسی چیز ہیں نہیں جس پر مسلمان ناز کرسکیں، دولت و حکومت کے سر پھٹول الیموں سے انسانی تاریخ کے اوراق انسانی خون سے رنگین ہیں اور اخلاق و معاشرتی و تمدنی رفعتیں انسانیت کی اس وحشت و درندگی پر خون کے آنسو بہا رہی ہیں۔ اگر اسلام نے دنیائے انسانیت کو یہی کچھ دیا ہے تو اسلام کے لیے یہ کوئی عظمت و توقیر کی دلیل نہیں۔

اسلامی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ کوئی زبردست کسی زیردست پر دست درازی نہ کر سکے۔ کوئی طاقتور کسی کمزور کا حق تلف نہ کر سکے، دنیا سے جور و جفا ظلم و ستم مٹ جائے، فتنہ و فساد کا قلع و قمع کر دیا جائے۔ اسی لیے جناب امیرؑ اپنے مقصدِ حکومت کو ان الفاظ میں بیان کر رہے ہیں:-

اے لوگو!

"اپنے نفسوں کے خلاف میری مدد کرو، خدا کی قسم میں ستمگر سے ستمدیدہ کا حق حاصل کرنے کے لیے ازروئے عدل و انصاف حکومت کرنا چاہتا ہوں، ظالم کی نکیل پکڑ کر کھینچوں گا، یہاں تک کہ اسے چشمۂ حق پر لے آؤں گا، اگرچہ یہ بات انھیں گراں کیوں نہ گزرے۔"

چنانچہ اسی لیے جناب امیر علیہ السلام نے عنانِ حکومت اپنے دستِ حق پرست میں سنبھالنے کے بعد پہلی تقریر میں عہدِ عثمانی میں بلا استحقاق ملی ہوئی زمینوں کے

کے متعلق فرمایا:۔

"خدا کی قسم! اگر میں یہ دیکھتا کہ ان زمینوں کی آمدنی سے عورتوں کی شادیاں کی گئی ہیں تو بھی بلاشبہ میں انھیں واپس لے لیتا، کیونکہ عدل و انصاف کے معاملہ میں بڑی وسعت ہے، اور جو شخص عدل و انصاف کے معاملے میں دل تنگ ہوتا ہے تو پھر ظلم و جور کا معاملہ تو اسے اور زیادہ دل تنگ بنا دے گا"[1]

حضرت علی مرتضیٰؑ اسلام کے ان اصولوں کو جو تطہیر افکار و تطہیر اعمال کا سرچشمہ تھے فروغ دینا چاہتے تھے۔ اس زمانے کے لوگ حاکم اور عام مسلمانوں میں امتیاز پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن آپ اس غیر اسلامی امتیاز کے مخالف تھے۔

حضرت عمر کے صاحبزادے عبداللہ نے غریب نومسلم ایرانی ہرمزان کو بلا وجہ قتل کر دیا تھا، آپ کو قصاص میں ان کے قتل پر اصرار تھا محض اس لیے کہ فاروق اعظم کے صاحبزادے ہیں اسلامی قانون سے کیسے بچ سکتے ہیں، اسی طرح حضرت عثمان کے قاتلوں کو محض اس لیے کہ انھوں نے خلیفۂ وقت کو قتل کیا ہے بغیر کسی تحقیق شرعی کے مطالبہ کرتے تھے کہ جس جس پر وہ شک کریں انھیں حوالہ کر دیا جائے۔ آپ نے اس سے انکار کیا، آپ کو اس قسم کی جمہوری غیر اسلامی سیاست سے سخت نفرت تھی جس میں سازش، جھوٹ سچ اور جوڑ توڑ سے کام لیا جائے۔ مصر کا ملک کسی کو حین حیات جاگیر میں محض اس لیے دینے پر راضی نہ ہو سکتے تھے کہ وہ میرا ساتھ دے گا[2]

اسی سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۴، جاگیروں کی واپسی۔
[2] تاریخ المعاویہ ص۶۰ مرتبہ گویا جہان آبادی سنی المذہب۔

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ جن لوگوں پر حاکم ہوا ہوں ان کے خلاف میں ظلم کو امداد کے لیے بلاؤں اور طبقاتی نظام قائم کرکے سنّتِ رسول ص کی مخالفت کروں، خدا کی قسم میں یہ کام نہیں کر سکتا، جب تک زمانے کی کمائی چل رہی ہے اور ایک ستارہ دوسرے ستارہ کی طرف کھینچ رہا ہے۔"[1]

اسلام کا اصول یہ نہیں چاہتا کہ حصولِ اقتدار کے لیے ظلم سے امداد حاصل کی جائے دنیاوی سیاست میں ہر جائز و ناجائز طریقہ سے اقتدار حاصل کرنا عین سیاست ہے اس زمانہ میں جو انسانی ترقی کا زمانہ اور دورِ جمہوریت کہلاتا ہے، حصولِ اقتدار کے لیے رشوت، مجرموں کی اعانت وغیرہ حربوں سے کام لیا جاتا ہے، مگر جناب امیر اقتدار کے لیے کوئی ناجائز حربہ استعمال کرنا منافئ اسلام سمجھتے تھے، اور ایسے گورنروں اور حکام کو اپنی سیاسی حمایت کے لیے بحال رکھنا نہیں چاہتے تھے کہ جن کا رویہ سیاست ربانیہ اسلام کے خلاف تھا، وہ اپنے اقتدار کے لیے حکومت کرنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ اصلاحِ عالم اور فلاح و بہبودِ انسانیت کے لیے اللہ کے نقیب و نمائندہ کی حیثیت سے حکومت کرنا چاہتے تھے۔

چنانچہ جناب امیر علیہ السلام کی اس امتیاز کا مغربی مفکروں کو بھی اعتراف ہے۔
Osborn in 'Islam under' the Arab says :-

Ali had been advised by several of his councellers to defer the dismissal of the corrupt governors previously

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۲

appointed untill he himself was sure against all enquiries. The Bayard of Islam, the hero without fear and without reproach refused to the guilty of any duplicity or compromise with injustice. This uncompromising noble attitude cost him his state and life, but such was Ali. he never valued anything above justic and truth.[1]

مشہور مورخ آسبورن لکھتے ہیں :-

"علیؑ کو ان کے کئی ایک مشیروں نے مشورہ دیا کہ وہ ان بددیانت گورنروں کی معزولی کو جن کا تقرر اس سے قبل ہو چکا تھا اتنے عرصہ کے لیے ملتوی کر دیں جب تک وہ اپنے دشمنوں سے دوچار ہیں۔ اسلام کے بایارڈ[1] اس ہیرو اور شجاع نے جو خطرہ سے بے پرواہ اور ملامت کرنے والوں کی ملامت سے بے نیاز تھا، ڈپلومیسی یا غیر عادلانہ سمجھوتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، اگرچہ اس غیر مصلحانہ شریف روش کی قیمت میں حکومت اور

---

1 "Islam under the Arbs"
English translation of Najnhbalaga P20

اور جان سے ہاتھ دھونا تھا، علیؑ ایسے ہی تھے کہ وہ انصاف و صداقت پر کسی چیز کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔"

ایک دوسرے مقام پر یہی کرنل آسبورن بارگاہِ مرتضویؑ میں اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے:-

Mild, beneficient and humane ready to help the weak and distressed. His life was devoted to the cause of Islam. Had he possessed the sternness of Omer's character, he would have been more successful in governing an unruly race like the Arabs. But his forbeareuce and magnanimity were misunderstood and his humamty and love of truth was turned by his enemies to their own advantage.[۱]

---

۱ Short History of the Sarcens by Ameer Ali P: 52.

"علیؑ نرم دل، فیاض اور سراپا انسانیت تھے، کمزوروں اور مظلوموں کی مدد کے لیے ہر وقت آمادہ تھے، ان کی زندگی اسلام کے لیے وقف تھی، اگر ان میں حضرت عمر کی سیرت کا تشدد ہوتا تو وہ عربوں جیسی غیر مہذب قوم پر حکومت کرنے میں کامیاب ہوتے، بلکہ انکی عظمت اور تحمّل کو غلط سمجھا گیا، مگر ان کی انسانیت اور صداقت سے ان کے دشمنوں نے غلط فائدہ اٹھایا۔"

جناب امیر اپنے طریق کار اور امیر شام معاویہ کی روش کا موازنہ فرماتے ہیں:-

"خدا کی قسم معاویہ مجھ سے زیرک تر نہیں ہے، لیکن وہ بے وفا اور خیانت کار اور عاصی اور نافرمان ہے، اور اگر مکرو بے وفائی مذموم نہ ہوتی میں زیرک ترین مردم ہوتا۔ مگر جان لو کہ ہر مکرو بے وفائی گناہ ہے، ہر گناہ نافرمانی ہے اور قیامت کے دن ہر عہدو پیمان شکن کے واسطے پرچم و نشان ہے جس سے وہ پہچانا جائے گا، اور خدا کی قسم میں کسی کے مکر سے غافل نہیں ہوں۔ اور نہ سختی و گرفتاری میں عاجز و ناتواں بن جاتا ہوں۔" [1]

انزلنی الدھر ثم انزلنی
حتیٰ یقال علیٌ و معاویہ

"دنیا نے مجھے اتنا گرایا کہ میرا اور معاویہ کا نام
ایک ساتھ لیا جانے لگا۔" [2]

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ص ۱۹۱

[2] ترجمہ نہج البلاغہ، مترجم رئیس احمد جعفری ص ۵۰۲

زمانے کے انقلابات ہیں کہ آج اس ترقی علم کے زمانے میں بھی اعتراض کرنے والے ایک ایسی شخصیت پر بھی جس کا مقصد حکومت ہی تھا جو بعثت سرکار رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تحریک انقلاب کا مقصد تھا اعتراضات کر رہے ہیں۔ یہ ایسا گروہ ہے جو بنی امیہ کا حامی ہے اور بنی امیہ کے سلاطین کے مقابلہ میں حضرت علی علیہ السلام کو محل طعن قرار دیتا ہے، وہ کہتے ہیں :-

ا۔ کہ مسلمان کفار کے مقابلہ میں صف آرا تھے اور فتوحات پر فتوحات ہو رہی تھیں مگر جوں ہی اقتدار حضرت علیؑ کے دست حق پرست میں آیا انھوں نے کفار کے محاذ سے رخ پھیر کر ان لوگوں کے مقابلہ میں ان کو کھڑا کر دیا جو خود بھی اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے اور جو یہ سمجھتے تھے کہ بجائے حضرت علیؑ کے اقتدار حکومت کے جائز اور صحیح حقدار ہی ہیں۔

ہم اس اعتراض کا جواب مفصل طور پر تو حکومت حضرت علیؑ مرتضیٰ کے واقعات کے ضمن میں دیں گے، یہاں صرف گویا جہان آبادی سنی المذہب کے ایک مختصر نوٹ پر اکتفا کرتے ہیں :-

"مدینہ ہے کہ مسلمانوں کے کسی گروہ یا جماعت یا کسی جماعت کے سرگروہ یا کسی فرد کا کوئی اقدام وعمل، دعویٰ و مطالبہ چاہے حکم خدا و رسولؐ و سنت صحابہ کے خلاف کتنا ہی ہو اس کے مقابلے میں دوسرے مسلمانوں کو آواز اٹھانا یا قدم بڑھانا نہیں چاہیے۔ جو کچھ ہو، ہوتا رہے انسان خاموشی سے دیکھا کریں، حکومت غالب کے مقابلہ میں سر جھکا دینا

ہی ضروری ہے۔ حالانکہ اسلام صرف خدا یا حق ہی کے سامنے سر جھکانا سکھاتا ہے۔ یہ اعتراض حضرت علیؑ پر ہی نہیں ہوتا ہے۔ بعینہٖ اسی قسم کا اعتراض بلکہ اس سے سخت تر حضرت امام حسین علیہ السلام کے اقدام پر ناواقف معترضین کی طرف سے ہوا اور ہوتا رہے گا ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

"اگر چمگادڑ کی آنکھ دن میں نہیں دیکھتی تو اس
چشمۂ آفتاب کا کیا گناہ ہے۔"

۲ - "حضرت علیؑ کے دورِ حکومت کے نقشہ کو دکھا دکھا کر پوچھا جاتا ہے کہ اسلامی دائرۂ اقتدار میں زمین کا کتنا حصہ حضرت علی علیہ السلام نے داخل کیا اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں میں علی علیہ السلام سے ناکام حکمران کوئی نہیں گزرا۔

اگر اسلام کی انقلابی تحریک کا مقصد یہ ہے کہ جذبۂ ملک گیری میں ممالک عالم کو فتح کیا جائے تو سکندرِ اعظم، نپولین، چنگیز خاں، ہلاکو خاں اور ہٹلر کے جذبۂ جہانگیری اور ہوسِ فتوحات میں اور اسلامی تحریکِ انقلاب میں کیا فرق ہے؟

اسلام چنگیزی یا ہٹلری تحریک جہانگیری نہیں تھی بلکہ بنی نوع انسان کے لیے پیامِ امن و سلامتی تھا۔ ان فتوحات کے نتائج بتلاتے ہیں کہ جو کچھ کیا گیا وہ اسلام کی تحریکِ انقلاب کا مقصد نہیں تھا۔ ان فتوحات

کے نتائج پر ذرا غور کیجیے۔ سلطان القلم آغا محمد سلطان مرزا تحریر فرماتے ہیں :-

۱۔ یہ لشکری اسلام کی تبلیغ و ترغیب کا خیال ہی لے کر نہیں نکلے تھے بلکہ اس کی محرک سیاسی ضرورت تھی (اس لیے ان فتوحات سے اسلام کی اس طرح اشاعت نہیں ہوئی جیسی مقصودِ اسلام تھی)

۲۔ یہ لوگ ایسی سرعت کے ساتھ اور ایسے بے وقت عرب سے باہر نکلے کہ ابھی اسلام ان کے دل و دماغ میں سمایا ہی نہ تھا، اور ابھی تک جاہلیت کی عیش و عشرت کی زندگی ان کی آنکھوں کے سامنے تھی۔

۳۔ اس ناپختگی اور بے مائگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ ہندوستان و ایران و یونان کے قدیم فلسفوں اور ثقافتوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور جو تیر وسنان کے فاتح تھے وہ عقل و دماغ کے مفتوح بن گئے اور اس نیچے اوپر کے اختلاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ مسلمانوں نے غیروں سے لیا اور کچھ غیروں نے مسلمانوں سے لیا۔ غیروں نے ان سے ایک تو بہادری اور خود داری لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ؎

کس نیاموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

"کسی شخص نے تیر اندازی کا فن مجھ سے نہیں سیکھا
کہ اس نے آخر کار مجھے ہی نشانہ نہ بنا لیا ہو"

اور دوسرے اپنے مذہب سے بُت پرستی نکال دی۔ یورپ سے تصویر پرستی اور ہندوستان سے صنم پرستی کا اخراج اسلامی وحدانیت کا اثر ہے

اہلِ مدینہ کے سامنے محصور رئیسِ مملکت رگڑا کے ملک عدم ہوتے ہیں اور اہلِ مدینہ ٹس سے مس نہیں ہوتے، ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ آخر یہ کیوں نہیں لڑتے اس لیے کہ اس معرکہ میں مالِ غنیمت کی امید نہیں بلکہ اہلِ سیاست کی ہوسِ جاہ اس واقعہ میں اپنے مستقبل کی کامیابیوں کے خواب دیکھ رہی تھی مگر حضرت علیؑ کا دردمند دل ان کی حفاظت کے لیے بھی کوشاں ہے اور محاصرہ میں انھیں ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے میں بھی ساعی ہے۔ حالانکہ زمانۂ سلطنتِ علیؑ میں اس واقعہ کو سیاسی سٹنٹ بنا کر علیؑ کے خلاف معرکہ آرائی کرنے والے بھی اسی مدینہ میں موجود ہیں۔ عربوں کو جو مالِ غنیمت سے والہانہ محبت تھی اس کی وجہ سے غزوۂ احد میں مسلمان مصیبت میں مبتلا ہوئے اور غنیمت کے شیدائیوں نے پہاڑی درہ کو جو ایک اہم فوجی پوزیشن تھی چھوڑ کر فتح کو شکست سے بدل دیا تھا۔ اور یہی حنین میں ہوا۔ اس میں پہلے مسلمانوں کو فتح ہوئی لیکن جب وہ مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف ہوئے تو دشمن نے انھیں غافل پاکر پھر اچانک حملہ کر دیا۔ اس حملہ سے مسلمان اس طرح پریشان ہوئے کہ بارہ ہزار کے لشکر میں سے صرف چند نفوس ثابت قدم رہ سکے۔ ان دونوں موقعوں پر حیدرِ کرار کی شجاعت و پامردی نے شکست کو پھر فتح سے بدل دیا۔

علامہ شبلی عربوں کے حالات میں لکھتے ہیں :-

"سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مالِ غنیمت کے ساتھ لوگوں کو اس قدر شغف تھا کہ لڑائیوں کا بہت بڑا سبب یہی ہوتا تھا، اس کی اصلاح میں نہایت تدریج سے کام لینا پڑا۔ جاہلیت میں تو غنیمت

اہلِ مدینہ کے سامنے محصور رئیسِ مملکت رگڑ رگڑ کے ہلاک ہوتے ہیں اور اہلِ مدینہ ٹس سے مس نہیں ہوتے، ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ آخر یہ کیوں نہیں لڑتے اس لیے کہ اس معرکہ میں مالِ غنیمت کی امید نہیں بلکہ اہلِ سیاست کی ہوسِ جاہ اس واقعہ میں اپنے مستقبل کی کامیابیوں کے خواب دیکھ رہی تھی مگر حضرت علیؑ کا دردمند دل ان کی حفاظت کے لیے بھی کوشاں ہے اور محاصرہ میں انھیں ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے میں بھی ساعی ہے۔ حالانکہ زمانہ سلطنتِ علیؑ میں اس واقعہ کو سیاسی سٹنٹ بنا کر علیؑ کے خلاف معرکہ آرائی کرنے والے بھی اسی مدینہ میں موجود ہیں عربوں کو جو مالِ غنیمت سے والہانہ محبت تھی اس کی وجہ سے غزوۂ احد میں مسلمان مصیبت میں مبتلا ہوئے اور غنیمت کے شیدائیوں نے پہاڑی درّہ کو جو ایک اہم فوجی پوزیشن تھی چھوڑ کر فتح کو شکست سے بدل دیا تھا۔ اور یہی حنین میں ہوا۔ اس میں پہلے مسلمانوں کو فتح ہوئی لیکن جب وہ مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف ہوئے تو دشمن نے انھیں غافل پاکر پھر اچانک حملہ کر دیا۔ اس حملہ سے مسلمان اس طرح پریشان ہوئے کہ بارہ ہزار کے لشکر میں سے صرف چند نفوس ثابت قدم رہ سکے۔ ان دونوں موقعوں پر حیدرِ کرار کی شجاعت و پامردی نے شکست کو پھر فتح سے بدل دیا۔

علامہ شبلی عربوں کے حالات میں لکھتے ہیں :-

"سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مالِ غنیمت کے ساتھ لوگوں کو اس قدر شغف تھا کہ لڑائیوں کا بہت بڑا سبب یہی ہوتا تھا، اس کی اصلاح میں نہایت تدریج سے کام لینا پڑا۔ جاہلیت میں تو غنیمت

کو محبوب ترین سمجھتے تھے، ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ ایک شخص خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے لیکن کچھ دنیاوی فائدہ بھی چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا اس کو تو کچھ ثواب نہیں ملے گا، یہ امر لوگوں کو بہت عجیب معلوم ہوا اور لوگوں نے اس شخص سے کہا کہ پھر جاکر پوچھو، غالباً تم نے آنحضرت کا مطلب نہیں سمجھا، لوگ اسے بار بار دریافت کرنے کے لیے بھیجتے تھے اور ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا فرمایا ہوگا، بالآخر جب آپ نے تیسری دفعہ بھی فرمایا کہ لا اجر لہ یعنی اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔ تب لوگوں کو یقین آیا۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند صحابہ کو ایک قبیلہ کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ ان میں سے ایک صاحب صف سے آگے نکلے، قبیلے والے روتے ہوئے آئے۔ انھوں نے کہا لا الٰہ الا اللہ کہو تو بچ جاؤ گے، ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور حملے سے بچ گئے۔ اس پر ساتھیوں نے ان پر ملامت کی کہ تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم رکھا۔ ابوداؤد میں اس صحابی کا قول ان الفاظ میں مذکور ہے۔

"فلامنی اصحابی وقالوا حرمتنا الغنیمۃ"

(ابوداؤد جلد ۱ صفحہ ۳۴۵)

یعنی مجھ کو میرے ساتھیوں نے ملامت کی کہ تم نے ہی لوگوں کو غنیمت

سے محروم کر دیا۔"

جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آکر شکایت کی تو آپ نے ان کی (صحابی) کی تحسین کی اور فرمایا کہ تم کو ایک ایک آدمی (جو چھوڑ دیئے گئے) کے بدلہ میں اتنا اتنا ثواب ملے گا۔ (ابوداؤد)

باوجود ان تصریحات اور بار بار کی تاکید کے غزوہ حنین میں جو شکست واقع ہوا تھا اس وجہ سے شکست ہوئی کہ لوگ مال غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ صحیح بخاری میں غزوۂ حنین کے ذکر میں ہے:-

"فاقبل المسلمون الی الغنائم واستقبلونا بالسهام" یعنی مسلمان غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور کافروں نے ہم کو تیروں پر رکھ لیا۔"

ابوداؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ ایک جہم پر گئے اور غایت تنگ حالی اور مصیبت پیش آئی، اتفاق سے بکریوں کا ریوڑ نظر آیا، سب ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ہوئی۔ آپ موقعہ پر تشریف لائے تو گوشت پک رہا تھا اور ہانڈیاں ابالی جا رہی تھیں۔ آپ کے ہاتھ میں کمان تھی، آپ نے اس سے ہانڈیاں الٹ دیں اور سارا گوشت خاک میں مل گیا، پھر فرمایا، لوٹ کا مال مردار گوشت کے برابر ہے[1]

جناب رسول خدا نے خالد بن ولید کو جزیمہ کی طرف محض تبلیغ اسلام

---

[1] سیرت النبی جلد اول حصہ اول تقطیع کلاں ص۴۲۴ تا ص۴۲۶

کے لیے بھیجا اور خاص طور سے ہدایت کر دی کہ لڑنا نہیں۔ بنو جذیمہ مسلمان ہو گئے کلمہ پڑھنے لگے، لیکن مالِ غنیمت کے لالچ میں حضرت خالد نے ان کو قتل کرا دیا، اور مالِ غنیمت لوٹ لیا۔ جب وہ واپس آئے تو جناب رسولِ خداؐ ان پر بہت ناراض ہوئے۔ تین دفعہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا کہ اے خدا خالد نے جو کچھ کیا میں اس سے بری ہوں [1]

وہ لوگ جو ادعا کرتے ہیں کہ اسلام نے یکلخت عرب کی ساری فطرت بدل کر ایسا بنا دیا کہ ان میں سے ہر ایک آسمانِ ہدایت کا ستارہ بن گیا، ان عبارتوں کو غور سے پڑھیں۔ غزوۂ حنین آنحضرتؐ کا آخری غزوہ تھا۔ جنگ اُحد میں بھی تجربہ ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی غنیمت کی محبت انکے دل سے نہ گئی [2]۔ سرکارِ رسالت تطہیر و تزکیۂ تمدن کے لیے ان امور کی اصلاح چاہتے تھے مگر حضورؐ کے بعد فتوحات کا سلسلہ اسی جرنیل خالد بن ولید کی قیادت میں شروع ہوا جن کے شغف کا حال آپ مطالعہ کر چکے ہیں۔ اب صدرِ اسلام کی فتوحات سے اس جذبۂ غنیمت کا جس قدر نشو و ارتقا ہوا وہ عاقل و بصیر سے پوشیدہ نہیں۔

حضرت علیؑ پر فتوحات کے متعلق تنقید کرنے والے ان کی ابتدائی زندگی کو بھلا کر تنقید کرتے ہیں۔ اگر حیدرِ کرار زمانۂ رسالت کی دفاعی جنگوں میں کفار پر غلبہ حاصل نہ کرتے تو پھر دیکھتے کہ فاتحینِ روم و ایران ان ممالک پر

---

[1] تاریخ طبری الجزء الثالث ص ۱۲۴ سیرۃ النبی شبلی حصہ اول جلد اول ص ۴۳۸

[2] مسلمانوں کے مذہب پر مختلف غیر اسلامی ثقافتوں کے اثرات ص ۸۵

کس طرح غلبہ پا سکتے تھے، اس پر گویا جہان آبادی لکھتے ہیں:۔

"یقیناً حافظے کمزور بھی ہوتے ہیں، لیکن کیا اتنے کمزور کہ ہر دوسرے قدم کو اٹھانے کے بعد دماغ سے یہ بات نکل جائے کہ دوسرا قدم اٹھ ہی نہیں سکتا، اگر پہلا نہ اٹھتا۔ یہ فطرت کی انتہائی دنائت اور گندگی ہے کہ جس نے سارے جسم سے کانٹوں کو نکالا اس کے احسانوں کا صرف اس لیے انکار کر دیا جائے کہ آنکھ جب کھلی تھی تو ہمارے سامنے صرف وہی تھا جس نے آخر میں آنکھ کے کانٹوں کو کھینچ لیا تھا۔" [1]

مسلمانوں کی آنکھوں پر مادی سیاست کے چشمے لگے ہوئے ہیں، جو وہ اسلام کی انقلابی تحریک کا مقصد صرف یہ سمجھتے ہیں کہ ممالک فتح کر کے حکومت کو ٹیکس دینے والوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ بنی امیہ کے سلیم تاجدار عمر بن عبدالعزیز کا حکیمانہ قول ہے:۔

"محمد رسول اللہ کو اللہ نے دین کا داعی بنا کر بھیجا تھا نہ کہ جابی (یعنی ٹیکسوں کے وصول کرنے والا) خدا نے ان کو وہ رسول نہ بنایا تھا، جو سب سے زیادہ آدمیوں سے ٹیکس وصول کرنے میں کامیاب ہو۔" [2]

ذرا اس مادی سیاست سے متاثر ذہنیت کو دیکھیے، ان لوگوں کے نزدیک اسلامی نقطۂ نظر سے بھی وہی سب سے بڑا کامیاب ہے جو بہت ٹیکس

---

[1] تاریخ المعادیہ ص ۵۸ [2] تاریخ المعادیہ ص ۵۹

وصول کرسکا اور جو ٹیکس ادا کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ نہ کرسکا وہی اسلام کا سب سے بڑا ناکام آدمی ہے۔ اگر اسلام کی سب سے بڑی کامیابی اور اسکی عظمت کی یہی دلیل ہے اور اس کی صداقت کا ثبوت ہے تو ایسی سلطنتیں بھی دنیا میں موجود رہی ہیں جن کے ٹیکس ادا کرنے والوں پر کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان سے بڑھ کر کامیاب، باعظمت اور صداقت کی علمبردار کہلانے کی مستحق ہیں۔

اموی زمانے میں ٹیکس وصول کرنے کا یہ جذبہ یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ ایک دو دفعہ نہیں متعدد مواقع ایسے پیش آئے ہیں کہ جزیہ کی آمدنی لوگوں کے مسلمان ہونے کی وجہ سے گھٹنے لگی تو اموی حکمرانوں نے اسلام میں لوگوں کو داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی (تاریخ المعاویہ ص۶۲ حاشیہ)

ان ملکی فتوحات کا ایک دیرپا ردِ عمل ہے کہ تیرہ صدیاں گزر جانے کے باوجود اقوام عالم مسلمانوں سے متنفر ہیں اور ان کی نفرت میں کمی نہیں آئی۔ رسمی رواداری اور چیز ہے مگر اس وقت بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوششیں جاری ہیں اور مغربی ڈپلومیسی انھیں چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرکے اور ان حصوں کو آپس میں لڑا کر کمزور کر رہی ہے اور اپنے سرمایہ اور عیاری سے نئے نئے مذاہب وفرق کو جنم دے کر مسلمانوں میں تشتت وافتراق کا بیج بو رہی ہیں اور انھیں ایک مرکز پر جمع ہونے نہیں دیتیں۔ سیاسی غلط فہمیوں میں مبتلا جو مسلمان امویوں کی فتوحات کے شادیانے بجا رہے ہیں۔ ان پر ہم مفصل بحث تو اپنی تاریخ کی چوتھی جلد میں کریں گے مگر فی الحال ہم بعض اشارات

پر اکتفا کرتے ہیں۔

امویوں نے سپین کو فتح کیا، یہ فتوحات مادی وسائل اور عسکری قوت سے ہوئیں۔ جہاں بھی اسلام کی نشر و اشاعت یا توسیع مملکت ہوئی اس میں روحانیت نام کو بھی نہیں تھی، صرف اموی تشوون قاہرہ کی تخلیق تھی، اس کا جو حشر ہوا وہی لوگ جانتے ہیں جنھوں نے ہسپانیہ کی سیاحت کی ہے۔ ان کے سنگین قصور اور ان کی شاہی عمارتوں کے کھنڈرات پر کائی جمی ہوئی دیکھی ہے قرطبہ کے کھنڈرات ان کے انجام کار کی ترجمانی کر رہے ہیں، ان کے شاہی مقبروں میں کوئی فاتحہ خوانی کرنے والا بھی نظر نہیں آتا۔

امویوں نے افریقہ کو فتح کیا۔ آج افریقہ میں مسلمانوں کی نہیں بلکہ عیسائیوں کی اکثریت ہے۔ اس کی وجہ غلامی کا غلط استعمال تھا۔ اگر افریقہ میں مسلمانوں نے اس غلامی کو جسے اسلام بلطائف الحیل ختم کرنا چاہتا تھا غلط استعمال نہ کیا ہوتا اور فروغ نہ دیا ہوتا تو آج سارے براعظم افریقہ کا مذہب اسلام ہوتا، کرنل آسبورن کے الفاظ میں معاویہ پہلے مسلمان بادشاہ تھے جنھوں نے اسلام میں غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت کو رواج دیا۔

اموی قبیلائی عصبیت:-

ان اموی فاتحین میں قبائلی عصبیت اس قدر تھی کہ اس نے انھیں اس بلندی پر نہ پہنچنے دیا، جس کی یہ تمنا رکھتے تھے۔ چنانچہ مغرب کا مشہور مورخ کرنل آسبورن لکھتا ہے:-

The other is the tribal spirit of the Arabs, Conquerors of Asia, of northern Africa of Spain, the Arabs never rose to the level of their position. Greatness had been thrust upon them, but in the midst of their grandeur they retained in all their previous force and intensity, the passions, the rivalries, the petty jealousies of the desert. They merely fought again on a wider field, the battle of the Arabs before Islam.[1]

دوسری اہم بات عربوں کی قبائلی سپرٹ تھی۔ ایشیا، شمالی افریقہ اور سپین کے فاتح عرب اپنی پوزیشن کی بلند سطح پر کبھی نہ پہنچ سکے۔ عظمت اُن پر زبردستی ڈالی لیکن وہ عین عنفوانِ عظمت میں وہ اپنی پہلی سی طاقت، ہنگامہ آرائی، نفسانی جذبات، رقابتوں اور صحرا کی ناپسندیدہ حاسدانہ روشوں پر چل پڑے اور وہ

---

[1] Islam under the Arabs – Short History of Saracen P: 72.

ایک ایک وسیع میدانِ جنگ و جدل میں ایسی لڑائیوں میں معروف ہو گئے۔
جیسی عرب اسلام سے پہلے لڑا کرتے تھے۔ ان اموی فتوحات کے مقابلے
میں جہاں اسلام کی نشرو اشاعت بہ روحانی وسائل نے اپنا سایہ ڈالا وہ آج
بھی اسلامی اکثریت سے مالا مال ہیں اور اسلامی علوم کی نشرواشاعت کے مراکز
ہیں۔ ایران جس نے اسلامی علوم کے ہر شعبہ میں عربوں سے بڑھ کر خدام دین پیدا
کیے، عراق جو زمانۂ قیام کوفہ میں باب مدینۃ العلم کے علمی و عملی فیوضات سے بہرور
ہوا، شام جیسے المیۂ کربلا نے اسلام کے روحانی مناظر سے آشنا کیا۔ مصر جو اسلامی
علوم کا مرکز رہا ان ممالک کی مساعی جمیلہ سے یورپ نے علمی فیضان حاصل کیے
اور آج بھی ان کی جدوجہد سے اسلام کا مستقبل شاندار نظر آ رہا ہے۔

اسلام کا شاندار مستقبل

ایک مشہور و معروف امریکن سکالر لوتھروپ سٹوڈرڈ Lothrop Stoddard
اپنی شہرۂ آفاق تالیف "رنگ کی متصادم لہریں" (Clashing
Tides of Clour) میں لکھتے ہیں:۔

Broadly speaking, the near
East possesses a fundanental unity
that of Islam. The native christianity
and Jewish minorities are local
survivals from the long past times

now Islam is more than a creed;
it is ta culture and a way of life.
However radically it may be
modified by westernism, Islam
will remain the basis upon which
new development will repose.
Also Islam is not ossified or
decadent as many westerners
asoune. It is very much alive
and it has long been in geruin
evolution. The Islamic world
touched its lowest depths on
decripitude two centuries ago.
Thereafter began the movemant
known as "Muhammedan Rivival
— a spirtual leaven which has
never ceased to work and which
continues to produce important
effects. The revival be it noted

was not due to western impacts; it sprang from Islams' own vitality.[۱]

ہم فراخدلی سے کہہ سکتے ہیں کہ مشرق قریب ایک بنیادی وحدت کا حامل ہے اور وہ اسلام ہے۔ مقامی عیسوی اور یہودی اقلیتوں کا احیا سین ماخیر سے مقامی طور پر ہے۔ اب اسلام مذہبی فرقے سے بڑھ کر ایک تہذیب و ثقافت اور زندگی کا لائحہ عمل ہے، مغربیت اسلام کی جس قدر چاہے تضحیک کرے۔ اسلام ہی نشو و ارتقاء جدید کی اساس و بنیاد بنے گا۔ نیز اسلام جیسا کہ مغرب کے لوگ خیال کرتے ہیں، مردہ اور مرجھایا ہوا نہیں ہے، وہ بہت زندہ ہے اور سلیم نشو و ارتقا کی منزل طے کر رہا ہے۔ گذشتہ دو صدیوں میں مسلمانوں کا زوال انتہائی پستی تک پہنچ چکا تھا، اس کے بعد وہ تحریک ظہور پذیر ہوئی جو مسلم نشاۃ ثانیہ کہلاتی ہے۔ وہ ایک روحانی خمیر ہے جو سرگرم عمل رہنے سے رکتا نہیں اور جو برابر ضروری اور اہم اثرات پیدا کر رہا ہے۔ اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ نشو و ارتقاء مغربی ربط کا اثر نہیں بلکہ اسلام کی اپنی قابلیت صلاحیت سے پھوٹ پڑا ہے۔

توازامید گل و لالہ ناامید مشو
کہ شاخ زندگی ما ہنوز نمناک است

اس اسلامی صلاحیت اور قابلیت کو زندہ رکھتے ہیں آل محمد علیہم السلام

---

[۱] Islam and Socialism.

نے کتنا کام کیا ہے، یہ ایک مستقل مضمون ہے اور خصوصاً حضرت علی مرتضےٰ علیہ السلام نے کہ جنھیں آج بعض اموریت زدہ مسلمان ناکام تاجدار کہتے ہیں مسلمانوں میں زندگی قائم رکھنے کے لیے کس قدر آثار باقی چھوڑے ہیں۔

سرکارِ رسالت محمد مصطفےٰؐ کے بعد جن تاجداروں کو کامیاب تاجدار کہا جاتا ہے ان کی کامیابی کا راز اس میں مضمر ہے کہ سرکارِ رسالت محمد مصطفےٰؐ اور سرکارِ ولایت علی مرتضیٰ علیہ السلام کی سلیم سیاست سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور اس کے بعد کے تاجداروں سے جو سیاسی امور وجود میں آئے ان کی اصلاح میں علی علیہ السلام کو جد وجہد کرنا پڑی۔ چنانچہ مصر کے مشہور عیسائی مورخ جرجی زیدان نے لکھا ہے:-

"اگر حضرت عمر کے زمانے میں جب لوگوں کے دلوں میں نبوت کی دہشت اور رسالت کی ہیبت قائم تھی اور سچا تدین باقی تھا حضرت علیؑ ہی خلیفہ اور مسلمانوں کے حاکم مقرر ہوتے تو آپ کی حکومت اور سیاست کہیں بہتر اور اعلیٰ ثابت ہوتی اور آپ کے کاموں میں ذرہ برابر بھی ضعف ظاہر نہ ہوتا، لیکن افسوس کہ آپ کے پاس خلافت اس وقت آئی جب لوگوں کی نیتیں فاسد ہو گئی تھیں اور انتظامات ملکی اور اصولِ حکومت سے متعلق آپ کے والیوں اور ماتحتوں کے دلوں میں حرص وطمع پیدا ہو گئی تھی۔" (تاریخ الامۃ صفحہ ۲۴۴)

حضرت عمر کی سیاست

اس حقیقت کو الاستاذ الشیخ عبداللہ العلائلی نے ان الفاظ میں بیان کیا

"نفس بزرگ عمر کو سوائے مملکت و سلطنت بڑھانے کے اور کوئی فکر نہ تھی، انھوں نے ملتِ عرب کو صرف جنگ و پیکار کے لیے آمادہ کیا ان میں سلطنت کو باقی رکھنے کی صلاحیت پیدا نہیں کی کہ وہ قانونِ جدید اسلامی کو حدودِ مملکت میں رواج دیتے، اگرچہ عربوں کے قبضہ میں بہت بڑی سلطنت آئی لیکن اس کی بنیاد مستحکم نہ تھی، بہت جلد زوال و اضمحلال آگیا۔ ان عربوں میں جلد ہی تعصب، قبائلی عصبیت، عربوں کو عجمیوں سے بہتر و برتر سمجھنا عصبیتِ شعوبی (شعوبی وہ لوگ تھے جو عجمیوں کو عربوں سے پست نہیں سمجھتے تھے، بلکہ برتری دیتے تھے) کا دور دورہ ہو گیا جس سے دولتِ اسلامی کو تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اس کی ترقی و عروج کا خاتمہ ہو گیا، اس امر کا بہترین ثبوت کہ عربوں کی دینی اور مذہبی تربیت پختہ نہ تھی یہ ہے کہ عرب اپنے آپ کو تمام قوموں اور نسلوں سے افضل و برتر سمجھتے تھے، یہاں تک کہ اپنے آپ کو تمام لوگوں پر پیدائشی حاکم ارسطو قراطی (Aristocrat) سمجھتے تھے۔ حالانکہ اسلام پست و بلند اور طبقات کو جانتا ہی نہیں۔ اور نہ یہ اس کی تعلیمات ہیں، بلکہ سب کو ایک ہی ماں باپ کی اولاد سمجھتا ہے یہ قبائل و خاندان اسلام کے نزدیک صرف اس لیے ہیں کہ آپس میں پہچانے جائیں اور اخلاق و آداب میں ایک دوسرے کے شریک و مددگار رہیں، یہیں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرب کا دوسرے

قبیلے کے برادر عرب یا دوسرے غیر عرب اسلامی بھائی سے عصبیت کا مظاہرہ کرنا یہ شعوبی تحریک کو کامیاب بنانے میں معین ہوا۔ بالآخر اس قبائلی و شعوبی عصبیت نے اسلامی شیرازہ کو درہم برہم کر دیا۔" [۱]

انتہا یہ ہے کہ اس عصبیت کو مذہبی رنگ دے کر غیر عرب عجمیوں کو میراث سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔ امام مالک جو اہل سنت کے ائمہ اربعہ میں سے خالص عربی النسل تھے وہ لکھتے ہیں :۔

"راویان ثقہ سے روایت ہے کہ سعید بن مسیب یہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر ابن خطاب اس کے مخالف تھے کہ کوئی عجمی میراث پائے سوا اس کے کہ وہ عرب میں پیدا ہوا ہو (گویا خلیفۂ ثانی کے نزدیک عربی المولد ہونے کی وجہ سے کوئی شخص میراث پانے کا مستحق ہوگا) اس بنا پر امام مالک کا یہ فتویٰ ہے کہ اگر کوئی عورت دشمن کی زمین سے حاملہ آئے اور سرزمین عرب میں بچہ جنے تو یہ بچہ اس کی اولاد ہوگا، اور یہ ماں اور بیٹا آپس میں ایک دوسرے کی میراث پائیں گے (مطلب یہ کہ اگر عرب میں ولادت نہ ہو تو میراث سے محروم)" [۲]

اس عصبیت کے علاوہ ایک اور مشکل تھی جس سے حضرت علی علیہ السلام کو اپنے دوران حکومت میں دوچار ہونا پڑا وہ مشکل تقسیم اموال سے متعلق ہے چنانچہ الاستاذ الشیخ علامہ عبد اللہ العلائلی لکھتے ہیں :۔

"خلیفہ عمر کے طریق تقسیم اموال میں حضرت علیؑ کو اختلاف تھا

---

[۱] تاریخ الحسنین
[۲] الموطا امام مالک جلد دوم ص ۱۲

حضرت عمر کا یہ خیال تھا (جس پر موصوف نے عمل بھی کیا) کہ وہ مسلمان جو (حالتِ کفر میں) پیغمبرؐ سے جنگ کر چکے ہیں ان کو تقسیم اموال میں وہ حصہ نہ ملنا چاہیے جو رسول اللہؐ کے ہمراہ شریکِ جہاد رہنے والوں کو ملے - اس لیے حضرت خلیفۂ ثانی نے اصحاب میں امتیاز پیدا کیا، مجاہدین بدر کو مجاہدین عراق و شام پر فضیلت دی۔ اس صورت سے مسلمانوں میں طبقات و مراتب رونما ہوئے۔ ایک گروہ کو بہت زیادہ ملتا تھا، دوسرے کو اس سے کم اور عامۂ ناس کو بہت کم۔ تقسیمِ اموال کا یہ طریقہ مسلمانوں میں بہت بڑے امتیاز پیدا کرنے کا سبب ہوا۔ اور عرب معاشرہ طبقات میں تقسیم ہو گیا۔ اگرچہ قانونِ شریعت کی رو سے سب برابر تھے اور طبقات و امتیازات کا اسلامی نظام میں وجود نہ تھا، لیکن اس طریقِ کار نے عربوں کو ارسطو قراطی (Aristocratic Caste) پیدائشی حاکم، اشراف طبقہ متوسط اور عامہ میں تقسیم کر دیا۔[1] ظاہر ہے کہ یہ تقسیم محنت کش عوام کو سخت ناگوار تھی، اس طرح کے معاشرہ سے کچھ لوگ خداوندِ قوم ہو جاتے ہیں، کچھ ان کے غلام اور بندے۔"

ابوالقاسم علی بن احمد العلوی الکوفی متوفی ۳۵۲ھ اپنی کتاب الاستغاثہ میں لکھتے ہیں:-

"حضرت عمر نے ترویج میں بھی امتیاز قائم کیا، قریش کو تو اس کا

---

[1] تاریخ الحسین نقد و تحلیل ص ۱۴۶، ۱۹۷۴ء طبع بیروت

حق تھا کہ عرب و عجم جس سے چاہے تزویج کرے، لیکن غیر قریشی عرب قبیلۂ قریش میں تزویج نہیں کر سکتا تھا، اس کے علاوہ عرب جہاں چاہے تزویج کرے مگر عجمیوں کو عربوں سے تزویج کرنے کی اجازت نہ تھی۔" [۱]

علی علیہ السلام اس روش اور پالیسی کے بالکل خلاف تھے؛ چنانچہ جب آپ سے پوچھا گیا، "ایجوز تزویج الموالی بالعربیات" کیا غیر عرب (موالی) کے ساتھ عرب عورت کا نکاح ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا، کیوں نہیں ہو سکتا؟ اسلام ان کو زندگی و حیات کے حقوق تو دے اور معاشرت و ازدواج کے حقوق نہ بخشے، اس ذہنیت کے جو نتائج برآمد ہوئے ان کا آپ مندرجہ ذیل واقعات سے اندازہ کر سکتے ہیں:-

۱۔ ایک موالی نے اعراب بنی سلیم کی لڑکی سے نکاح کیا، تو حاکم وقت نے زن و شوہر میں جدائی کرا دی تھی اور اس بیچارہ کو سو دُرّے مارے گئے اور سر، داڑھی اور دونوں بھوؤں کے بالوں کو مونڈ دیا گیا۔ [۲]

۲۔ حجاج نے بیچارے نبطیوں کے ساتھ یہ کیا تھا کہ ان کے ہاتھوں میں نشتر سے ذلت کے گودنے اور نشانات لگوا دیئے تھے۔ [۳]

۳۔ حجاج جب واسط گیا تو نبطیوں کو خارج البلد کرا دیا تھا، اور بصرہ کے ماتحت حاکم کو لکھا کہ ان لوگوں کو تم بھی شہر بدر کر دو۔ حاکم نے تعمیل حکم کے

---

[۱] الاستغاثہ ص۲۶ طبع عراق [۲] آغانی جلد ۱۴ ص ۱۳۳

[۳] شرح ابن ابی الحدید جلد ۲ ص ۱۳۳

بعد یہ لکھا کہ میں نے سوائے ان نبطیوں کے جو قاریٔ قرآن یا دین میں تفقہ رکھتے تھے سب کو نکال باہر کیا۔ اس پہ حجاج نے حاکم کو لکھا کہ جب میرا یہ حکم تجھے ملے تو طبیب کو بلا کر اپنے جسم کی رگوں کا معائنہ کراؤ اگر کسی میں نبطی رگ ہو تو کٹوا دو۔[1]

۴ - حجاج کا حکم تھا کہ کوفہ میں سوائے عربی النسل کے کوئی موالی غیر عرب نماز جماعت نہ پڑھائے۔[2]

۵ - کوئی موالی قاضی نہیں ہو سکتا تھا، حالت یہ تھی کہ اگر کوئی عربی بازار سے سامان لا رہا ہے یا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور رہ میں کوئی غیر عرب موالی مل گیا تو یہ سامان اور بوجھ اس پہ لاد دیا، وہ اس مفت کی بیگار سے انکار نہیں کر سکتا تھا، اور نہ کوئی شنوائی تھی اسی طرح اگر کوئی غیر عرب موالی سوار ہے تو عرب جو پیدل ہوتا اپنی توہین سمجھتا، اور اس بیچارے کو اتار دیتا۔[3]

عباسی خلیفہ مامون الرشید کا یہ بیان ہے کہ:-

"حضرت عمر کا یہ قول تھا کہ اگر کسی عرب کے ہمسائے میں کوئی نبطی رہتا ہو تو یہ عرب ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے اس آزاد نبطی کو بیچ کر اپنی حاجت کو پورا کر سکتا ہے۔[4]

---

[1] محاضرات الادبار جلد ۱ صفحہ ۲۱۸ [2] عقد الفرید جلد اول صفحہ ۲۰۷

[3] محاضرات الادبار جلد ۱ صفحہ ۲۲۰

[4] عیون الاخبار ابن قتیبہ بحوالہ منہاج نہج البلاغہ صفحہ ۱۷

ایک دفعہ بیت المقدس میں عبادہ بن صامت صحابی نے ایک نبطی سے کہا کہ ان کی سواری کو وہ پکڑے رہے۔ اس نے انکار کیا۔ اس پر انھوں نے اس کو اتنا مارا کہ اس بیچارے کا سر پھٹ گیا، حضرت عمر ابن خطاب اس زمانے میں خود بہ نفس نفیس وہیں موجود تھے، اس نے خلیفہ کی خدمت میں فریاد کی حضرت زید بن ثابت انصاری نے کہا، "اتقید عبدك من اخیك" کیا آپ غلام کا قصاص اپنے بھائی سے لیں گے۔ یہ سنکر خلیفہ نے عبادہ بن صامت سے قصاص نہیں لیا[1]

یونہی ایک مسلمان نے ایک ذمی کو اتنا مارا کہ اس کا سر شگافتہ ہو گیا۔ خلیفہ دوم حضرت عمر کے سامنے اس کا مقدمہ آیا، تو حضرت معاذ بن جبل نے فتویٰ دیا کہ ایسے مسلمان سے جس نے کسی ذمی کو زخمی کیا ہو قصاص لینا ناجائز ہے وہ مسلمان بغیر سزا کے چھوڑ دیا گیا[2]

اسی طرح ایک ذمی کو کسی مسلمان نے بے خطا مار ڈالا، حضرت خلیفہ دوم نے بغیر قصاص کے قاتل کو چھوڑ دیا، اس مرتبہ بھی حضرت زید بن ثابت نے یہی دلیل خلیفہ کے سامنے پیش کی تھی۔ "اتقید عبدك من اخیك" "غلام کا قصاص اپنے بھائی سے کیونکر لوگے"[3]

ایسا ہی ایک واقعہ شام میں پیش آیا، کہ ایک ذمی کو ایک مسلمان نے ناحق قتل کر دیا، حضرت خلیفہ دوم تک اس کا مقدمہ آیا، حضرت ابو عبیدہ

---

[1] سنن الکبریٰ للبیہقی جلد ۸ صہ ۳۲، کنز العمال جلد ۷ صہ ۳۰۳ بحوالہ جمع الجوامع سیوطی
[2] کنز العمال جلد ۷ صہ ۳۰۴ [3] کنز العمال جلد ۷ صہ ۳۰۴

نے خلیفہ سے کہا :-

"ما ایت لو قتل عبداً له کنت قاتلہ به"

"کیا یہ مسلمان اگر اپنے غلام کو قتل کر ڈالتا تو کیا تم اس کے عوض اس کو قتل کرتے ؟"

یہ سنکر حضرت عمر نے قاتل کو بغیر قصاص کے چھوڑ دیا۔[1]

سیاستِ علویہ

حضرت علیؑ کو اس ذہنیت سے مقابلہ درپیش تھا اور یہی اصل سبب تھا جسکی بنا پر اشرافِ عرب اور قریش علیؑ کی حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے، اور انھیں ناکام حکمران ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے عصر حاضر کا متعصب ترین مورخ لکھتا ہے :-

"علیؑ ابن ابی طالب شریف کو غیر شریف پر اور عربی کو عجمی پر فوقیت نہیں دیتے تھے - اور نہ رؤسا اور امراءِ قبائل سے چاپلوسی کرتے تھے، عربوں کا حضرت سے کنارہ کش ہو کر بیٹھ جانے کا اصل سبب یہی ہے"۔[2]

ابو اسحٰق مدائنی کی روایت ہے کہ دو عورتیں حضرت علیؑ کی خدمت میں اپنا حق لینے کے لیے آئیں، جن میں سے ایک عورت عرب تھی اور

[1] سنن الکبیری للبیہقی جلد ۸ صـ ۳۲، کنز العمال جلد ۷ صـ ۳۰۳
[2] ضحی الاسلام احمد امین جلد اول صـ ۲۳ طبع مصر - ابن ابی الحدید جلد اول صـ ۱۸۰ طبع مصر

اور دوسری موالی غیر عرب حضرت نے ان دونوں کو مساوی طریقہ سے دراہم بھی دیئے اور طعام بھی دیا۔ یہ دیکھ کر زن عربیہ کہنے لگی میں عرب ہوں، یہ عجمی غیر عرب، آپ نے دونوں کو برابر کر دیا۔ اس پر حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا، اس مال میں میرے نزدیک اولاد اسمٰعیل کو بنی اسحٰق پر فضل و شرف نہیں ہے۔ سب یکساں برابر پائیں گے۔[۱]

مورخ مدائنی روایت کرتا ہے:-

"بعض اصحاب نے حاضر ہو کر حضرت کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ آپ اموال کو تقسیم کرتے وقت اشرافِ عرب و قریش کو بہ مصلحت موالی و عجموں پر فضیلت دیا کریں اور انھیں زیادہ عطا فرمائیں۔ اور اس طرح ان لوگوں کی دلجوئی فرمائیں تاکہ یہ خطرہ دور ہو جائے کہ یہ لوگ آپ کے خلاف ہو کر معاویہ سے نہ مل جائیں۔ لوگوں نے یہ مشورہ اس لیے دیا تھا کہ معاویہ تقسیم میں مساوات نہیں کرتا تھا، جس کو جو چاہتا تھا، دیا کرتا تھا، یہ سنکر حضرت نے ارشاد فرمایا، کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ میں ظلم و جور سے کامیابی حاصل کروں۔ خدا کی قسم جب تک ستارے آسمان پر چمکتے ہیں میں کبھی ایسا نہ کروں گا۔ بخدا اگر یہ میرا ذاتی مال ہوتا، اسوقت بھی میں مساوات برتتا، نہ کہ یہ خود انھی لوگوں کا مال ہے"۔[۲]

۱؎ ابن ابی الحدید جلد اول ص۱۸۱ طبع مصر۔

۲؎ ابن ابی الحدید جلد اول ص۱۸۲ طبع مصر۔

حضرت قریش کو غیر قریش پر، عرب کو عجم پر حتیٰ کہ اپنے عزیزوں کو بھی کسی طریقہ پر ترجیح دینے کو تیار نہیں تھے، آپ طبقات و امتیازات اور غیر اسلامی نظام سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لیے رسول اللہ ص کی مساوی تعلیم پر عامل تھے۔

علوی مشکلات

دورِ حاضر کے دو ممتاز مورخ پروفیسر سید عبدالقادر ایم۔اے اور پروفیسر محمد شجاع الدین ایم۔اے حضرت علی علیہ السلام کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا، اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

۱۔ مسلمانوں میں یکجہتی نہیں رہی تھی، ان کے اتحاد کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔
۲۔ وہ قومی مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کرنے کے خوگر ہو گئے تھے۔
۳۔ اسلامی مملکت کی توسیع نے متمدن دنیا کی دو بڑی سلطنتوں کی دولت کو ان کے قدموں میں لا کر ڈال دیا تھا۔ اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے اسلام کے زریں اصولوں کو بھی پس پشت ڈالنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔
۴۔ مسلمانوں میں انتشار اور پراگندگی کے آثار دیکھے تو بڑے بڑے صحابیوں کے پائے ثبات ڈگمگا گئے اور وہ مسندِ خلافت کے خواب دیکھنے لگے۔
۵۔ ابتداء میں طلحہ اور زبیر نے حضرت علیؑ کی خلافت کو تسلیم کر لیا تھا لیکن بعد میں وہ بیعت سے پھر گئے۔
۶۔ ان کے بعد حضرت معاویہ کی باری آئی، وہ شروع سے حضرت علیؑ

کی بہیم دعوت کے باوجود ان کی بیعت کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ پہلے قاتلین عثمان کو کیفر کردار کو پہنچاؤ، اس کے بعد ہم آپ سے تعاون کریں گے، لیکن درحقیقت ان کی نیت صاف نہیں تھی، وہ حضرت علیؓ کو پہلے سے زیادہ مشکلات میں مبتلا کرنا چاہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ حضرت علیؓ ہاتھ دھو کر قاتلین عثمان کے پیچھے پڑ گئے تو اس سے سلطنت اسلامیہ میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ جس سے ان مدعیانِ خلافت کو فائدہ اٹھانے کا موقعہ مل جائے گا، لیکن حضرت علیؓ نے اس آگ میں کودنے سے انکار کر دیا وہ کہتے تھے، کہ سب سے پہلے میرے ہاتھ پر بیعت کرو، ملک میں امن و امان قائم ہو جائے گا تو سب مل کر قاتلین عثمان سے قصاص لیں گے، ہماری رائے میں حضرت علیؓ کا نقطۂ نظر بالکل درست تھا، افراد کے مفاد کو خواہ وہ افراد ملت میں کتنے ہی ممتاز و سربلند کیوں نہ ہوں ملت کے مفاد پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ ملت افراد کے لیے نہیں بلکہ افراد ملت کے لیے ہوتے ہیں۔ مملکتِ اسلامیہ کی سالمیت اور استحکام سب چیزوں پر مقدم ہے۔ اگر حضرت علیؓ حضرت معاویہ کا پیچھا چھوڑ کر قاتلینِ عثمان کے پیچھے پڑ جاتے تو ساری مملکت میں انتشار اسی وقت پھیل جاتا جس سے حضرت معاویہ کے غلبے اور استلائے کے لیے راستہ آسانی سے بالکل صاف ہو جاتا۔

لیکن مخالفینِ علیؓ دانستہ قصاص کے معاملہ کو تعویق میں ڈالتے اور امن و امان کی بحالی کے لیے حضرت علیؓ کے ساتھ تعاون کرنے پر رضامند نہ ہوئے جس کی وجہ سے مسلمانوں میں تلوار چل گئی اور وہ بہت سے متحارب

گروہوں میں بٹ گئے اور مسلمانوں کی وحدت کی قبا پارہ پارہ ہو گئی جس کا خمیازہ مسلمان اب تک بھگت رہے ہیں۔ اگر طلحہ، زبیر اور معاویہ دور اندیشی اور ایثار سے کام لیتے اور ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح نہ دیتے تو مسلمانوں کو یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔[1]

پھر یہی دونو مورخ لکھتے ہیں :-

"حضرت علیؑ کے عہد میں مسلمانوں کا کیرکٹر بدل چکا تھا ان میں خود غرضی آگئی تھی، اور وہ مرکزی حکومت کے استقلال کے لیے کوشش کرنے کی بجائے اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرنے لگے تھے جس کا نتیجہ خلیفۂ اسلام کی ناکامی کی شکل میں رونما ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان حالات میں حضرت علیؑ کی ناکامی غیر متوقع نہیں کہی جا سکتی۔ اگر حضرت علیؑ سیاست کی خاردار جھاڑیوں سے اپنے دامن کو چھڑا کر عزلت اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لیتے تو شاید یہ بات ان کے لیے بہتر ہوتی لیکن انھوں نے اسلام کے نام پر عام مسلمانوں کی اپیل کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا، جس کی وجہ سے نہ صرف ان کا دامن عنہرت مخالفین کی خوردہ گیری کے کیچڑ سے داغدار ہو گیا۔ بلکہ وہ اپنی اولاد کے لیے بھی مصائب و آلام کا ایک نہ ختم ہونے والا ورثہ چھوڑ گئے۔"[2]

ان مورخوں نے درحقیقت مشکل کشائے عالم حضرت علیؑ کی مشکلات کی تصویر کشی خوب کی ہے لیکن نتیجہ میں ایک نہایت پست اور سطحی خیال کا اظہار فرمایا ہے

[1] تاریخ اسلام حصہ اول صفحہ ۳۴۹ و صفحہ ۳۵۰
[2] تاریخ اسلام حصہ اول صفحہ ۳۵۰ و صفحہ ۳۵۱

حضرت علی علیہ السلام کی اپنے زمانۂ خلافتِ ظاہری اور اصطلاحی میں کئی پوزیشنیں تھیں،
ایک ان کا خلیفۃ المسلمین ہونا اور ایک خلیفۃ اللہ اور ایک خلیفۃ الرسول اللہ ہونا۔
مسلمانوں کے انتخاب (Election) کے لحاظ سے وہ خلیفۃ المسلمین تھے
اور نص (Devine Selection) اور صفاتِ عالیہ امامت عصمت و
علمِ لدنی وغیرہم کے لحاظ سے خلیفۃ اللہ تھے اور ان فرائض کی ادائیگی کے لحاظ سے
جو رسول اللہؐ کی جانشینی کی وجہ سے ان پر عائد ہوتے تھے وہ خلیفہ رسول اللہ تھے
خلیفۃ اللہ اور خلیفۂ رسولؐ ہونے کی حیثیت انھیں بعدِ رسول اللہؐ ہر وقت حاصل رہی
البتہ چند مسلمانوں نے جب اپنی سیاسی روش سے اقتدارِ ظاہری ان سے لے لیا تو انھوں
نے حزبِ اختلاف کے قائد کے لحاظ سے اپنے خلیفۃ اللہ و خلیفۂ رسولؐ ہونے کے
فرائض نہایت حسن و خوبی سے ادا کیے۔ خلیفۃ اللہ ہونے کے لحاظ سے ان کی شان کو
قرآنِ حکیم نے ان الفاظ میں سورۂ الدہر میں بیان کیا ہے :۔ وما تشاؤن الا ان
یشاء اللہ "تم کچھ نہیں چاہتے مگر وہی چاہتے ہو جو اللہ چاہتا تھا۔" یہ ان کی
شانِ عصمت ہے۔ انھوں نے اللہ کی رضا کو اپنی رضا سمجھ کر کام کیا۔ اللہ کی رضا
پر عمل کو کوئی ایماندار ناکامی نہیں کہہ سکتا۔ رسول اللہؐ کے جانشین ہونے کے لحاظ
سے ان تمام فرائض کی ادائیگی جن کے لیے حضرت خاتم الانبیاءؐ مبعوث ہوئے
تھے ان کا ہر زمانہ میں اہم ترین فریضہ تھا اور تلاوتِ آیات، تزکیۂ انسانیت اور
تعلیمِ کتاب و حکمت تھی۔ اسے بھی انھوں نے کماحقہ ادا کیا۔ اب جب مسلمانوں
نے انھیں خلیفہ منتخب کر لیا تو ان کے سامنے ایک طرف اسلام تھا اور دوسری
طرف مسلمان خلیفۂ خدا اور رسولؐ ہونے کے لحاظ سے اسلام کی عظمت کا تھا۔

ان کا فرض تھا اور مسلمانوں کی خواہشات سے ٹکرانا ان کا اہم فریضہ اگر مسلمانوں کی خواہشات کا شکار نہ ہوتے اگر۔ یے وہ ناکام ہیں تو ارباب سیاست مادی انھیں ناکام کہیں مگر سیاست ربانی۔۔۔ کے لحاظ سے وہ انتہائی کامیاب ہیں فاضل مورخوں نے جو ان کے لیے گوشہ نشینی کو بہتر خیال کیا ہے۔ یہ ان کی خام خیالی ہے۔

ہم یہاں پر مناظر گیلانی کے بعض اقتباسات کو پیش کرتے ہیں۔ گویا جہاں آبادی نے تواریخ المعاویہ میں درج کیا ہے:۔

"مسلمان قدرت کی اس غیبی امداد کے شکریہ سے کیا سبکدوش ہو سکتے ہیں کہ جب دین کو چاہا جا رہا تھا کہ دنیاوی جاہ وجلال شوکت و اقتدار کا صرف ایک حیلہ اور بہانے کی حیثیت عطا کر کے اس کے سارے زور اور واقعیت کو ختم کر دیا جائے۔ یعنی دنیا کو بھی دینی کامیابیوں کا ذریعہ بنا کر دنیا کو بھی دین بنا لیا جائے۔ (صحیح دین ہی دنیاوی دین گویا) جو اسلام حق کی تعلیم دینے آیا تھا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، کہیں اس کو بھی دنیا کی چلتی پھرتی چھاؤں کی تاریکیوں میں گم نہ کر دیا جائے۔ تو یہ واقعہ نہیں ہے کہ اسوقت سب سے بڑی فیصلہ کرنے والی قوت عین وقت پر ہر چیز سے بے پرواہ ہو کر وہ سب کچھ کرنے کے لیے اگر تیار نہ ہو جاتی جس کے تصور سے آج بھی مسلمانوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، تو کیا اسلام جو صرف دین ہے دین کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اپنے دین ہونے کی اس حیثیت کو برقرار رکھ سکتا تھا، سمجھنے والوں کو کون روک سکتا ہے۔"

اسلام کے متنابات بھی اگر وہ یہ سمجھنے لگتے کہ جیسے مختلف ناموں سے سیاسی

اقتدار کے حاصل کرنے کے لیے دنیا میں آئے دن بیسیوں حیلے تراشے جاتے ہیں، پہلے بھی تراشنے والے تراشتے رہے اور اب بھی تراش و خراش کا یہ سلسلہ جاری ہے ان ہی تراشے ہوئے حیلوں میں ایک خود تراشیدہ حیلہ اسلام بھی ہے تو الزام لگانے والوں کے اس الزام کے تردید کی آخری شکل ہی کیا ہوتی ؟ ہر قسم کے اصول سے بے پرواہ ہو کر حصولِ مقصد کے لیے وقت کا جو اقتضا ہو اس کو پورا کرنا چاہیے کیا اسی کو طلبِ دنیا یا زمانہ سازی نہیں کہتے ؟ (گویا) کرنے والوں نے جب یہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا بلکہ یہی کرنے بھی لگے تھے، اور شاید انھوں نے یہ کیا بھی ہو ؛ تو خود ہی سوچنا چاہیئے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے شائستگی تہذیب پھیلانے کے لیے کیا جا رہا ہے ؟ جیسے یورپ کی استعماری اور استبدادی قوتوں کے اس اعلان یا اس قسم کے خوشنما دعووں کو سن کر لوگ مسکرا مسکرا کر رہ جاتے ہیں۔ اگر اسلام یہی ہے تو کیا اسلام کو بھی تخریبی خندوں کے ان تھپیڑوں سے کوئی بچا سکتا ؟ مسلمان مر رہے ہیں اور کاٹے جا رہے ہیں لیکن اسلام بچ رہا ہے۔ اور بچایا جا رہا ہے اس بلند حوصلہ اور فولادی عزم کے ساتھ خدا کے دین کی آخری شکل کو حل کرنے کے لیے کھڑا ہونے والا اگر جمل اور صفین کے میدان میں سینہ تان کر کھڑا نہ ہو جاتا تو کیا اسلام کو وہ بچانے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ جو صرف مسلمانوں کو یعنی اپنے آپ کو مسلمان کہنے والوں کو بڑھانا چاہتے تھے ؛ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ان مسلمانوں کے ٹیکس دہندوں کو بڑھانا چاہتے تھے کہ اسلام اس کی وجہ سے گھٹتا ہے تو گھٹے دو۔[۱]

---

[۱] تاریخ المعاویہ ص ۶۰ تا ص ۶۲

اس صورت میں ہم اہلِ بصیرت سے پوچھتے ہیں کہ علی علیہ السلام کی سیاسی زندگی اسلام کے لحاظ سے یا سیاستِ ربانی کے لحاظ سے کامیاب تھی یا نہیں؟ اگر خود غرض مسلمانوں کے ایفائے خواہشاتِ نفسانیہ کے لحاظ سے اسے ناکام کہا جائے تو یہ سیاستِ مادیہ کا کرشمہ ہے۔

گویا صاحب مناظر گیلانی کا اقتباس پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اسی الحیٰوۃ الدنیا کا وہ دور جو حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے سامنے آگیا تھا، اس میں ایک طرف اسلام تھا اور دوسری طرف مسلمان تھے، ان دونوں چیزوں میں ملط پیدا کرنے والوں نے ایک ایسا ربط پیدا کر دیا تھا کہ اگر ایک کو پکڑا جاتا تھا تو دوسری چیز بگڑ جاتی تھی پھر کیا کیا جاتا؟ یہ ایک ایسا مشکل مسئلہ تھا، کہ اقتضاءِ کی قوتِ فیصلہ (حضرت علیؑ کی ذاتِ گرامی مراد ہے گیا) اگر مسلمانوں کو اس وقت نہ مل جاتی تو ممکن تھا کہ مسلمان نام رکھنے والی کوئی قوم دنیا میں رہ جاتی، لیکن اسلام بھی باقی رہتا یا نہیں اسکی پیشگوئی (اس دور میں گویا) مشکل تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اسلام کے غائب ہو جانے کے بعد یہ کہنا کہ مسلمان قوم تو باقی رہ گئی (اصل اسلام غائب ہو تو ہو جانے دو۔ گویا) کچھ بے معنی سی بات ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی صف آرا کرنے میں لوگ کامیاب ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کے امام اور خلیفہ حضرت علیؑ کے سامنے ایک عجیب صورت حال پیش ہوتی ہے کیا کیا جائے؟ ان کے مقابلے میں تلوار اٹھائی جائے یا نہ اٹھائی جائے؟ کیا جنگ میں ان کے ساتھ بھی وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو غیر مسلموں کے ساتھ اختیار

کیا جاتا ہے۔ ان کے زخمیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ شکست کھانے والے جس مال و متاع کو چھوڑ کر بھاگیں گے اس کا انجام کیا ہوگا؟ غرض یہ اور ایسے بیسیوں پریشان کن سوالات تھے جنھیں وہی حل کر سکتا تھا، جسے پیغمبرؐ کی زبان نے سب سے بڑا قاضی قرار دیا تھا، قدرت کی ان مصلحتوں کو کون جانتا تھا، کہ جب اسلام ان الجھنوں سے دوچار ہوگا تو الجھنوں کو سب سے بڑی سلجھانے والی طاقت کے ہاتھ میں اسلام کی سیاسی باگ اس زمانے میں آجائے گی؛ امام ابوحنیفہ کا اسی سلسلہ میں ان کے مشہور شاگرد نوح بن دراج جو یہ قول نقل کیا کرتے تھے، یعنی جب حضرت علی کے زمانے کے واقعات (جمل وصفین) کے متعلق امام سے پوچھا جاتا تو نوح کہتے ہیں کہ امام اس کے جواب میں فرماتے۔

سار علی فیہ بالعدل وھو علم المسلمین السنۃ بالقتال اھل البغی (صـ ۸۴ جلد ۲)

علی علیہ السلام نے ان مواقع میں عدل کی روش اختیار کی اور مسلمان باغیوں سے اسلامی حکومت کو کیا برتاؤ کرنا چاہیے، اس کے قوانین حضرت علیؑ ہی نے سکھائے اور بتلائے۔

امام ابوحنیفہ کے ان الفاظ کی وہی تشریح ہے جو اس سے پہلے درج کی گئی عدل کی روش سے مرتضیٰ علیہ السلام کی اس متوازن فیصلہ کی طرف اشارا ہے جسے انھوں نے اس موقعہ پر صادر کیا، حضرت امام ابوحنیفہ کی مسئلہ خلافت پر اس

وضاحت سے کہ علیؓ نے عدل کی روش اختیار کی پوری روشنی پڑتی ہے کہ حضرت علیؓ حق پر تھے اور ان کے مخالف باغی خطا پر۔ یہی تمام علمائے اہل سنت کا متفقہ فیصلہ ہے (حاشیہ[1])

پھر یہی مؤلف ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہے:۔

"حکومت (خلافت کے نظام کو جو بدلنا چاہتے تھے) ان کے مقابلے میں ہر قسم کی مصلحت اندیشیوں سے بے پروا ہوکر آستینیں چڑھائے سر بکف میدان میں کود جانا اور اس طور پر کود جانا کہ بولنے والے تو صرف زبان سے بولتے ہیں کہ ہم اپنے نصب العین کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہانے کے لیے تیار ہیں، لیکن جمل و صفین میں یہ کرکے دکھلا دیا گیا کہ پانچ ہزار نہیں ہزارہا ہزار اور بقول بعض لاکھوں تک نوبت قتل و شہید ہونے والے مسلمانوں کی پہنچی چلی جاتی ہے، کشتوں کے واقعی پشتے لگتے چلے جاتے تھے مسلمانوں کی نعشوں کا پہاڑ جمع ہوتا چلا جارہا تھا لیکن یہ حد تھی کسی نصب العین پر اصرار کی کہ کسی قسم کا کوئی حادثہ کوئی مصلحت ان کو بال برابر بھی اس سے ہٹا نہ سکی، میں نہیں جانتا کہ کسی نصب العین کے حصول کی کوشش میں اس کی نظیر انسانیت کی تاریخ پیش کرسکتی ہے؟ سب کچھ اس راہ میں لٹا دیا گیا، بلکہ کربلا کے میدان میں تو اسی نصب العین کے پیچھے علیؓ کے گھرانے کا ایک ایک بچہ قربان ہوگیا۔

---

[1] تواریخ المعاویہ ص ۶۳ تا ص ۶۵

اب سمجھ میں آتی ہے اہمیت اس سیاسی نظام کی جس کو اسلام نے دنیا میں پیش کیا، لوگوں نے اس پر بعد میں عمل کیا یا نہیں، یہ ایک الگ سوال ہے لیکن جمل وصفین و کربلا میں خون سے جریدۂ روزگار پر جس نہ ختم ہونے والے اسرار کا نقش دوام قائم ہو گیا، کیا اس کو کوئی مٹا سکتا ہے (ماخوذ از امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مناظر گیلانی ص۳۴۸ تا ص۳۴۹) ۱؎

حضرت علی علیہ السلام کا تقریباً پانچسالہ دورِ حکومت جس میں حضرت علی علیہ السلام نے قیامت تک آنے والی نسلوں کے سامنے سیاستِ ربانی کو پیش کرنا تھا۔ اس زمانے کے لوگوں نے اسے ناکام دورِ حکومت سمجھا مگر یہ اتنا کامیاب ہے کہ جوں جوں علوم و عقول ارتقائی منزلیں طے کریں گی اس کی کامیابی روشن و عیاں ہوتی جائیں گی۔ آج علوم و فنون کی ترقی کے باوجود دنیا اطمینان سے محروم طمانیت سے بے بہرہ اضطراب و بے چینی میں زمانے کی منازل طے کر رہی ہے اور اس بے چینی کے چند اسباب ہیں، وہ چند عالمی مشکلات ہیں جن کے حل کرنے میں افکار عاجز آ چکے ہیں، وہ مشکلات مندرجہ ذیل ہیں:-

1- Conflict of haves and have nots.

مقبوضات رکھنے والے اور مقبوضات نہ رکھنے والے ممالک کا تصادم۔

۱؎ تواریخ المعادیہ ص۶۷ تا ۷۰

2- Recial Antagonism

نسلی عناد۔

3- Misconception of Nationality.

قومیت کا غلط تصور

4- Mal Distribution of wealth

دولت کی غلط تقسیم

5- Sexual Anarchy

صنفی بغاوت

6- Refusal of God

انکار صانع مطلق

7- Refusal of Day of Judgement

انکار عقیدہ معاد

8- Ecnomical Exploitation

معاشی لوٹ کھسوٹ

9- Selfishness.

خود غرضی

10- Conflict of Labour and capital

سرمایہ اور مزدوری کا تصادم

11- Sectarian Antagonism

فرقہ وارانہ عناد

12- Strugglisf the Domination of one Country upon an other.

ایک ملک کی دوسرے ملک پر حصول اقتدار کی جدوجہد۔

13- Failure of Democracy

جمہوریت کی ناکامی

ایسے بہت سے اسباب ہیں جن کا واحد علاج حضرت علیؑ کی پنجسالہ حکومت ہے۔ اسلام مندرجہ بالا خرابیوں کو دور کرنے کے لیے آیا تھا، مگر مادی سیاست نے مسلمانوں پر ایسا تسلط جمایا کہ یہ سب خرابیاں مسلمانوں کے معاشرہ میں داخل ہوگئیں۔ جناب امیر علیہ السلام نے اپنے پنجسالہ دور حکومت میں ان خرابیوں کو دور کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ اب جبکہ دنیا ان عالمی مشکلات کے حل کے لیے جدوجہد کر رہی ہے، وہ وقت دور نہیں جب علی علیہ السلام اور ان کے خاندان والا تبار کی سیرتیں عالمی مشکلات کے لیے حلال مشکلات ہوں گی، اور دنیا کو حقیقی اسلام کی سیاست ربانیہ سے امن نصیب ہوگا، فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔ اب آئندہ ابواب میں اس اجمال کی تفصیل مطالعہ فرمائیں۔

حضرت علی مرتضیٰؑ کی خلافتِ ظاہری

یہ تمدن کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ حالات کے تغیر و تبدل سے جمہور کے رجحانات بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اب حالات نے پلٹا کھایا، ہنگامی انقلاب نے سلمان بیدار ہوئے۔ ملک میں سخت بے چینی تھی۔ ان شدید حالات میں کوئی شخص حکومت کی ذمہ داریاں لینے کے لیے تیار نہ تھا، ان حالات میں سلطنت کی پیشکش قبول کرنا جان جوکھوں کا کام تھا، اور شدید خطرات کا مول لینا تھا، ایسے نازک حالات میں جمہور کی نگاہیں مولائے کائنات علی ابن ابی طالبؑ کے چہرۂ انور پر جم گئیں اور حضور پر ٹوٹ پڑے۔

خلیفۂ سوم حضرت عثمان کی وفات کے بعد صحابہ نے حضرت علیؑ کو خلافت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ جناب امیرؑ فرماتے ہیں :-

"پس (وفات حضرت عثمان کے بعد) کسی چیز نے مجھے اتنا پریشان نہیں کیا جتنا کہ اس بات نے کہ لوگ اس کثرت سے (ہر چہار طرف سے مجھ پر بیعت کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے، جیسے بجو کی گردن کے بال، یہاں تک کہ عالم یہ ہوا کہ حسنؑ و حسینؑ کچلے جا رہے تھے، اور میری ردا کے دونوں کنارے پھٹ گئے تھے، وہ سب میرے گرد بکریوں کے گلے کی طرح گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔"[1]

---

[1] نہج البلاغہ جلد اول خطبہ ۳

محمد بن جریر طبری اپنی اسناد سے محمد بن حنفیہ سے روایت کرتے ہیں، واقعۂ قتل حضرت عثمان کے بعد ہم اپنے باپ کے ساتھ ایک جگہ کھڑے ہوئے تھے یہاں تک کہ لوگ متفرق ہو گئے، جناب امیرؑ بھی اپنے گھر تشریف لے آئے اصحاب رسولؐ گروہ در گروہ جن میں مہاجر و انصار سب تھے حضرت علی علیہ السلام کے گھر میں آئے، یہاں تک کہ گھر کثرتِ مردم سے بھر گیا۔ باقی لوگ گھر کا احاطہ کیے ہوئے تھے، سب نے کہا حضرت عثمان مارے گئے ہیں۔ لوگوں کو امام و رہبر کی ضرورت ہے اور آج آپ سے بڑھ کر خلافت کا کوئی حقدار نہیں ہے کیونکہ آپ رسول اللہؐ سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ اس پر جناب امیرؑ نے ارشاد فرمایا، میں تمھارا امیر بننے سے رسول اللہؐ کی وزارت کو بہتر سمجھتا ہوں[۱]۔ مگر جناب امیرؑ حصولِ حکومت کے اس موقعہ کو بھی ٹال رہے تھے۔ باوجودیکہ اس سے قبل ہر موقع پر اپنے حقوق کے لیے احتجاج فرماتے رہے۔ اور فلاح و بہبودِ مخلوق کے پیشِ نظر حصولِ سلطنت کے لیے کوشش فرماتے رہے۔ مگر اس وقت جمہور کی التجا کو مسترد فرما رہے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس وقت عمالِ سلطنت اور اراکینِ حکومت کی غیر ذمہ دارانہ روش سے مسلمانوں کی عادتیں بگڑ چکی تھیں، سلطنت دنیاوی اقتدار کے سانچے میں ڈھل چکی تھی، کسریٰ و قیصر کے تمدن کی جھلک پیدا ہو چکی تھی جب حبِ جاہ اور حصول اقتدار کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو چکا تھا، اسوقت کے مسلمان اسلامی مساوات اور اسلام کی سادہ زندگی سے منہ موڑ چکے تھے۔

---

[۱] تاریخ طبری ج ۳ ص ۴۵۰ بحوالہ امیر المومنین ص ۳۶۲ و ص ۳۶۳

جناب امیر علیہ السلام کو اس وقت کا پورا پورا عرفان تھا کہ سلطنت کی پیشکش کو قبول کرنے کی صورت میں دو متضاد طریق کار میرے سامنے ہوں گے۔ ان میں سے ایک اختیار کرنا پڑے گا۔

۱۔ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" پر عمل کرنا ہوگا اور ہوا کے رُخ پر چلنا ہوگا۔ جسے میرے منصب کی ذمہ داریاں جو مجھے اللہ کی جانب سے تفویض ہوئیں اور میرا انسانی فریضہ مجھے اجازت نہیں دیتا۔

۲۔ یا پھر اس بگڑے ہوئے زمانہ کے مقابلے پر ڈٹ جاؤں اور اس زمانے کی تند و تیز ہواؤں کا اس دلیرانہ شان سے جو میرے شایانِ شان ہو مقابلہ کروں۔ اگر میں اس پیشکش کو قبول کر لوں تو مجھے ایسا ہی کرنا ہوگا۔ اس صورت میں بگڑے ہوئے حالاتِ مملکت میں تشتت و افتراق پیدا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے، اور ملک و ملت میں خلفشار پیدا ہو جائے گا۔ پس اس صورت میں میرا دورِ حکومت ناکام سمجھا جائے گا، اس صورتِ حالات کا جائزہ لینے کے بعد حضور نے جمہور کی اس پیشکش کو مسترد کر دیا، لیکن جب یہ کہا گیا کہ دنیا آپ سے ہدایت کی خواہاں ہے، پھر آپ گریز کیوں کرتے ہیں؟ اس جملہ نے ان ذمہ داریوں کا جو بہ حیثیت ہادی آپ پر عاید ہوتی تھیں احساس پیدا کر دیا اور لوگوں کی پیشکش کو چند شرائط سے بمجبوری قبول کر لیا۔

فرمایا آپ سب مسجد میں چلیں، کیونکہ مجھ سے بیعت پوشیدہ و پنہاں نہیں ہونا چاہیے۔ مہاجر و انصار نے مسجد کی راہ لی۔ لوگ دور و نزدیک سے

حاضر ہوئے اور حضرت علیؑ سے بیعت کی۔ یہ جمعہ کے دن ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کا واقعہ ہے۔

ارشاد جناب امیرؑ

اس واقعۂ بیعت پر جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

"اور ہاں اے لوگو!

اس خدا کی قسم جس نے دانہ کو چیرا اور جس نے انسان کو خلق کیا، اگر لوگ اس کثرت کے ساتھ حاضر نہ ہوتے (اور میری بیعت نہ کر لیتے اور مددگاروں کی وجہ سے مجھ پہ حجّت تمام نہ ہو جاتی اور علماء سے خدائی عہد یہ نہ ہوتا کہ وہ ظالم کی شکم سیری (ظلم) اور مظلوم کی گرسنگی (مظلومیت) پر راضی نہ ہوں) تو بلاشبہ ناقۂ خلافت کی مہار میں اسی کی پیٹھ پہ ڈال دیتا، اور بلاشبہ میں آخر بھی اسے وہی کاسۂ آب دیتا جو پہلے دے چکا تھا، اور تم جان لیتے کہ تمہاری یہ دنیا میرے نزدیک بکری کی چھینک سے بھی زیادہ حقیر ہے[1]۔"

حضرت علیؑ کی بیعت عامہ مسجد نبوی میں کی گئی[2] مدینہ میں جس قدر صحابہ تھے سب نے حضرت کی بیعت کی[3]۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۳ جلد اول [2] تاریخ الخمیس دیار بکری، تاریخ احمدی ص ۱۶۵
[3] تاریخ الخلفاء سیوطی، تاریخ احمدی ص ۱۶۵

بیعتِ خلیفہ

جب حضرت عثمان قتل ہوئے اور حضرت علیؑ کی بیعت کی گئی اس زمانے میں حذیفہ بن الیمان کوفے میں علیل تھے، جس وقت انھوں نے حضرت عثمان کے قتل اور حضرت علیؑ کی بیعت کی خبر سنی تو کہا کہ مجھے مسجد میں لے چلو اور الصلوٰۃ الجامعہ کی ندا کرو اور پھر حذیفہ منبر پر بٹھا دیے گئے اور انھوں نے بعد حمد وصلوٰۃ کہا، ایہا الناس! آگاہ ہو کہ علیؑ بن ابی طالب کی بیعت کی گئی ہے بس میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ تقویٰ اختیار کرو۔ اور حضرت علیؑ کی نصرت پر مستعد ہو جاؤ۔ کیونکہ بخدا وہ اولاً و آخراً حق پر ہیں۔ اور تمھارے نبیؐ کے بعد جو لوگ ہوئے اور قیامت تک ہوں گے ان سب سے بہتر ہیں۔ بعد ازاں حذیفہ نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ خداوندا گواہ رہنا کہ میں نے علیؑ کی بیعت کی اور تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے اس وقت تک زندہ رکھا، اس کے بعد ساتویں یا چالیسویں دن حذیفہ کا انتقال ہو گیا[۱] حذیفہ بزرگ ترین اصحاب میں سے تھے[۲] حذیفہ منافقوں کے جاننے میں رسول اللہؐ کے راز دار تھے[۳] رسول اللہؐ نے حذیفہ کو نفاق کی پہچان بتا دی تھی، اور منافقوں کے ناموں پر مطلع کر دیا تھا[۴] حضرت عمر حذیفہ سے پوچھا کرتے تھے کہ اے حذیفہ تم منافقوں

۱؎ مروج الذہب مسعودی، تاریخ احمدی صفحہ ۱۷۱ ۲؎ استیعاب، تاریخ احمدی صفحہ ۱۷۱
۳؎ اسد الغابہ، تاریخ احمدی صفحہ ۱۷۱، ۴؎ مدارج النبوۃ، تاریخ احمدی صفحہ ۱۷۱

جاننے میں رسول اللہؐ کے رازدار ہو، مجھ میں تو کوئی علامت نفاق کی نہیں پاتے[1]

اولاً حضرت علیؑ کی بیعت طلحہ نے کی ان کے بعد زبیر نے پھر اہل مصر نے بعد ازاں مہاجرین و انصار اہلِ مدینہ نے گروہ در گروہ حاضر ہو کر شرف بیعت حاصل کیا اور روز جمعہ بعد بیعتِ عامہ حضرت نے منبرِ نبوی پر نہایت فصاحت و بلاغت سے خطبہ ارشاد فرمایا جس کے ابتدائی جملے یہ تھے الحمد للہ علیٰ احسانہ قد رجع الحق الیٰ مکانہ یعنی خدائے پاک کے احسان کا شکر ہے کہ حق اپنی جگہ لوٹ آیا[2] حضور بیعت لے رہے تھے اور برابر فرما رہے تھے :-

"جان لو کہ میں حدود شرع سے تجاوز نہیں کروں گا، اور نہ کسی کی طرف داری مجھ سے ہو سکے گی، اور تم میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دوں گا، سب کو ایک نظر مرحمت و عطوفت سے دیکھوں گا اور اپنے احکام کتاب و سنتِ رسولؐ پر جاری کروں گا، بیت المال سے ایک درہم بھی اپنے لیے نہیں لوں گا، بیعت سے دوسرے دن حکم دیا کہ بیت المال کا دروازہ کھول دو، اور اس کا کل مال لوگوں میں تقسیم کر دیا۔"

بعض ثقات سے منقول ہے کہ ماہِ فلکِ ولایت اس دن منزل خلافت میں استقرار پذیر ہوا جس روز تحویل آفتاب برجِ حمل میں ہوئی یعنی

---

[1] احیاء العلوم غزالی، تاریخ احمدی ص ۱۷۱

[2] روضۃ الاحباب، تاریخ احمدی ص ۱۷۵۔

اس روز نوروز تھا، ۲۱ مارچ کا دن تھا۔[1]

حکمائے عرب میں ایک حکیم نے حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ خدا کی قسم اے امیرالمومنین خلافت نے تم کو زینت نہیں دی بلکہ تم نے خلافت کو رفعت دی اور تم خلافت کے حاجت مند نہ تھے بلکہ خود خلافت تمہاری محتاج تھی۔[2]

طلحہ و زبیر اور علیؑ کی بیعت

جب حضرت عثمان کے قتل کا واقع ہو چکا تو زبیر مجمع میں کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہنا شروع کیا، اے لوگو! اللہ تم سے شوریٰ کے متعلق راضی ہوا اور ہم نے آپس میں مشورہ کر لیا ہے، لہٰذا تم لوگ علیؑ کی بیعت کرو اور رہ گیا قتل عثمان تو اس کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ ان کی بات خدا پر محول ہے۔ ہاں یقیناً انھوں نے دین میں کچھ بدعتیں کیں، لیکن یہ سنکر لوگ کھڑے ہو گئے اور علیؑ ابن ابی طالب کے پاس ان کے گھر پر گئے اور کہا کہ ہاتھ بڑھایئے، ہم لوگ آپ کی بیعت کریں گے، کیونکہ کوئی نہ کوئی امیر اور خلیفہ ہونا ضروری ہے۔ اور آپ اس خلافت کے لیے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔[3]

---

[1] روضۃ الاحباب تاریخ احمدی ص ۱۶۵

[2] تاریخ الخلفاء سیوطی، صواعق محرقہ، تاریخ احمدی ص ۱۶۶

[3] کتاب الامامت والسیاست ابن قتیبہ ص ۴۶

اِنکار و اِصرار

پہلے جو لوگ امیرالمومنین علیؑ کے پاس گئے ان سے آپ نے صاف انکار کیا، تب لوگوں نے آپس میں گفتگو شروع کی اور کہا کہ خبر قتل حضرت عثمان تمام آفاق میں پھیلے گی، اور لوگ اس خبر کو سنیں گے، مگر یہ نہ سنیں گے کہ کسی کی بیعت بھی ہوئی۔ اس وقت ہر طرف طوائف الملوکی کی سی صورت پیدا ہو جائے گی۔ اور ہر جانب حملے شروع ہو جائیں گے اور فتنہ و فساد بڑھے گا، لہٰذا تم لوگ پلٹ کے جاؤ اور بغیر بیعت کیے ہوئے علیؑ کو نہ چھوڑنا، تاکہ قتل عثمان و بیعت علیؑ یہ دونوں خبریں ساتھ ساتھ منتشر ہوں[1]

سب سے پہلے بیعت کرنے والے

سب سے پہلے جو شخص منبر پر گیا اور جس نے علیؑ کی بیعت کی وہ طلحہ تھے، چونکہ ان کی انگلیاں مشلول تھیں لہٰذا امیرالمومنین نے ان کی بیعت کو پہلے پہل بد شگونی خیال کیا۔ اور فراست امامت سے کام لیتے ہوئے فرمایا یہ ہاتھ کس قدر اس امر کے لائق ہیں کہ بیعت توڑ دیں۔ پھر آپ کی بیعت سعد نے کی اور پھر تمام اصحاب نبیؐ نے[2]

---

[1] کتاب الامامت والسیاستہ صہ ۴۶

[2] کتاب الامامت والسیاستہ صہ ۴۶

سخاوت و بخشش سے دریغ نہ تھا۔ ہجرت کے بعد علی علیہ السلام مدینہ میں جنگ و جہاد اور تعلیم و تربیتِ اسلام سے جب فارغ ہوتے، قنوات کے کھودتے، کھجور کے درخت لگاتے اور غیر آباد اور بنجر زمینوں کو آباد کرنے میں مصروف رہتے تھے اس وقت اپنے قوّتِ بازو کی کمائی کو زیادہ بخشش و سخاوت سے صرف فرماتے انہوں نے بنجر زمینوں کو اپنی محنت و مشقت سے آباد کیا تھا۔ یہاں تک کوفہ میں اس آباد کردہ زرعی اراضی کی سالانہ آمدنی چالیس ہزار دینار تھی وہ اس ساری آمدنی کو فقراء، یتامیٰ، مساکین، بیوہ عورتوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام بنفسِ نفیس زمین میں ہل چلاتے تھے۔ بیج بوتے، آبیاری فرماتے تھے۔ آپ درختوں کی نرسری کا کام بھی کرتے تھے۔ زراعت و فلاحت میں خاص شغف تھا۔ نرسری کے پودوں کو کاندھے پر اٹھا کر شہر بھی لاتے اور وہاں سے نخلستانوں میں لے جاتے، آپ اپنی نرسری کے پودوں کو پانی دے کر ان کی پوری نگرانی کرتے تھے۔ مدینہ طیبہ میں رسولِ اکرمؐ نے مالِ غنیمت کی زرعی زمینوں کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ جو زرعی زمین حضرت علی کے حصّہ میں آئی اسے آپ نے محنت و مشقت سے آباد کیا۔ اس میں ایک ایسی قنات احداث فرمائی جس سے پانی اونٹ کی گردن کی مانند پھوٹ کر نکلتا تھا۔ لوگ اسے منبعِ چشمہ کہتے تھے۔ اس کے زیرِ کاشت جو زمین تھی وہ زرخیز و حاصل خیز تھی۔ آپ اس کی آمدنی کو فقراء، مساکین، یتامیٰ و غرباء پر صرف فرماتے تھے۔[1]

سیدہ طاہرہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے عقد کے بعد حضرت علیؑ کی آمدنی اس قدر

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۲ صہ ۱۵ا

میری مدد کرو۔ میں اس وقت چین سے نہ بیٹھوں گا جب تک حقدار کو اس کا حق نہ دلا دوں، اور ظالم کو ٹھکانے نہ لگا دوں"۔ (نہج البلاغہ)

حضرت علیؑ سے بیعت نہ کرنے والے

حضرت علیؑ کی بیعت سے ایک جماعتِ عثمانیہ نے کنارہ کشی اختیار کی جس میں سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ ابن عمر بھی تھے۔ حالانکہ آگے چل کر ان صاحبوں نے یزید بن معاویہ کی بیعت کر لی۔[1]

صحابہ کی ایک جماعت نے حضرت علیؑ کی بیعت سے کنارہ کشی اختیار کی جن میں عبداللہ ابن عمر اور سعد بن ابی وقاص بھی تھے۔[2]

مدینہ میں لوگوں نے حضرت علیؑ کی بیعت کی لیکن سات آدمیوں نے تامل کیا، اور بیعت نہیں کی۔ جن میں عبداللہ ابن عمر اور سعد بن ابی وقاص بھی تھے، نیز جہاں تک تحقیق ہوا ہے انصار میں سے کسی ایک نے بھی حضرت علیؑ کی بیعت سے تخلف نہیں کیا۔[3] ابو موسیٰ اشعری بھی حضرت علیؑ سے منحرف تھے۔[4]

حضرت علیؑ کی بیعت سے اکابر صحابہ کی ایک جماعت نے تخلف کیا جس میں سعد بن ابی وقاص اور سعید بن زید اور زید بن ثابت اور ابو موسیٰ اشعری بھی تھے۔[5]

---

[1] تاریخ مروج الذہب مسعودی، تاریخ احمدی صفحہ ۱۶۶، [2] اسد الغابہ و تاریخ احمدی صفحہ ۱۶۶
[3] تاریخ ابن جریر طبری و تاریخ احمدی صفحہ ۱۶۶ [4] استیعاب ابن عبد البر و تاریخ احمدی صفحہ ۱۶۶
[5] دول الاسلام ذہبی، تاریخ احمدی صفحہ ۱۶۷۔

عثمانی عمّال کی معزولی

مسندِ خلافت پر متمکن ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے فیصلہ کیا کہ عثمانی دور کے تمام عمّالِ حکومت کو معزول کر کے ان کی جگہ نئے عمّال کا تقرر کیا جائے۔ تاکہ لوگوں کو جو ان کے خلاف شکایات ہیں رفع ہو جائیں۔ مغیرہ بن شعبہ نے جو کہ سیاست دانی اور تدبر میں بے نظیر تھے اس تجویز کی مخالفت کی اور آپ کو سمجھایا کہ جب تک عثمانی دولت کے عمّال آپ کی بعیت کر کے آپ کو خلیفہ تسلیم نہ کریں ان کی معزولی کے احکام صادر نہ کیجیے۔ اس طرح آپ کو خلیفہ ماننے سے انکار کر دیں گے۔ اور خونِ عثمان کے قصاص کو بہانہ بنا کر علمِ بغاوت بلند کر دیں گے۔ اگر بعیت لینے کے بعد انھیں معزول کیا گیا تو سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہ ہو گا، عبداللہ ابن عباس نے بھی جو حضرت علیؓ کے چچا زاد بھائی تھے یہی مشورہ دیا..... مگر آپ نے ان مشوروں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا[1] اس پر کرنل اسبوران لکھتے ہیں:۔

Ali had been advised by several of his counsellers to defer the dismall of the corrupt governers. The Bayard of Islam, the hero without fear and approach refused to be guilty of any

---

[1] تاریخ اسلام سید عبدالقادر ص۳۵۱ و ص۳۵۲

duplicity or compromise with injustice[1]

" علیؑ کو انکے مشیروں نے مشورہ دیا کہ وہ بددیانت گورنروں کے تعطل کو ملتوی رکھیں مگر اسلام کے بایا زرگ نے جو خوف ومذامت سے بے پروا ہیں بے ظلم سے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا "

گورنروں کا تقرر

محرم ۳۶ھ میں حضرت علیؑ نے اسلامی صوبوں میں حسب ذیل حکام مقرر کیے:۔

(۱) یمن۔ عبید اللہ بن عباس (۲) بحرین۔ سعید بن عباس (۳) تہامہ۔ صباحہ بن عباس (۴) یمامہ۔ عون بن عباد

۵۔ مکہ۔ قثم بن عباس ۶۔ مصر۔ قیس بن سعد بن عبادہ

۷۔ بصرہ۔ عثمان بن حنیف ۸۔ کوفہ۔ عمارہ بن شہاب

۹۔ شام۔ سہل بن حنیف[2]

۱۔ قیس بن سعد مصر پہنچے تو وہاں مسلمان تین جماعتوں میں منقسم ہو گئے۔ کچھ لوگ ان کے مخالف تھے، کچھ ان کے حامی اور کچھ متذبذب۔

۲۔ والی بصرہ عبد اللہ ابن عامر حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ عثمان بن حنیف ان کی عدم موجودگی میں پہنچے، وہاں بھی مسلمان اسی قسم کے تین گروہوں میں بٹ گئے۔

۳۔ عمارہ کوفہ کی راہ میں زبالہ کے مقام پر تھے کہ ان سے طلحہ بن خویلد اسدی ملے جو شہادت عثمان کی خبر سن کر ان کے خون کا بدلہ لینے کے لیے آرہے تھے۔ انھوں نے عمارہ سے کہا کہ یہیں سے پلٹ جاؤ ورنہ تمہارا سر کاٹ دیں گے

---

[1] Islam under the Arabs.

[2] تاریخ الائمہ صفحہ ۲۶۴

۴ - یمن میں عبداللہ ابن عباس کی خبر سن کر یمن کے پہلے حاکم یعلیٰ بن امیہ خراج کی کل رقم جو بیت المال میں تھی لے کر چلے گئے اور عبیداللہ حکومت یمن پر قابض ہو گئے۔

۵ - فتح شام کے بعد حضرت عمر کے زمانے میں معاویہ شام کے عامل مقرر ہوئے تھے، وہیں ان کے قبیلے بنی امیہ کے بہت سے لوگ جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ان کے تدبر، سیاست دانی اور فیاضی کے سبب اہالیانِ شام ان کے بیحد گرویدہ تھے، ان کے پاس زبردست فوج تھی۔ حضرت سہل بن حنیف پہنچے تو انھیں شامی سواروں کا ایک دستہ ملا جس نے آپ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں اور کہاں جاتے ہیں۔ سہل نے جواب دیا کہ میں عامل شام مقرر ہوا ہوں۔ اور عہدے کا چارج لینے جا رہا ہوں۔ ان لوگوں نے کہا کہ اگر آپ کو عثمان نے مقرر کیا ہے تو خیر ورنہ ہم آپ کی امارت کے فرمان کو جائز نہیں سمجھتے۔ چنانچہ سہل واپس چلے آئے۔[۱]

فرانسیسی مورّخ کی رائے

جسٹس امیر علی بلگرامی اپنی تاریخ Short History of Saracen میں لکھتے ہیں:-

The husband of Fatima united in his person the hereditary rights

---

[۱] "تاریخ اسلام" سید عبدالقادر ص ۳۵۲ و ص ۳۵۳

with that of election". One would have thought" says a French historian "that all would have bowed before his glory so pure and grand but it was not to be[1].

"حضرت فاطمہؓ کے شوہر کی شخصیت میں وراثتی حقوق اور انتخاب دونوں جمع تھے، ایک فرانسیسی مورخ سیڈی لٹ کہتا ہے ہر شخص یہ خیال کرتا ہوگا کہ ایسی پاکیزہ اور با عظمت شخصیت کے سامنے ہر شخص نے سر تسلیم خم کیا ہوگا، مگر ایسا نہیں ہوا۔"

ایسا کیوں نہ ہوا؟

سر امیر علی لکھتے ہیں :—

From the begining he was best with the hostility of ommyeades. with the honesty of purpose which always distinguished him; and disregarding all advice for

---

ف¹ Sedillot

temporising; immediatly on his accession he gave order for the dismissal of the corrupt governors appointed by Osman, the resumption of the fiefs and estates that had been bestowed, at public loss, by the aged caliph upon his principal favourites and the distribution of the revenues in accordance with the rules laid down by Omer[1]. These orders gave great offence to those who had enriched themselves under the last adminstration. Some of the Osman's nominees gave up there posts without resistence, others revolted. Among the latter was mowayiah, the son of Abu Sufyan, who held

---

[1] Masudi

the government of Syria, and who had, with the wealth of the province, collected a large force of mercenries, bound to him by love of pay. Thus supported mowaiych raised the standard of rebellion.[1]

آغازِ حکومت میں ہی حضرت علیؑ کو بنی امیہ کی عداوت سے دوچار ہونا پڑا۔

ان میں اغراض و مقاصد کے لیے دیانت تھی جس میں وہ ہمیشہ ممتاز رہے۔ انھیں جتنے بھی زمانہ سازی کے لیے نصائح کی گئیں انھوں نے ان کی پرواہ نہیں کی۔ تخت نشینی کے فوراً بعد انھوں نے ان تمام بد دیانت گورنروں کو معطل کر دیا جنھیں حضرت عثمان نے مقرر کیا تھا، انھوں نے ان تمام جاگیروں اور ملکیتوں کو جنھیں بوڑھے خلیفہ نے پبلک نقصان پر اپنے عزیز دوستوں کو دیا تھا ضبط کر لیا۔ اور وظائف کی وہ تقسیم بھی روک دی، جو حضرت کے مرتب کیے ہوئے قوانین کے مطابق نہ جاری تھی۔

---

[1] Short History of Sarceus P 49 and 50.

ایسے احکام ان لوگوں کی اذیت کا باعث ہوئے جنہیں سابقہ
نظم ملکی نے مالامال کر دیا تھا حضرت عثمان کے بعض نامزد حکام
نے بغیر کسی مخالفت کے اپنی اسامی خالی کر دیں۔ بعض نے
بغاوت اختیار کی ان بغاوت کرنے والوں میں ابوسفیان کے
بیٹے معاویہ بھی تھے جو شام کی حکومت پر مسلط تھے اور جنہوں نے
اس صوبے کی دولت سے اپنے گرد زر دوست خود غرضوں کا ہجوم جمع
کر لیا تھا، جو تنخواہ کی محبت میں ان سے وابستہ تھے۔ ایسے وسائل
سے معاویہ نے علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔"

اس کے بعد مورخ مذکور لکھتا ہے:۔

But this was not the only difficulty Ali had to contend with. His refusal to give to Talka and Zubair two prominent members of the Koraish the Govern-ment of Kufa and Bassa had converted their uncertain frind-ship into implacable hatred; and Aeysha daughter of Aba Bakar, who entertaind an inconcievable

dislike to Ali, fanned the flame.[۱]

"لیکن حضرت علیؑ علیہ السلام کی صرف یہی مشکل نہیں تھی جس سے انھیں دوچار ہونا پڑا حضرت علیؑ نے قبیلۂ قریش کے دو اہم افراد حضرت طلحہ و حضرت زبیر کو کوفہ اور بصرہ کی گورنریاں عطا نہ فرمائیں جس سے ان کی غیر یقینی دوستی شدید نفرت میں تبدیل ہو گئی اور حضرت ابوبکر کی بیٹی حضرت ام المومنین بی بی عائشہ جنھیں حضرت علی سے ایک ناقابلِ فہم ناپسندیدگی تھی انھوں نے اس شعلہ کو ہوا دی۔"

ان تین مسلمان اہم شخصیتوں حضرت طلحہ و حضرت زبیر و حضرت عائشہ نے حضرت علی علیہ السلام کے نظامِ حکومت میں سخت مشکلات پیدا کی ہیں اس لیے ان اہم شخصیتوں کا تعارف اور ان کی حضرت علیؑ کے خلاف جد و جہد کا تذکرہ ذرا تفصیل سے ضروری ہے۔

حضرت طلحہ

حضرت طلحہ کا سلسلۂ نسب یوں ہے:-

ابو محمد طلحہ بن عبید اللہ بن عثمان بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ عبید اللہ طلحہ کے باپ حضرت ابوبکر کے چچا زاد بھائی تھے، اور طلحہ کی ماں صعبة کہلاتی تھیں۔ جو حضرمی کی بیٹی تھیں، قبل اس کے کہ عبید اللہ ان سے اپنا عقد کریں اور یہ طلحہ کی ماں ہوں ابوسفیان نے ان سے عقد کیا تھا۔ جب

۱۔ A Short History of Saracen P 50.

ابوسفیان نے طلاق دے دی تو عبیداللہ نے ان سے اپنا عقد کیا۔[1]

حضرات اہل سنت کے نزدیک حضرت طلحہ عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں اور ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ نے کہا تھا یہ زندہ ہی جنتی ہیں۔ آپ حضرت ابوبکر کے بھتیجے اور ان کے داماد بھی ہیں۔ حضرت ابوبکر نے اپنی اسماء دختر ام کلثوم ان سے بیاہ دی تھی۔ اس لیے وہ رسول کریم کے ہم زلف اور حضرت عائشہ کے بہنوئی تھے۔ اسی لیے بھی حضرت عائشہ نے جنگ جمل میں ان کا ساتھ دیا جنگ احد میں ان کا ہاتھ تلوار سے کٹ گیا تھا۔ (تاریخ اسلام سید شبیہ (اکبرآبادی)) لیکن اس کے باوجود انھوں نے حضرت ابوبکر کی بیعت سے انکار کیا تھا۔[2] آپ نے ہی مرتے وقت حضرت ابوبکر پر یہ اعتراض کیا تھا کہ انھوں نے وصیت نامہ کی رو سے حضرت عمر کو کیوں خلیفہ بنایا۔ حالانکہ وہ بہت تند خو اور سخت مزاج ہیں۔[3] حضرت نے جب مجلس شوریٰ مقرر کی تو اس کے ایک ممبر آپ بھی تھے۔ جب شوریٰ کمیٹی کا تقرر ہوا تو ایک دوسرے شخص نے کہا ہم طلحہ کو خلیفہ کریں گے۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا ایسے آدمی کو کیا خلیفہ کرو گے جس نے رسول کی عطا کی ہوئی زمین کو ایک یہودیہ کے ہاں رہن کر دیا۔[4]

ان کے متعلق امام ابن قتیبہ لکھتے ہیں:-

"کہ طلحہ اور زبیر نے حضرت عثمان پر سب سے پہلے طعن و تشنیع کی

---

[1] سلسبیل فصاحت جلد ۱ ص ۲۷ (حاشیہ) [2] تاریخ کامل جلد ۲ ص ۱۲۴
[3] تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۳۶۹ [4] شرح فقہ اکبر ملا علی قاری، تاریخ احمدی ص ۱۳۶
تاریخ طبری ج ۵ ص ۳۵ [5] کنزالعمال، تاریخ احمدی ص ۱۳۲

سب سے پہلے ان کی بدگوئی کی اور سب کے بعد ان کے قتل کا حکم دیا اور سب سے پہلے ان دونوں نے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کی اور پھر بغیر کسی سبب کے بیعت توڑ دی [1] اگرچہ حضرت طلحہ کی آمدنی بہت زیادہ تھی، کوفہ میں انھوں نے ایک عالیشان محل بنوایا تھا، انھیں روزانہ ایک ہزار دینار کی آمدنی فقط عراق سے آتی تھی۔ بعض لوگوں نے تو اس سے بھی زیادہ لکھا ہے۔ سراۃ کے اطراف کی آمدنی ایک ہزار دینار سے بھی زیادہ تھی۔ ایک محل انھوں نے مدینہ میں بنوایا تھا، جو پکی اینٹ، چونہ اور نہایت عمدہ ساگوان کی لکڑی سے بنا تھا۔ محمد ابن ابراہیم کا بیان ہے کہ طلحہ کی آمدنی عراق سے چار لاکھ سے پانچ لاکھ تک تھی۔ اور سراۃ کے اطراف سے کم و بیش دس ہزار دینار تھی۔ سفیان بن عیینیہ کا بیان ہے کہ ان کی روزانہ آمدنی ہزار روائی تھی۔ یعنی ہزار دینار تھی۔ موسیٰ بن طلحہ کہتے تھے کہ انھوں نے مرنے پر بائیس لاکھ درہم دو لاکھ دینار چھوڑے ابراہیم بن محمد بن طلحہ کا بیان ہے کہ طلحہ نے مال و اسباب، زمین و جائیداد سونا و چاندی جتنا چھوڑا اس کی مجموعی قیمت تین کروڑ درہم تھی۔ جس میں نقد ۲۲ لاکھ درہم اور دو لاکھ دینار تھے۔ اور باقی جائیداد و اسباب تھے۔ عمرو عاص کہتے تھے کہ طلحہ کے مرنے پر سو بیل کی کھال کے بورے چھوڑے جن میں سونا بھرا ہوا تھا۔ علامہ عبد ربہ نے

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ ص ۴۷

خشنی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے تیس ہزار بیل کے کھال کے بورے چھوڑے جن میں سونا چاندی بھرا ہوا تھا۔ سبط ابن جوزی نے لکھا ہے کہ تین سو اونٹوں کا بار سونا چھوڑا تھا۔[1]

اتنی دولت کے باوجود پھر بھی آپ کو ولایت وحکومت اور دولتِ دنیوی کا شوق تھا۔ چنانچہ بیعت کا توڑنا انہی باتوں پر مبنی تھی۔ علامہ ابن قتیبہ لکھتے ہیں :-

بیعتِ امیرالمومنین جب ہو چکی تو طلحہ و زبیر آپ کے پاس آئے، اور کہا آپ جانتے ہیں کہ ہم نے کیوں آپ کی بیعت کی۔ آپ نے فرمایا، اطاعت فرمان برداری کے لیے، دونوں نے کہا نہیں، بلکہ اس لیے بیعت کی ہے کہ ہم امرِ خلافت میں آپ کے شریک کار رہیں گے۔ آپ نے فرمایا، خلافت میں تو نہیں البتہ تم لوگ قول و استقامت میں شریک رہ سکتے ہو۔"

زبیر کو اس میں کوئی شک نہ تھا، کہ عراق کی ولایت انھیں ملے گی۔ اور طلحہ کو یقین تھا کہ یمن کی ولایت انھیں ضرور ملے گی۔ جب ان دونوں پر یہ بات کھل گئی کہ علیؑ سے کچھ ملنا ملانا نہیں تو شکوہ و شکایت کرنے لگے، زبیر نے مجمع قریش میں کہا "لو یہ جزا علیؑ سے ہمیں ملی ہے۔" ہم ان ہی کے لیے عثمان کے خلاف اٹھے اور عثمان پر ان کے گناہ ثابت کر کے چھوڑے اور ان کے قتل کا باعث ہوئے۔ اس درمیان میں علیؑ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے، جب انھیں وہ شے مل گئی جو وہ چاہتے تھے۔ تو ہم پر دوسروں کو ترجیح دی، طلحہ نے کہا، اس میں کوئی برائی نہیں، غیر

---

[1] طبقات ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۱۵۸، مروج الذہب جلد ۱ صفحہ ۴۳۴، عقد الفرید ج ۲ صفحہ ۲۷۹، ریاض النضرہ جلد ۲ صفحہ ۲۵۸، دول الاسلام ذہبی جلد ۱ صفحہ ۱۸، خلاصہ خزرجی صفحہ ۱۵۲۔

ہم تین آدمی اہلِ شوریٰ سے تھے، ایک نے ان کی بیعت سے کراہت کی اور ہم دو نے ان کی بیعت کی اور جو کچھ ہمارے ہاتھ میں تھا؛ انھیں دیا اور جو کچھ ان کے ہاتھ میں تھا اسے جانے سے روکا، اب ہم کو جس امر کی امید تھی ہم اس سے ناکام ہیں، جب ان دونوں کی باتیں امیرالمومنین کے گوش گزار ہوئیں تو آپ نے عبداللہ بن عباس کو بلوایا کہ آپ ان سے ایسے امور میں مشورہ لیا کرتے تھے اور کہا کہ تمھیں طلحہ و زبیر کی باتیں معلوم ہوئیں انھوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا، تمھاری کیا رائے ہے؟ ابن عباس نے کہا میری یہ رائے ہے کہ بصرہ کا والی زبیر کو بنا دیجیے اور کوفہ پر طلحہ کو مقرر کر دیجیے[1] آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ میں ان کو پہچانتا ہوں، اگر ایسا ہوگا تو ظالم کی بن آئے گی اور بصرہ و کوفہ کے مظلومین کی کوئی نہیں سنے گا، مجھے اگر یونہی کرنا ہوتا تو میں شام پر معاویہ کو برقرار رکھتا، جب یہ لوگ ولایت سے مایوس ہو گئے تو مدینہ چھوڑنے کا ارادہ کیا، درآنحالیکہ دل میں ایک پوشیدہ مقصد لیے ہوئے تھے، اور امیرالمومنینؑ سے آکر عرض کیا اے امیرالمومنین! ہمیں عمرہ کی اجازت دیجیے۔ اگر آپ کا قیام ختم عمرہ تک یہاں رہا تو ہم لوگ آپ کے پاس پلٹ کر آ جائیں گے اور اگر آپ نے کہیں سفر کیا تو آپ کے ساتھ چلیں گے، یہ سن کر آپ نے ان دونوں پر ایک نگاہ ڈالی اور کہا، ہاں تم دونوں عمرہ کے لیے نہیں جاتے نہ عمرہ کا قصد رکھتے ہو، اچھا جاؤ! جہاں جی چاہے، دونوں چلے گئے[2]

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ ص۵۱ [2] الامامۃ والسیاسۃ ص۵۲

حضرت زبیر

حضرت زبیر کا سلسلۂ نسبی یوں ہے :-

زبیر ابن عوام بن خویلد بن اسد بن عبد عزی ابن قصی ان کی ماں صفیہ بنت عبد المطلب تھیں۔ جو ہاشم بن عبد مناف کے بیٹے تھے یعنی ان کی ماں رسول اللہؐ اور علی مرتضیٰؑ کی پھوپھی تھیں۔ ان کی زوجہ حضرت اسما بنت ابی بکر تھیں۔ اس لحاظ سے آپ حضرت ابوبکر کے داماد اور حضرت ام المومنین عائشہ کے بہنوئی تھے۔ اس کے باوجود حضرت ابوبکر کی خلافت کے وقت انھوں نے حضرت ابوبکر کی بعیت سے انکار کر دیا تھا۔ اور یہاں تک کہا تھا کہ جب تک حضرت علیؑ کی بعیت نہیں کی جائے گی میں اپنی تلوار نیام میں نہیں کروں گا اس پر حضرت عمر نے لوگوں سے کہا کہ زبیر کی تلوار چھین کر پتھر پر پٹک دو اور پھر حضرت عمر منکرینِ بعیت کے پاس گئے اور ان کو بعیت کے لیے گرفتار کر لیا[1]"

یہ زبیر حضرت ابوبکر کے داماد اور ان کی بیٹی اسما کے شوہر ہیں۔ حالانکہ حضرت ابوبکر کی خلافت سے انھیں بہت سے مفاد کی امید ہو سکتی تھی۔ مگر حضرت علیؑ کی حمایت میں شمشیر بکف ہو جانا ان کے جذبات باطنی کا ترجمان ہے۔

جب حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو خلیفہ بنایا تو طلحہ و زبیر نے حضرت

---

[1] تاریخ کامل جلد ۲ صفحہ ۱۲۴

ابوبکر سے کہا کہ جب تم عمر کو ہم پر باوجود اس کی سخت مزاجی کے خلیفہ مقرر کرتے ہو تو اپنے پروردگار کو کیا جواب دو گے؟ اس پر حضرت ابوبکر نے اپنے لوگوں سے کہا، تم لوگ ذرا مجھے سہارا تو لگا دینا، لوگوں نے ان کو بٹھایا تو کہا، تم مجھے خدا سے ڈراتے ہو، جاؤ میں خدا کو جواب دے دوں گا کہ میں نے اس شخص کو ان کا حاکم بنایا جو تیرے اہل میں سب سے اچھا تھا[1]

جن لوگوں کو حضرت عمر نے شوریٰ کمیٹی میں نامزد کیا ان میں حضرت زبیر بن عوام بھی تھے۔

جب حضرت عمر نے شوریٰ کمیٹی کی تشکیل کے بعد لوگوں سے دریافت کیا کہ میرے بعد تم کس کو خلیفہ کرنا چاہتے ہو ایک شخص نے کہا، زبیر بن عوام کو حضرت عمر بولے کیا، ایسے شخص کو خلیفہ کرو گے جو ایک بخیل اور بداخلاق آدمی ہے[2]

زبیر بہت بڑے مالدار تھے، زبیر نے مرنے کے بعد ۱۱ مکانات مدینہ میں دو مکان بصرہ میں، ایک کوفہ میں، ایک مصر میں چھوڑا، انکی چار بیویاں تھیں، جنھوں نے ان کے ترکہ سے اٹھواں حصہ پایا۔ اور ہر بیوی کو ۱۲ لاکھ ملے[3] صحیح بخاری وغیرہ میں صرف تعداد لکھی ہے۔ درہم و دینار کی صراحت نہیں البتہ تاریخ ابن کثیر میں درہم کی تصریح ہے۔

زبیر کی مصر میں بھی جاگیریں تھیں، اسکندریہ میں بھی، کوفہ میں بھی، بصرہ میں بھی

---

[1] تاریخ خمیس جلد ۲ ص ۳۶۹ [2] کنز العمال، تاریخ احمدی ص ۱۳۳

[3] صحیح بخاری ج ۵ ص ۲۱۔

کئی مکانات تھے، اطراف مدینہ سے بھی ان کی آمدنی آتی تھی[1]
زبیر نے مرنے پر ہزار گھوڑے، ہزار غلام، کنیزیں اور بہت سے محلات و جاگیریں چھوڑیں[2]

حضرت زبیر بن عوام نے ایک عالی شان محل بصرہ میں ایسا مضبوط بنایا تھا کہ جو مورخ مسعودی کے زمانہ (۳۳۲ھ) میں موجود تھا، اور اس میں تجار و اہل دول ٹھہرتے تھے (ہوٹل کے طور پر استعمال ہوتا تھا) ایسے ہی محل انھوں نے مصر، کوفہ اور اسکندریہ میں بھی بنوائے تھے۔ اپنی وفات پر انھوں نے پچاس ہزار دینار چھوڑے اور ایک ہزار اونٹ چھوڑے تھے[3] ان کے ایک ہزار غلام تھے جو ان کو خراج دیتے تھے[4]

اتنا دولت مند اور متمول ہونے کے باوجود ان کو بھی ولایت و حکومت اور دنیوی دولت سے شغف تھا، جب تک انھیں امید تھی کہ یہ چیزیں انھیں جناب امیر علیہ السلام کی خلافت میں حاصل ہو جائیں گی، انھوں نے جناب امیر علیہ السلام سے بیعت کی اور اس پر قائم رہے، جب اپنی خواہشات سے ناامیدی ہوئی تو بدل گئے۔ اور کہنے لگے کہ میں نے بیعت علیؑ میں تقیہ و توریہ سے کام لیا ہے۔ اور ہاتھ سے بیعت کی ہے مگر دل سے نہیں کی، اس کے متعلق جناب امیرؑ نے فرمایا کہ اپنے اس قول پر کہ تم نے توریہ کیا

---

[1] طبقات ابن سعد، جلد ۳ صفحہ ۷۷ طبع لیڈن
[2] مروج الذہب جلد ۱ صفحہ ۳۴۳
[3] مروج الذہب مسعودی، الجزء الثانی صفحہ ۲۲۲
[4] الاستیعاب ج ۲ صفحہ ۲۰۴

دلیل لاؤ، کیونکہ دعویٰ بلا دلیل غیر مسموع ہے اور ظاہر ہے کہ اس امر پر کوئی دلیل لائی نہیں جا سکتی۔ کیونکہ توریہ کا تعلق قلبی حالت سے ہے۔ اور قلبی حالات مشاہدہ میں نہیں آ سکتے۔ اور کوئی ان پر گواہی نہیں دے سکتا۔ اس کلام میں جو زبیر نے کیا، بیعت کا صریحی اقرار موجود ہے اور اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہی۔ رہ گیا کلام کا دوسرا حصہ یعنی توریہ، اس پر کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اور دعویٰ بغیر دلیل قابلِ قبول نہیں ہے۔

بلکہ تاریخی حقائق یہ ہیں کہ طلحہ اور زبیر نے حضرت علیؑ کی بیعت کی بلکہ دوسروں کو بھی اس کا حکم دیا، جب علی علیہ السلام سے وابستہ رہنے میں کوئی ذاتی منفعت نظر نہ آئی تو پلٹ گئے

احنف کا بیان

جس وقت حضرت عثمان محصور تھے اور مدینہ میں اصحاب و مہاجرین و انصار قتل حضرت عثمان پر تلے ہوئے تھے اس وقت احنف کہتے ہیں کہ میں طلحہ اور زبیر سے ملا، اور میں نے کہا کہ تم دونوں مجھے کس شخص کی بیعت کا حکم دیتے ہو۔ اور کس کی بیعت پر تم راضی ہو، بتاؤ۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ عثمان ضرور قتل کر دیے جائیں گے۔ طلحہ اور زبیر نے کہا کہ علیؑ کی بیعت کرنا۔ احنف نے کہا، تو تم مجھے ان کی بیعت کا حکم دیتے ہو۔ اس پر راضی ہو، دونوں نے کہا، ہاں ہم راضی ہیں، میں یہ سنکر وہاں سے چلا گیا۔ اور مکہ پہنچا، اور یہاں آکے سنا کہ حضرت عثمان قتل ہو گئے۔ اس وقت مکہ میں حضرت

عائشہ بھی موجود تھیں، میں حضرت عائشہ سے ملا، اور عرض کی کہ آپ کس کی بیعت کا مجھے حکم دیتی ہیں؟ انھوں نے بھی یہی فرمایا کہ علی ابن ابی طالب کی بیعت کرو، میں نے پھر عرض کیا، تو آپ مجھے بخوشی یہ حکم دیتی ہیں؟ اور آپ اس بیعت سے راضی ہیں؟ فرمایا، ہاں ہاں! احنف کہتے ہیں کہ اب میں مدینہ میں آیا اور علی ابن ابی طالب کی بیعت آکر کر لی۔ پھر بصرہ پلٹ کر آیا، مجھے یقین تھا کہ علیؑ کی بیعت محکم و مضبوط ہو گئی، اور سب کام درست ہو گیا، ابھی میں اسی حال میں تھا کہ ایک آنے والے نے مجھ سے کہا کہ عائشہؓ زبیر و طلحہ مقام خریبہ میں اترے ہوئے ہیں، میں نے کہا، یہ لوگ یہاں کیونکر آئے۔ کہا کہ تمھارے پاس انھوں نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ تم انتقام خون عثمان میں ان کی مدد کرو۔ "عجب" یہ وہ آفت تھی اور ایسی خطرناک مصیبت تھی کہ مجھ پر کبھی ایسا وقت آیا ہی نہیں تھا۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ ان لوگوں کی مدد نہ کرنا بھی مجھ پر بہت سخت ہے۔ کیونکہ یہ ام المومنین عائشہ اور حواری رسول اللہ طلحہ و زبیر ہیں اور حضرت علیؑ سے جنگ کرنا بھی مجھ پر دشوار ہے، کیونکہ وہ ابن عم رسولؐ ہیں اور اس کے ماسوا ان لوگوں نے مجھے ان کی بیعت کا حکم بھی دیا ہے اور میں ان کی بیعت بھی کر چکا ہوں۔ خیر میں ان لوگوں کے پاس آیا (جب مجھے دیکھا) تو کہا کہ تم ہماری مدد انتقام خون عثمان میں کرنے آئے ہو؟ جو مظلوم قتل ہوئے میں نے کہا کہ اے ام المومنین! آپ کو قسم ہے خدا کی یہ تو بتائیے کیا میں نے آپ سے نہیں پوچھا تھا کہ آپ کس کی بیعت کا مجھے حکم

فرماتی ہیں اور کس کی بیعت سے راضی ہیں، تو آپ نے کہا تھا کہ علیؑ کی بیعت کرو۔ حضرت عائشہ نے فرمایا، ہاں یہ تو ہوا تھا، مگر علیؑ کچھ بدل گئے، پھر میں طلحہ و زبیر کے پاس گیا، اور ان سے بھی یہی کہا، کہ تم لوگوں سے میں نے پوچھا اور تم نے علیؑ کی بیعت پر رضامندی بھی ظاہر کی اور مجھے ان کی بیعت کا حکم دیا۔ تمھیں قسم ہے، بتاؤ کیا ایسا نہیں ہوا؟ دونوں نے اقرار کیا اور کہا، ہاں ایسا ہی ہوا تھا، مگر علیؑ کچھ بدل گئے اب وہ وہ نہیں جو پہلے تھے، یہ سنکر میں نے کہا کہ خدا کی قسم نہ تو میں تم لوگوں سے جنگ کروں گا اور نہ علیؑ سے، کیونکہ تم میں ام المومنین عائشہ اور حواریٔ رسولؐ زبیر ہیں اور ادھر علیؑ ابن ابی طالب ابنِ عمِ رسولؐ ہیں جن کی بیعت کا حکم تمھیں لوگوں نے مجھ کو دیا تھا[1]

چنانچہ احنف اس جنگ میں مع اپنے قبیلہ کے شریک نہیں ہوئے۔ اور بصرہ سے دو فرسخ پر مقام جلحاء میں جا کر بیٹھ رہے اور چونکہ امیرالمومنینؑ کی بیعت کر چکے تھے لہٰذا جناب امیر علیہ السلام کی خدمت میں یہ عریضہ بھیجا جس میں اپنی حالت بیان کرتے ہیں اور الگ رہنے کی خواہش کرتے ہیں:۔

" احنف نے امیرالمومنینؑ سے کہلا بھیجا، کہیے تو میں اپنے دو سو گھر والوں سمیت آپ کی مدد کے لیے آؤں اور کہیے تو چار ہزار تلواریں آپ سے روک دوں۔"

---

[1] تاریخ طبری جلد ۵ ص ۱۹۸

آپ نے جواب دیا کہ تم میرے ہمراہ ہو کر لڑنے کے لیے نہ آؤ اور چار ہزار تلواروں کو روک دو، یہ تمہاری بہترین مدد میرے لیے ہوگی۔ چنانچہ احنف نے بنو تمیم کے قبیلہ کو جمع کرکے ایک تقریر کی اور وہ لوگ رک گئے اور کسی طرف سے جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔[1]

مگر احنف چونکہ حق کو جانتے تھے لہٰذا وہ اپنی اس عدم شرکت جنگ پر افسوس کیا کیے اور غمگین رہے کہ کیوں علیؑ کی رکاب میں جہاد نہ کیا۔ اور بہت شرمندہ تھے جس کا گواہ تاریخ ابن قتیبہ کا یہ فقرہ ہے۔ "قد ندم الاحنف علیٰ خذلہ علیا" "احنف علیؑ کے ہمراہ رہ کر جنگ نہ کرنے سے شرمندہ رہے"۔[2]

حضرت زبیر کا معاویہ امیر شام کو خط

جس وقت امیرالمومنین کی بیعت ہو چکی اس وقت حضرت زبیر نے ایک خط امیر شام معاویہ کو لکھا جس کا مفہوم یہ تھا:-

"لوگوں نے بغیر میرے مشورہ کے عثمانؓ کو قتل کر دیا، اور اس کے بعد سب نے آپس میں مشورہ کرکے میری بیعت کر لی ہے اور اس بیعت پر ان کا اجماع ہے، لہٰذا جب میرا یہ خط تمہیں پہنچے تو تم بھی میرے لیے بیعت لو اور قبل اس کے کہ تم میرے پاس آؤ اشراف اہل شام کا ایک وفد بھیجو۔"

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ ص ۱۷۱ [2] الامامۃ والسیاسۃ ص ۷۴

جب یہ خط معاویہ کو ملا اس نے بنی عمیس کا ایک آدمی اپنے ایک خط کے ساتھ زبیر بن العوام کے پاس بھیجا اور وہ خط یہ تھا:۔

امیرِ شام معاویہ بن ابی سفیان کی وقتی سیاست

"یہ خط معاویہ بن ابی سفیان کا امیر المومنین زبیر کے لیے ہے بعد سلام معلوم ہو، میں نے تمہارے لیے اہلِ شام سے بیعت لے لی ہے اور انھوں نے اس دعوت پر لبیک کہی اور سب مطیع کی حیثیت میں جمع ہو گئے۔ جیسے دودھ ایک جگہ مختلف تھنوں سے جمع کر لیا جاتا ہے، لہٰذا آپ کوفہ اور بصرہ سے ہوشیار رہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں علیؓ پہنچ جائیں اور ان کا قبضہ ہو جائے۔ اور جب یہ دونوں شہر مل گئے تو اس کے بعد پھر کیا باقی رہا۔ بلکہ میں نے آج ہی تمہارے بعد طلحہ کے لیے بھی بیعت لے رکھی ہے۔ لہٰذا انتقام خونِ عثمان کا چرچا کرتے رہو، اور لوگوں کو اس کے لیے بلاتے رہو، جی توڑ کے اس معاملہ میں کوشش کرو، خدا تم دونوں کو ظفریاب کرے اور تمہارے دشمنوں کو مغلوب اور بے مدد چھوڑے۔"

یہ خط جب زبیر کو ملا تو خوشی کے مارے عجب حال ہُوا۔ فوراً طلحہ کو جا کر سنایا اور دونوں کے دونوں علیؓ کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے اور معاویہ کی باتوں پر یقین کر لیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد دونوں امیر المومنین

کے پاس آئے اور کہا آپ نے تو اے امیر المومنین! خود ہی ملاحظہ کر لیا ہے کہ ہم پر عہدِ عثمان میں کیا کیا تکلیفیں اور جفائیں رہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہمیشہ عثمان اپنے قبیلہ کا خیال کرتے رہے۔ اب خدا نے وہ دن دکھایا ہے کہ آپ خلیفہ مقرر ہو گئے ہیں، لہذا ہمارا بھی خیال کیجیے اور بعض مقامات کا گورنر ہمیں بھی بنا دیجیے۔ آپ نے فرمایا مقدرات پر راضی رہو اور مجھے اس معاملہ میں سوچنے کا موقعہ دو، مگر یہ جان لو کہ میں امانت میں اس کو شریک نہیں کرتا جس کے دین و امانتداری پر مجھے پورا پورا اعتماد و اعتبار نہ ہو اور اس کو بھی شریک نہیں کرتا جس کے دل میں کھوٹ دیکھتا ہوں، یہ جواب سن کر یہ لوگ ایک حد تک مایوس ہو گئے اور امیر المومنین سے عمرہ کی اجازت لے کر مدینہ سے باہر جانا چاہا (ظاہر ہے کہ یہ گفتگو اس معاویہ کے خط کی بنا پر ہوئی تھی۔ اور دونوں کوفہ وبصرہ کے خواہاں تھے، اور ان ہی دونوں مقامات کے لیے معاویہ نے لکھا بھی تھا) جب امیر علیہ السلام کی طرف سے بالکل ناامیدی ہو گئی، تو ان لوگوں نے عمرہ کا بہانہ کیا اور فوراً بصرہ پہنچے (جہاں جنگِ جمل قائم ہوئی) امیر المومنین علیہ السلام نے ان دونوں کی التجا کے متعلق مغیرہ بن شعبہ سے رائے لی اور اس نے یہی رائے دی تھی کہ جب تک آپکی اساس خلافت اچھی طرح مستحکم نہ ہو جائے یہ ضرور کیجیے ایک کو بصرہ اور دوسرے کو کوفہ دے دیجیے۔ مگر اس کے بعد جب آپ نے پھر ایک دفعہ ابن عباس سے اس معاملہ میں رائے لی تو انھوں نے مخالفت کی

اور کہا کہ بصرہ و کوفہ ہی دو جگہیں تو پائیگاہ خلافت اور سرچشمۂ خلافت میں وہاں خزانے ہیں اور دولت ہے اور طلحہ و زبیر کی دلی حالت سے آپ خوب واقف ہیں۔ میں تو ان کی حرکتوں سے مامون نہیں۔ یہ وہاں جاکر کچھ نہ کچھ انقلاب ضرور پیدا کریں گے۔ لہٰذا کوفہ و بصرہ انھیں سپرد نہ کیجیے[۱] یہ حضرات مایوس ہوکر حضرت علیؑ سے عمرہ کی اجازت لے کر مکہ روانہ ہوئے۔

حضرت عمر کی سیاست اور اس کا نتیجہ

تعجب انگیز امر یہ ہے کہ حضرت زبیر اور حضرت طلحہ جو شوریٰ کمیٹی کی تشکیل سے پہلے ہمیشہ حضرت علی علیہ السلام کے حامی رہے۔ حضرت ابوبکر سے رشتہ داریوں کے باوجود انھوں نے خلافتِ حضرت ابوبکر کو تسلیم نہیں کیا اور ان کی بیعت نہیں کی اور حضرت ابوبکر کے حضرت عمر کو نامزد کرنے میں ان کی مخالفت کی۔ کیا وجہ ہے کہ قتل حضرتِ عثمان کے بعد انھوں نے حضرت علی علیہ السلام کی اس قدر شدید مخالفت کی؟ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ ان کے شوریٰ کمیٹی میں خلافت کے حقداروں میں شامل کیے جانے کا نتیجہ تھا، اب تشکیل شوریٰ سے پہلے ان کے دل میں حضرت علی علیہ السلام کی عظمت تھی، وہ انھیں اپنے سے اشرف و اعلیٰ سمجھتے تھے، مگر بانیٔ شوریٰ نے اپنی سیاست سے قلبِ ماہیت کر دیا تھا، اور اب وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ ہم میں اور علیؑ میں کیا فرق ہے؟ جس عہدہ

[۱] سلسبیلِ فصاحت ص ۹۵ و ص ۹۶

کے لیے علیؑ کا نام تجویز کیا جاسکتا ہے ہمارا نام بھی تجویز ہوتا ہے۔ اس لیے علیؓ کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ اپنی خلافت کے زمانے میں ہمیں اپنا شریکِ حکومت قرار دے اور ہمارے تمول میں جسے ہم نے فتوحات میں حاصل کیا ہے زیادتی کا باعث ہو۔ اور حضرت علیؓ کو ہمارے مشورہ سے حکومت کرنا چاہیے۔

اُم المومنین حضرت عائشہ

عائشہ نام، حمیرا لقب، ام عبداللہ کنیت، خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر کی صاحبزادی ہیں، ماں کا نام زینب تھا۔ اُم رومان کنیت تھی اور قبیلۂ غنم بن مالک سے تھیں۔

کنیت اُمِ عبداللہ

حضرت عائشہ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ابن الاعرابی نے لکھا ہے کہ ایک ناتمام بچہ ساقط ہوا تھا، اور اسی کے نام پر انھوں نے کنیت رکھی تھی۔ لیکن یہ قطعاً غلط ہے۔ حضرت عائشہ کی کنیت ام عبداللہ ان کے بھانجے عبداللہ ابن زبیر کے تعلق سے تھی جن کو انھوں نے متبنیٰ بنا لیا تھا[۱]

حضرت عائشہ بعثت کے چار برس بعد شوال کے مہینے میں پیدا ہوئیں۔

---

[۱] سیر الصحابیات ص ۲۷

سنہ ۱۰ بعثت میں ان کا رسولؐ سے عقد ہوا اس وقت حضرت عائشہ چھ برس کی تھیں، سنہ ۱ نبوی جب کہ حضرت عائشہ کی عمر ۹ برس تھی باپ کے گھر سے رخصت ہو کر کاشانہ نبوت میں آئیں۔

حضرت عائشہ نے غزوہ اُحد میں شرکت کی۔ صحیح بخاری میں حضرت انس سے منقول ہے کہ میں نے عائشہ اور ام سلیم کو دیکھا کہ مشک بھر بھر کر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں[1]

آپ کی فضیلت میں ابوموسیٰ اشعری صحابی رسولؐ سے جو منحرفین بیعت علیؑ میں سے ایک ہیں اور حکم جنگ صفین ہیں۔ روایت ہے۔

فضل عائشۃ علی النساء کفضل الثرید علیٰ سائر الطعام

"حضرت عائشہ کی فضیلت تمام عورتوں پر یوں ہے، جیسے ثرید کی افضلیت تمام کھانوں پر ہے۔" ثرید کلام عرب میں اس روٹی کو کہتے ہیں جو شوربے میں کوٹ کے بھگوئی جائے اور کھائی جائے۔

رسول اللہؐ کی پیشین گوئی

صاحب استیعاب لکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے اپنی بیویوں سے خطاب فرمایا کہ تم میں سے کون گھنے بالوں والے اونٹ پر سوار ہونے والی ہے جس کے گرد کشتوں کا انبار ہوگا۔ اس حدیث کو لکھنے کے بعد صاحب استیعاب لکھتے ہیں کہ یہ حدیث نبوت رسولؐ اور علم غیب نبیؐ کو واضح کر

[1] بخاری جلد ۲ ص ۵۸۱

ہوئی ہے۔ اور اس کے راوی عاصم بن قدامہ موثق راوی ہیں اور سندیں اس روایت کی بہت مشہور و مستند ہیں جن کے ذکر کی ضرورت نہیں بلکہ وہ وظیفہ جو ازواج نبی کو ملا کرتا تھا حضرت نے اس پر دو ہزار کی زیادتی صرف حضرت عائشہ کے لیے اس وجہ سے کی کہ آپ رسول اللہ کو بہت محبوب تھیں[۲]

رسول اللہ پر آیت تخییر نازل ہوئی۔ اس آیت کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ اب اپنی ان ازواج کو مطلع فرمائیں کہ دو چیزیں تمھارے سامنے ہیں، دنیا اور آخرت۔ اگر تم دنیا چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم خدا و رسول اور ابدی راحت کی طلبگار ہو تو خدا نے نیکوکاروں کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔ چونکہ حضرت عائشہ ان تمام معاملات میں پیش پیش تھیں آپ نے ان کو ارشادِ الٰہی سے مطلع فرمایا۔ انھوں نے کہا کہ میں سب کچھ چھوڑ کر خدا اور رسول کو لیتی ہوں۔ تمام اور ازواج نے بھی یہی جواب دیا[۳]

سورۂ تحریم کا قصہ مشہور ہے۔ جو کتب تفاسیر و سیر میں موجود ہے اس میں حضرت ام المومنین عائشہ و حضرت ام المومنین حفصہ کے لیے ان الفاظ میں ارشادِ باری ہوا تھا:۔

---

[۱] استیعاب جلد ۴ صفحہ ۱۶۱ [۲] مستدرک، سیر الصحابیات صفحہ ۲۶

[۳] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۲، صحیح مسلم باب الایلاء، سیر الصحابیات صفحہ ۲۳

"ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما ذان تظاھرا علیہ فان اللہ ھو مولاہ وجبریل وصالح المومنین والملائکۃ بعد ذالک ظہیر"

(سورۂ تحریم آیت ۴ پ ۲۸ ع ۲۰)

"(اے عائشہ وحفصہ) اگر تم دونوں توبہ کرو تو خیر، تم دونوں کے دل ٹیڑھے ہیں، اگر تم دونوں رسول اللہؐ کی مخالفت میں ایک دوسری کی اعانت کرتی رہو گی، تو خدا، جبرئیلؑ اور صالح المومنین ان کے مددگار ہیں اور ان کے علاوہ تمام فرشتے مددگار ہیں۔"

واقعۂ ایلاء کے متعلق سیر الصحابیات کے سنی مؤلف لکھتے ہیں:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زاہدانہ زندگی بسر فرماتے تھے دو دو مہینہ گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، آئے دن فاقے ہوتے رہتے تھے، ازواج مطہرات گو شرفِ صحبت کی برکت سے تمام ابنائے جنس سے ممتاز ہو گئی تھیں تاہم بشریت بالکل معدوم نہیں ہو سکتی تھی بخصوصاً وہ دیکھتی تھیں کہ فتوحات اسلام کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے۔ اور غنیمت کا سرمایہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اس کا ادنیٰ حصہ بھی ان کی راحت و آرام کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ ان واقعات کا اقتضا تھا کہ ان کے صبر و قناعت کا جام لبریز ہوتا جاتا تھا۔"

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر و عمر خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے

دیکھا کہ بیچ میں آپ ہیں، اِدھر اُدھر بیویاں بیٹھی ہیں۔ اور توسیع نفقہ کا تقاضہ کر رہی ہیں، دونوں اپنی صاحبزادیوں کی تنبیہہ پر آمادہ ہو گئے لیکن انھوں نے عرض کیا، کہ ہم آئندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زائد مصارف کی تکلیف نہ دیں گی[1]"

تاریخ طبری کی روایت میں خود حضرت عائشہ بنفسِ نفیس ناقل ہیں، کہ رسول اللہؐ جنت البقیع سے پلٹے (آپ وہاں روزانہ اہلِ بقیع کے لیے استغفار کرنے تشریف لے جایا کرتے تھے، اور یہ کام آپ کا مرتے دم تک جاری رہا) جب گھر پہنچے تو مجھے اس حال میں پایا، کہ میں دردِ سر میں مبتلا تھی اور ہائے ہائے کر رہی تھی۔ رسول اللہؐ نے کہا، خدا کی قسم اے عائشہ! میرے سر کی بھی یہی حالت ہے۔ پھر فرمایا، کیوں عائشہ تمھارا کیا نقصان ہے کہ اگر تم مجھ سے پہلے مر جاؤ، اور میں تمھاری تجہیز وتکفین کروں اور تمھارے جنازے کی نماز پڑھاؤں۔ اور تمھیں دفن کروں۔ عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے کہا، اگر یہ ہو گیا میں دیکھ رہی ہوں کہ میرے مرنے کے بعد تم میرے ہی گھر میں بعض بیویوں کو لے کے رہتے ہو۔ یہ سنکر رسول اللہؐ ہنس دیے[2]

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ گو میں نے خدیجہ کو نہیں دیکھا مگر مجھے جس قدر ان پر رشک آتا تھا کسی اور پر نہیں آتا تھا، جسکی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے اس پر آپ کو رنجیدہ کیا۔ لیکن آپ نے فرمایا، خدا نے مجھ کو ان کی محبت دی ہے[3]۔

---

[1] سیر الصحابیات ص۲۲ [2] سلسبیلِ فصاحت ص۲۳، بحوالہ تاریخ طبری
[3] صحیح مسلم جلد ۲ ص۲۳۳، سیر الصحابیات ص۱۱

ایک دفعہ حضرت خدیجہ کے انتقال کے بعد ان کی بہن ہالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملنے آئیں۔ اور استیذان کے قاعدہ سے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ ان کی آواز حضرت خدیجہ سے ملتی تھی۔ آپ کے کانوں میں آواز پڑی تو حضرت خدیجہ یاد آگئیں اور جھجک اٹھے، اور فرمایا "ہالہ ہونگی" حضرت عائشہ بھی موجود تھیں، ان کو نہایت رشک ہوا، بولیں کہ "آپ کیا ایک بڑھیا کو یاد کیا کرتے ہیں جو مر چکیں اور خدا نے ان سے اچھی بیویاں آپ کو دیں" صحیح بخاری میں یہ روایت یہیں تک ہے لیکن استیعاب میں ہے کہ اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "ہرگز نہیں، جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو انھوں نے تصدیق کی، جب لوگ کافر تھے وہ اسلام لائیں۔ جب میرا کوئی معین نہ تھا تو انھوں نے میری مدد کی، اور میری اولاد ان ہی سے ہوئی"[۱]

خدا معلوم کیا وجہ تھی کہ حضرت عائشہ حضرت علی مرتضیٰ کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں اور نہ ان کا ذکرِ خیر کبھی انھیں اچھا معلوم ہوا۔ چنانچہ مرضِ رسولؐ میں جو واقعہ پیش آیا وہ اس بات کا شاہد ناطق ہے، اسے بخاری نے بھی اپنی صحیح میں درج کیا ہے۔ اور دیگر مؤرخین نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ مورخ ابنِ جریر طبری اس واقعہ کو بایں الفاظ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:۔

---

[۱] بخاری، باب تزویج النبیؐ خدیجہ وفضلہا، وسیر الصحابیات ص۱۱ و ص۱۲

"حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ جب رسولؐ کا مرض بڑھا اور آپ پر بیماری کی زیادتی ہوئی تو آپ نے اپنی دوسری بیویوں سے یہ اجازت چاہی کہ آپ بیماری کے دن حضرت عائشہ کے گھر بسر کریں اور وہیں آپ کی تیمار داری ہو، چنانچہ سب بیویوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ آپ اس وقت میمونہ کے گھر میں تھے، جب اجازت مل گئی تو آپ وہاں سے نکلے، اگر چونکہ شدت مرض تھی لہٰذا دو آدمیوں کے سہارے سے نکلے، ایک تو فضل ابن عباس تھے اور دوسرا ایک اور شخص تھا" [۱]

یہ بیان حضرت عائشہ کا ہے اور وہی اپنے الفاظ کی ذمہ دار ہیں۔ عبیداللہ کہتے ہیں کہ میں نے عائشہ کے اس بیان کی خبر عبداللہ ابن عباس کو پہنچائی تو انھوں نے کہا جانتے ہو یہ دوسرا آدمی کون تھا جس کا نام حضرت عائشہ نے نہیں لیا، اور چھپایا، میں نے کہا نہیں میں تو نہیں جانتا، عبداللہ ابن عباس نے کہا، یہ علیؑ ابن ابی طالب تھے۔

اس روایت کو بخاری نے بھی اپنے طرق سے نقل کیا ہے، مگر اس میں فضل ابن عباس کی بجائے عباس ابن عبدالمطلب کا نام ہے [۲]

علامہ ابن عبدہ شارح نہج البلاغہ امیرالمومنین علیہ السلام کے ایک نامہ نامی کی شرح میں لکھتے ہیں :-

"حضرت عائشہ نے جبکہ حضرت عثمان منبر پر تھے، رسولؐ

[۱] طبری جلد ۳ صہ ۱۹۱ [۲] بخاری جلد ۳ صہ ۶۳

کی نعلین اور قمیص نکالی اور پکار کے کہا کہ یہ دونوں رسولؐ کی جوتیاں اور ان کی قمیص ہے جو ابھی پرانی نہیں ہوئی اور تم نے اے عثمان رسولؐ کے دین کو (اس تھوڑی سی مدت میں) بدل دیا، اور ان کی سنت کو متغیر کر دیا، حضرت عثمان اور حضرت عائشہ میں سخت کلامی ہوئی آخر حضرت عائشہ نے کہا اس نعثل کو قتل بھی کر ڈالو، نعثل کہہ کر حضرت عائشہ نے جناب عثمان کو ایک معروف و مشہور شخص سے تشبیہ دی ہے [۱]

مجمع البحار گجراتی اور نہایہ ابن اثیر میں ہے کہ مصر میں ایک لمبی داڑھی والے آدمی کا نام نعثل تھا، اسی کی تشبیہ سے حضرت عثمان کو ان کے دشمن نعثل کہتے تھے اور جب حضرت عائشہ حضرت عثمان سے ناخوش ہو کر مکہ معظمہ چلی گئیں تو حضرت عثمان کی نسبت فرماتی تھیں کہ قتل کر دو اس نعثل کو، خدا قتل کرے اس نعثل کو [۲]

کتاب الامامت والسیاسۃ میں ابن قتیبہ نے بھی لکھا ہے کہ حضرت عائشہ حضرت عثمان کو محاصرہ میں چھوڑ کر مدینہ روانہ ہوئیں اور باوجود اس کے کہ مروان بن الحکم نے یہ کہہ کے روکا کہ اگر آپ سفر نہ کریں تو شاید حضرت عثمان کی جان بچ جائے، مگر پھر بھی آپ نہ رکیں، یہاں تک کہ حضرت عثمان مدینہ میں قتل ہو گئے [۳]

---

[۱] شرح نہج البلاغہ علامہ ابن عبدہ بحوالہ سلسبیل فصاحت ص۱۲۳ [۲] مجمع البحار گجراتی نہایہ ابن اثیر تاریخ احمدی ص۱۵۱ [۳] کتاب الامامۃ والسیاسۃ بحوالہ سلسبیل فصاحت ص۱۲۵

حضرت عائشہ کے مدینہ سے چلے جانے کے بعد جب اتنی مدت ہوئی کہ حضرت عثمان قتل ہو گئے تو آپ پھر مدینہ کو چلیں اور راستے میں ام کلاب سے ملاقات ہوئی - اس نے امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالب کی بیعت اور تمام واقعات کا تذکرہ کیا، اس کے متعلق مورخ ابن جریر طبری لکھتا ہے :-

"جب حضرت عائشہ نے حضرت علیؑ کی بیعت کا سنا تو کہا (ارے یہ ہو گیا) کاش آسمان زمین پر پھٹ پڑتا، اگر ایسا ہوا کہ تمھارے آدمی (یعنی امیرالمومنین علیؑ) کی بیعت ہو گئی اچھا مجھے مکہ پلٹاؤ، مکہ پلٹاؤ اور آپ یہ کہتی جاتی تھیں کہ عثمان مظلوم قتل ہو گئے اور خدا کی قسم میں ان کا انتقام ضرور لوں گی۔"

ام کلاب نے کہا، کیوں انتقام لیجئے گا، کیونکہ سب سے پہلے جس نے حضرت عثمان کے خلاف پروپگنڈا کیا وہ آپ ہی ہیں اور آپ یہ کہتی تھیں کہ اس نعثل کو قتل کر ڈالو کیونکہ یہ کافر ہو گیا ہے - حضرت عائشہ نے فرمایا کہ لوگوں نے ان سے توبہ بھی چاہی اور بعد توبہ قتل بھی کر ڈالا - ہاں ہاں میں بھی عثمان کو نعثل کہتی تھی اور دوسرے لوگ بھی انھیں نعثل کہتے تھے، لیکن جو کچھ میں اب کہہ رہی ہوں (یعنی عثمان مظلوم قتل ہوئے اور میں ان کا بدلہ لوں گی) وہ میرے پہلے قول سے بہتر ہے۔

یہ سنکر ام کلاب نے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے :-

منک البدا ومنک الغیر	منک الریاح ومنک المطر
وانت امرت بقتل الامام	قلت لنا انہ قد کفر

فمنا الصناع فی قتله | وقاتله عندنا من امر
ولم یسقط السقف من فوقنا | ولم ینکسف شمسنا والقمر
وقد بایع الناس ذاتدراء | یزیل الشبا ویقیم الصعر
ویلبس للحرب اثوابها | وما من وفی مثل ما قد غدر

"(اے ام المومنین!) آپ ہی کی طرف سے ابتدا ہوئی اور آپ ہی کی طرف سے پہلے ارادہ میں تبدیلی ہوئی۔ آپ ہی سے مخالفت کی ہوائیں بھی چلیں اور آپ ہی کی طرف سے خون کی بارش بھی ہوئی

(ع اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست)

آپ نے ہی امام (عثمان) کے قتل کا حکم بھی دیا اور ہم سب سے کہا کہ وہ کافر ہو گئے ہیں، اچھا ہم نے آپ کے حکم سے ڈر کے انھیں قتل کیا اور آپکی اطا[illegible]ت کی مگر ہمارے نزدیک تو اصلی قاتل وہی ہے جس نے انکے قت[illegible]ان نافذ کیا، آپ اسوقت علیؑ کی بیعت کا سنکر یہ فرماتی ہیں کہ کاش [illegible]ان زمین پر پھٹ پڑتا، حالانکہ حضرت عثمان کا قتل آپکے حکم سے تھا۔ نہ ہم پر چھت گری نہ سورج اور چاند گہنائے۔ لوگوں نے اس شخص کی بیعت کر لی جو صاحبِ عزت و صاحبِ جنگ و دفاع ہے جو تلوار کی باڑھ کو اپنے سے دور کرتا ہے اور کجی او گمراہی کو ٹھیک کر دیتا ہے وہ شخص جو لڑائی کے کپڑے پہن کر آجاتا ہے اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ وفا کرنے والے غدر کرنے والوں کے برابر نہیں۔" [1]

---

[1] تاریخ طبری ص۱۷۲ بحوالہ سلسبیل فصاحت صہ۱۲۵ و صہ۱۲۶

جنگِ جمل

جنگِ جمل کے اسباب
قصاصِ خونِ حضرت عثمان کا سٹنٹ

پروفیسر سید عبد القادر مرحوم و پروفیسر شجاع الدین صاحب لکھتے ہیں:۔

۱۔ قصاصِ خونِ عثمان کا جذبہ

"حضرت عائشہ حج کر کے مدینہ واپس آرہی تھیں کہ انھیں راستہ میں شہادت حضرت عثمان کی خبر ملی، اس پر وہ مکہ واپس چلی گئیں حضرت طلحہ و زبیر مدینہ میں حضرت علیؑ کی بیعت کرنے کے باوجود مکے میں آگئے اور خونِ عثمان کا بدلہ لینے کی تیاریاں کرنے لگے۔ مکہ کے عامل عبد اللہ بن حضرمی اور مروان وغیرہ خاندان بنی امیہ کے کچھ افراد اسی خیال کے تھے، یہ تمام لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اور عہد کیا، کہ جیسے بھی ہو مظلوم خلیفہ کا خون رائیگاں نہ جانے دیا جائے مکہ سے اتحادی عازم بصرہ ہوئے۔ ان کے ہمراہ تین ہزار سپاہی تھے جن میں ایک ہزار مکہ اور مدینہ کے باشندے تھے، بصرہ پہنچ کر

ان لوگوں نے شہر پر قبضہ کر لیا اور چھ سو مسلمانوں کو مخالفین عثمان سمجھ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان اتحادیوں کی سخت گیری اور اندھا دُھند پکڑ دھکڑ سے شہر میں سنسنی پھیل گئی اور حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ لوگ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر لرزاں و ترساں تھے کہ دیکھیں عالمِ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ اسلامی مملکت میں ایسا موقعہ پہلے کبھی نہیں آیا تھا، کہ مسلمان آپس میں یوں برسرِ پیکار ہوں۔

۲۔ حضرت طلحہ و زبیر کی خواہشِ خلافت

حضرت علیؓ کی بیعت کر لینے کے بعد حضرت طلحہ و زبیر کا مکہ چلے جانا اور خونِ عثمان کے قصاص کے نام پر بہت سی فوج جمع کر لینا ظاہر کرتا ہے کہ حصولِ خلافت کی طرف ان کا میلان تھا، یہ دونوں بزرگوار قدیمی مسلمانوں میں سے تھے، اور حضرت عمرؓ نے بسترِ مرگ پر مسئلہ خلافت کو حل کرنے کے لیے چھ آدمیوں پر مشتمل جو کمیٹی بنائی تھی اس کے بھی رکن تھے۔ اتحادی لشکر مدینہ سے روانہ ہُوا تو یہ سوال بھی منظرِ عام پر آیا کہ فتح کی صورت میں طلحہ و زبیر میں سے کس کو خلیفہ بنایا جائے۔ مگر حضرت عائشہؓ نے اس سوال کو قبل از وقت قرار دے کر رد کر دیا، اور کہا کہ خلافت کا فیصلہ اہلِ مدینہ ہی کریں گے۔ مگر سر دست عبداللہ بن زبیر جو ان کی بہن

کے فرزند تھے نماز پڑھائیں گے۔[1]

قصاص خونِ عثمان تو ایک موقف تھا، ایک سٹنٹ تھا، جسے اختیار کیا گیا، ورنہ اصل مقصد حضرت طلحہ اور زبیر کی اپنے لیے خواہشِ خلافت تھی اور حضرت عائشہ کا مقصود اپنے محبوب بھانجے، اپنے متبنی حضرت عبد اللہ بن زبیر کے لیے خلافت حاصل کرنا تھا، اس لیے انھوں نے اس موقعہ پر وہی روش اختیار کی جو انھوں نے ایامِ مرضِ رسول اللہؐ میں حضرت ابوبکر کے پیش نمازی کا فریضہ سپرد کر کے ان کی خلافت کی دلیل قرار دیا تھا، جس پر ہم اس تاریخ کے پہلے حصہ میں بحث کر چکے ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ حضرت عائشہ اپنے اس بھانجے عبد اللہ ابن زبیر سے بہت مانوس تھیں اور آپ نے ان کی خلافت کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، زبیر کو جو ان کے باپ تھے حضرت عائشہ کی اس تمنا کو پورا کرنے کے لیے اپنے بیٹے کے پیچھے نماز پڑھنی پڑی۔ اس لیے کہ نماز ہی پڑھانا اس وقت خلافت کے حصول کے لیے ایک رکنِ عظیم تھا۔ اس حقیقت کے انکشاف کے لیے ابن قتیبہ کی الامامت والسیاست کا مطالعہ کیجیے۔

حضرت طلحہ و زبیر کا مقصد حصولِ خلافت تھا، قصاص خونِ عثمان نہیں تھا، چنانچہ جب جنگِ جمل کے لیے لشکر جا رہا تھا تو اثنائے راہ ان سے سعید بن عاص کی ملاقات ہوئی۔ اور انھوں نے دریافت کیا کہ اگر تم

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اول عہدِ رسالت وخلافتِ راشدہ کے حالات ص۱۵۵ و ص۱۵۶

دونوں جنگ میں کامیاب ہو گئے تو خلیفہ کس کو بناؤ گے۔ طلحہ اور زبیر نے کہا کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہو گا، جسے لوگ اختیار کرلیں۔ سعید نے کہا اگر میری رائے یہ ہے کہ حضرت عثمان کے لڑکوں میں سے کسی ایک کو بناؤ کیونکہ تم ان کے باپ کے انتقام کے لیے اٹھے ہو۔ سعید کے جواب میں انھوں نے کہا، سبحان اللہ شیوخ مہاجرین کو چھوڑ کر خلافت کو ان کے لڑکوں میں قرار دیا جائے۔ سعید نے یہ بھی کہا، تو کیا یہ کوشش ہماری نہیں کہ خلافت بنی عبد مناف سے نکال لی جائے۔[1]

اس وقت جنگِ جمل کے لیے صفیں جمیں تو امیرالمومنین علی مرتضیٰ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر صفوں سے باہر نکلے اور زبیر کو بلایا۔ جب دونوں کا آمنا سامنا ہُوا تو آپ نے زبیر سے پوچھا، کہاں آئے؟ کہا میرے آنے کا باعث آپ ہیں اور میں آپ کو اپنے سے زیادہ خلافت کا اہل نہیں پاتا اور نہ آپ مجھ سے زیادہ خلافت کے لیے اولیٰ اور افضل ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا۔ بعدِ عثمان تم اس کے اہل نہیں۔ ہم تم کو اولادِ عبدالمطلب میں جانتے تھے، یہاں تک کہ تمھارا بیٹا جو بُرا بیٹا ہے پیدا ہُوا۔ جوان ہُوا اور بڑھا اور اس نے ہم کو تم سے اور تم کو ہم سے چھڑا دیا۔[2]

اس گفتگو سے صاف ظاہر ہے کہ جنگِ جمل کا قیام انتقامِ خونِ حضرت عثمان کے لیے نہیں تھا۔

---

[1] تاریخ طبری صـ ۱۹۸ [2] تاریخ طبری صـ ۲۰۴

٭ اس مطلب کا اظہار کہ جناب علی مرتضیٰ خلافت سے ہٹیں اور پھر بزمِ شوریٰ قائم ہو اور جس کو لوگ چُنیں اور انتخاب کریں وہی خلیفہ بنایا جائے اس گفتگو سے بھی معلوم ہوتا ہے جو حضرت علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام اور حضرت طلحہ کے درمیان روزِ جنگِ جمل ہوئی۔ مورخ ابن قتیبہ یوں لکھتے ہیں :—

"طلحہ نے امیرالمومنین علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ نے حضرت عثمان کے قتل کا حکم دیا تھا، آپ نے فرمایا، اللہ شاہد ہے کہ میں نے ایسا حکم نہیں دیا، طلحہ نے کہا پھر خلافت سے ہٹیے اور اس کو پھر بزمِ شوریٰ میں پیش کیجیے۔ جیسا کہ ہوا تھا، اگر اصحاب شوریٰ آپ پر راضی ہوں تو ہم بھی راضی ہوں گے، اور اگر آپ کے سوا کسی دوسرے پر راضی ہوں تو آپ کی حیثیت ایک مسلمان کی حیثیت ہوگی۔ اور بس۔ اس پر امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا تو کیا تم نے میری بیعت نہیں کی، اور یہ بیعتِ اطاعت کے ساتھ بغیر جبر و اکراہ تھی، طلحہ نے کہا، میں نے بیعت کی مگر یوں کہ تلوار میری گردن پر تھی۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تمھیں یہ معلوم نہیں کہ میں نے بیعت کے لیے کسی پر جبر نہیں کیا، اور اگر میں زبردستی بیعت لیتا اور لوگوں کو مجبور کرتا تو سعد بن ابی وقاص، عبداللہ ابن عمر اور محمد بن مسلمہ سے جبراً بیعت لیتا۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ ان لوگوں نے میری بیعت

سے انکار کیا تو میں نے ان پر جبر نہیں کیا بلکہ ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا۔

طلحہ نے کہا، ہم چھ آدمی بزم شوریٰ میں تھے، دو مر گئے (عبدالرحمٰن و عثمان) اور ہم تین کبھی آپ کی خلافت پر راضی نہیں (اب بھی ہماری کثرت ہے) اور ہم تین آدمی باقی ہیں سعد بن ابی وقاص، زبیر اور میں (گویا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی خلافت پر ہماری کثرت رائے عدم رضا ظاہر کرتی ہے، لہٰذا آپ خلافت کے مستحق نہیں، اس سے الگ ہٹیے اور ہمیں خلیفہ بننے دیجیے)[1]

ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ :۔

" جنگِ جمل کا مقصد انتقامِ خونِ حضرت عثمان نہیں بلکہ حصولِ خلافت تھا" مگر ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

حضرت عمر نے جو شوریٰ کی تشکیل میں سیاسی روش اختیار کی تھی اس کے تلخ نتائج سے حضرت علیؑ علیہ السلام کو دوچار ہونا پڑا۔

باقی جو پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم اور پروفیسر شجاع الدین نے جنگ جمل کے اسباب میں عبداللہ ابن سبا کے پیروؤں کی ریشہ دوانیاں لکھی ہیں جدید ترین تحقیق یہ ہے کہ عبداللہ ابن سبا ایک افسانوی کردار ہے۔ اس کے متعلق طبری کی صرف ایک روایت ہے۔ اور وہ یزید الفقعی کی ہے ایک خبر احاد پر کسی ایسی شخصیت کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا جو قرنِ اولیٰ کے

---

[1] الامامۃ والسیاستہ ص۴۲ و ص۵۷

مسلمانوں پر اس طرح اثر انداز ہو کہ اتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دے یہ صورت جو حضرت عثمان کی سیرت کے دفاع کے لیے اختیار کی گئی، قرنِ اولی کے مسلمانوں کی تخفیف و توہین کا سبب ہے۔ عبداللہ ابن سبا کے متعلق یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کب اور کہاں فوت ہُوا۔

حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کے متعلق حضرت مغیرہ بن شعبہ کی رائے

مغیرہ بن شعبہ جو شریکِ کارِ خلافت تھے انھوں نے سعید بن عاص کے ہمراہ حضرت عائشہ اور ان کے ساتھیوں سے راہ میں ملاقات کی جبکہ وہ جنگِ جمل کے لیے جا رہی تھیں اور کہا:۔

"کدھر ام المومنین! آپ کہاں تشریف لے جاتی ہیں؟ فرمایا بصرہ جا رہی ہوں۔ کہا بصرہ جا کے کیا کیجیے گا؟ فرمایا، خونِ عثمان کا انتقام لوں گی، کہا، اور یہ عثمان کے قتل کرنے والے تو آپ کے ساتھ ہی ہیں (ان کو کاہے کو قتل نہ کر دیجیے، جنگ قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے) پھر مروان کے پاس مغیرہ گئے جو اس لشکر میں موجود تھے، کہا، بھائی جان تم کہاں جاتے ہو؟ کہا بصرہ، کہا بصرہ میں کیا کرو گے؟ کہا خونِ عثمان کا انتقام لیں گے اور قاتلانِ عثمان کو قتل کریں گے۔ تو کہا کہ قاتلینِ عثمان تو تمھارے ساتھ ہی ہیں، یقیناً ان ہی دو آدمیوں نے یعنی طلحہ و زبیر نے حضرت عثمان کو قتل کیا، کیونکہ وہ خلافت اپنے لیے چاہتے تھے، جب

مغلوب ہوئے تو یوں بات بنائی کہ خون کو خون سے دھوئیں گے، اور گناہ کو توبہ سے بدلیں گے۔ پھر مغیرہ بن شعبہ نے کہا، اے گروہ مردم، اگر تم اپنی ماں ام المومنین کے ساتھ نکلے ہو تو پلٹ جاؤ، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم خونِ عثمان کا انتقام لینے نکلے ہو تو اس وقت جو لوگ تمہارے رئیسِ لشکر ہیں، ان ہی نے تو عثمان کو قتل کیا ہے۔"[1]

---

[1] الامامۃ والسیاست صفحہ ۶۳

جنگ کے لیے اصحابِ جمل کی جدوجہد

خط و کتابت اور مکالمات

حضرت طلحہ اور زبیر نے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف جنگ کرنے کے
لیے جو خطوط لکھے تو ان خطوط میں بعض خطوط عمائد بصرہ کے نام تھے، جب طلحہ و زبیر
کے خطوط ان لوگوں کو پہنچے تو زیاد بن مضر اور نعمان وغیرہ پر عجیب اثر ہوا۔

زیاد بن مضر و نعمان وغیرہ پر اثر

زیاد بن مضر اور نعمان وغیرہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا:۔
"ہمیں اور اس قبیلہ قریش کو کیا ہو گیا ہے کیا یہ لوگ چاہتے ہیں
کہ ہمیں اسلام میں داخل ہونے کے بعد اسلام سے خارج کر دیں، اور
شرک سے نکلنے کے بعد پھر اس میں شامل کریں۔ انھوں نے عثمان
کو قتل کیا اور علیؑ کی بیعت کی، انکا نفع و نقصان انکے ساتھ ہے۔"
جب حضرت عائشہ نے بصرے کا قصد کیا تو زید بن صوحان کو خط لکھا:۔

حضرت عائشہ کا زید بن صوحان کو خط

عائشہ ام المومنین کی طرف سے فرزند مخلص زید بن صوحان کو۔ بعد سلام

سلہ الامامۃ والسیاسۃ صہ ۶۱

معلوم ہو کہ تمھارے باپ زمانۂ جاہلیت میں بھی سردار رہے اور عہدِ اسلام میں بھی اور تم اپنے باپ کے اس طرح قدم بقدم ہو جس طرح گھوڑ دوڑ میں اسپ مصلی اسپ سابق سے نزدیک یا ملحق ہوتا ہے۔ تم نے حضرت عثمان کا وہ مصیبت خیز واقعہ سنا ہی ہو گا جو اسلام میں پیش آیا اب ہم تمھاری طرف آرہے ہیں اور ہمارے آنے سے تمھاری پوری تشفی ہو جائے گی۔ کیونکہ مشاہدہ خبر سے زیادہ تشفی بخش ہوتا ہے۔ پس جب میرا یہ خط تمھارے پاس پہنچے تو لوگوں کو علیؑ ابن ابی طالب کے ساتھ شریک ہونے سے روکو اور تا حکم ثانی اپنی جگہ پر موجود رہو،

والسلام "

زید بن صوحان نے اس کے جواب میں لکھا۔

زید بن صوحان کا جواب

زید بن صوحان کی جانب سے ام المومنین عائشہ کو، بعد سلام معلوم ہو کہ ایک امر کا تم کو حکم دیا گیا ہے اور ایک امر کا ہم کو۔ تم کو تو خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ اپنے گھر میں بیٹھی رہو اور ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ مخالفین سے اس وقت تک قتال کریں کہ فتنہ فرو ہو جائے۔ پس تعجب ہے کہ جس بات کا تم کو حکم دیا گیا ہے اسے بھی تم نے ترک کیا اور جس بات کا ہم کو حکم دیا گیا ہے اس سے بھی تم روک رہی ہو۔ والسلام[۱] "

---

[۱] عقد الفرید، تاریخ اعثم صـ۲۰۴، و صـ۱۷۵

عبداللہ بن خلف کا طلحہ و زبیر سے خطاب

عبداللہ بن خلف جو جنگ جمل میں حضرت عائشہ ہی کی طرف سے لڑکر قتل
ہو گئے انھوں نے بھی طلحہ و زبیر کو یوں مخاطب کیا ہے:۔
"تم دونوں نے قتل عثمان کے لیے جس جس طرح لوگوں کو ابھارا
وہ انکار سے دفع نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس میں تمھارا کوئی عذر ہی قبول ہو
سکے گا، وہ شخص جو تمھیں صرف مدد نہ کرنے کا الزام دیتا ہے اور قتل
عثمان کا ملزم قرار نہیں دیتا، وہ تمھارے ساتھ بہت بڑا احسان کرتا ہے
اور تمام لوگوں نے علیؑ کی بیعت کر لی اور کل تم معاملہ قتل عثمان میں ملامت
کیے جا رہے تھے، ایسی صورت میں (یہ جنگ جو کروگے تو دنیا
تمھیں کیا کہے گی؟)[1]

ام المومنین عائشہ اور ام المومنین ام سلمہ اور عبداللہ بن زبیر کا مکالمہ

بحالت قیام مکہ ایک دن حضرت عائشہ حضرت ام سلمہ سے ملنے گئیں جو حج
کے لیے مکہ آئی تھیں۔

ام المومنین عائشہ:۔ سلام، اے بنت ابی امیہ! تم اول وہ بی بی ہو جنھوں
نے راہ خدا میں ہجرت کی اور واسطہ شرف زوجیت رسولؐ تمھاری شان و
منزلت عظیم ہے اور تم امہات المومنین میں اپنے فضائل کی وجہ سے خصوصیت

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ ص ۶۲

کے ساتھ ممتاز ہو، غالباً تم پر پوشیدہ نہ ہوگا کہ بلوائیوں کی ایک جماعت نے امیر المومنین عثمان کو ان کے گھر میں گھس کر قتل کیا اور اس خلیفۂ مقتول کے ہوا داروں نے ارادہ کیا ہے کہ قاتلوں سے انتقام لیں اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ عبداللہ بن عامر نے ایک لاکھ فوج مسلح فراہم کی ہے اور وہ سب عثمان کے واقعہ پر غضبناک اور طالب قصاص ہیں۔ میں ڈرتی ہوں کہ اس قضیے کی وجہ سے مسلمانوں میں محاربہ اور مقاتلہ واقع ہوگا، کیا ہو اگر سفر بصرہ میں تم میرے ساتھ موافقت کرو، شاید خدا ہم لوگوں کے سبب سے اس کی اصلاح کر دے اور خونِ عثمان کے قصاص کا عقدۂ تعویق کھول دے۔

ام المومنین ام سلمہ۔ اے دخترِ ابی بکر! تم خونِ عثمان کا بدلہ لینا چاہتی ہو، حالانکہ قسم بخدا تم ان پر سب سے زیادہ غضبناک تھیں اور ان کو نعثل کے نام سے یاد کر کے کہا کرتی تھیں کہ خدا .... اور قتل کرے نعثل کو۔ پس یہ عجیب بات ہے کہ کل تو تم ان کو سب وشتم کے ساتھ یاد کر کے کفر سے منسوب کرتی تھیں۔ اور آج ان کو امیر المومنین اور خلیفۂ مقتول ومظلوم کہتی ہو۔ اور ان کے معاملہ میں اہلِ تعزیت ومصیبت بن کر اس جماعت کا ساتھ دیتی ہو جس نے علیؑ پر خروج کیا ہے۔ سنو! طلبِ خونِ عثمان کے متعلق تمہارا خیال بالکل نامناسب ہے کیونکہ عثمان بنی عبدمناف سے تھے، اور تم بنی تیم سے ہو اور اے عائشہ! افسوس ہے

کہ تم اس گروہ سے موافقت کرتی ہو جس نے علیؑ ابن ابی طالب پر لشکر کشی کی ہے۔ حالانکہ علیؑ رسول مقبولؐ کے بھائی اور داماد اور فاطمہ زہراؑ کے شوہر ہیں' اے عائشہ! علیؑ کا مرتبۂ خلافت و ریاست و وراثت اہلِ روزگار کے نزدیک مسلّم ہے اور اصحاب مہاجر و انصار نے ان کے مرتبۂ خلافت کو قبول کر کے انکی بیعت اختیار کی ہے۔

اس کے بعد حضرت ام سلمہ نے حضرت علیؑ کے بعض فضائل و خصائل و خصائل کا ذکر کیا، عبداللہ ابن زبیر گھر کے بیرونی در پر یہ سب باتیں سن رہے تھے وہیں سے انھوں نے آواز دی۔

عبداللہ ابنِ زبیر۔ اے ام سلمہ! تم کو آلِ زبیر سے جو عداوت ہے اس کو میں جانتا ہوں۔

حضرت امِ سلمہ (اندرونِ در سے) تم ہی باپ بیٹے تو عائشہ کے بہکانے پر تلے ہو، کیا تمھارا گمان ہے کہ علیؑ کی زندگی میں مہاجرین و انصار تمھارے باپ زبیر اور ان کے مصاحب طلحہ کو اختیار کرنے پر راضی ہوں گے حالانکہ بقول پیغمبر علیہ السلام علیؑ ہر مومن و مومنہ کے ولی ہیں۔

عبداللہ ابن زبیر۔ میں نے یہ حدیث رسول اللہؐ کی زبان سے کبھی نہیں سنی۔

حضرت ام سلمہ۔ اگر تم نے نہیں سنی تو تمھاری خالہ عائشہ نے سنی ہے

ان سے پوچھ لو اور میں نے تو رسول مقبول کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا ہے کہ علیؑ میری زندگی میں اور میرے بعد تم سب پر میرے خلیفہ ہیں۔ جس نے ان کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی، اے عائشہ! بولو تم نے یہ حدیث رسول اللہؐ سے سنی ہے؟

حضرت عائشہ - ہاں میں نے سنی ہے۔

حضرت ام سلمہ - جس امر سے تم کو پیغمبر خدا نے خوف دلایا ہے اس سے ڈرو اور صاحبہ کلاب حواب نہ بنو۔ اے عائشہ میں قسم دے کر پوچھتی ہوں کہ کیا تم نے رسول خداؐ کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ عنقریب میری ایک بیوی پر چشمۂ حواب کے کتے بھونکیں گے۔ جو شریک اہل بغاوت و فساد ہوگی اور جس وقت حضرت نے یہ ارشاد کیا، اسوقت جو ظرف میرے ہاتھ میں تھا غایت اضطراب کی وجہ سے گر گیا۔ آنحضرتؐ نے مجھ سے سبب اضطراب دریافت فرمایا، تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ میں اس خیال سے مضطرب ہوئی کہ کہیں وہ بی بی میں نہ ہوں۔ آنحضرتؐ نے تبسم فرما کر اور تمہاری طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ اے حمیرا میرا گمان ہے کہ وہ بی بی تو ہے۔

حضرت عائشہ نے حضرت ام سلمہ کے اس بیان کی تصدیق فرمائی۔
حضرت ام سلمہ نے کہا اے عائشہ طلحہ اور زبیر کے فریب میں نہ آؤ اور یہ نہ سمجھو کہ وہ تم کو اس فعل کے وبال سے بچا لیں گے۔

حضرت ام سلمہ کی باتیں سن کر حضرت عائشہ وہاں سے بادلِ ملول اٹھیں اور فسخ عزم بصرہ کا عذر و حیلہ سوچنے لگیں۔ عبد اللہ ابن زبیر نے یہ حال محسوس کر کے فریاد کی۔

عبداللہ ابن زبیر۔ اے خالہ اگر تم اس لشکر کے ساتھ بصرہ کی طرف رخ نہ کرو گی تو میں خودکشی کر لوں گا۔ یا دیوانہ وار صحرا کی راہ لوں گا۔ اور وہاں کے درندوں کا شکار ہو جاؤں گا۔

لوگوں نے آکر حضرت عائشہ کو سمجھایا، کہ وہ ابن زبیر کی خاطر شکنی نہ کریں۔ بس حضرت عائشہ کا پہلا خیال پھر راسخ ہو گیا۔ اور عزم سفر سے انھوں نے اعراض نہ فرمایا۔[1]

سفرِ بصرہ

چشمۂ حواب

حضرت عائشہ نے اتحادیوں کے ہمراہ بصرہ کی طرف کوچ فرمایا۔ جب یہ گروہ مار حواب پر پہنچا جو راستہ میں پڑتا تھا، تو انھیں دیکھ کر حواب کے کتے بھونکنے لگے۔ حضرت عائشہ نے طلحہ کے بیٹے سے پوچھا کہ اس مقام کا کیا نام ہے اور یہ پانی کونسا پانی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ مار حواب ہے۔ عائشہ نے کہا تو پھر میں پلٹتی ہوں۔ میں آگے بڑھنے سے باز آئی۔

[1] روضۃ الاحباب، تاریخ احمدی صہ ۱۶۲ تا صہ ۱۶۵

محمد بن طلحہ نے کہا، یہ کیوں؟ فرمایا کہ میں رسول اللہؐ سے سن چکی ہوں کہ تم میں سے ایک عورت وہ ہے جس پر حواب کے کتے بھونکیں گے اور پھر فرمایا، دیکھو اے حمیرا کہیں وہ عورت تم ہی نہ ہونا۔ اس پر محمد بن طلحہ نے کہا، خدا آپ پر رحم کرے، آگے بھی بڑھیے اور ہٹائیے اس قولِ رسولؐ کو اس کے بعد عبداللہ بن زبیر آئے اور انھوں نے بہ حلف قسم کھائی کہ حواب کو تم چھوڑ کر آگے بڑھ آئی ہو اور وہ مقام تو اول شب میں ہی گزر گیا، اور اس بات پر عربوں کی جھوٹی گواہی بھی دلوا دی۔ (تا کہ حضرت عائشہ کو یقین آجائے) جبھی سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ پہلی جھوٹی گواہی اسلام میں ہوئی ہے[1]

علامہ طبری نے بھی ماء الحواب کے واقعات لکھے ہیں۔ اور اس میں یہ بات اور اضافہ کی ہے کہ حضرت عائشہ نے اپنا اونٹ یہ سن کر بٹھا دیا اور رات بھر وہاں سے انھوں نے حرکت نہیں کی کیونکہ رسول کا قول یاد آگیا تھا، اور آگے بڑھنے نہیں دیتا تھا، مگر جب عبداللہ بن زبیر نے کوشش کی تو کامیاب ہو گئے اور سواری آگے چلی[2]

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ ص ۶۳

[2] تاریخ طبری ص ۱۸۱، اس کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب میں بھی ماء حواب کا واقعہ بالفاظ مختلفہ روایت ہوا ہے مستدرک حاکم، تاریخ احمدی ص ۱۷۶ ص ۱۷۷۔ تاریخ کامل، تاریخ احمدی ص ۱۷۸، تاریخ مروج الذہب مسعودی، تاریخ احمدی ص ۱۷۷

حضرت علی علیہ السلام کا ام المومنین حضرت عائشہ کے نام خط

بعد حمدِ خدا و نعتِ مصطفےٰؐ عائشہ کو معلوم ہو کہ تم خلاف حکم خدا و رسولؐ گھر سے نکلی ہو، اور جس بات کی تم کو تکلیف نہیں دی گئی اور تمھارے مناسب حال نہیں ہے اس کو تم نے اختیار کیا ہے۔ تمھارا گمان ہے کہ تم مسلمانوں میں اصلاح پیدا کرتی ہو، حالانکہ جو کچھ تم کر رہی ہو یہ بالکل فساد و افساد ہے۔ ذرا بتاؤ تو کہ عورتوں کو فوج و لشکر سے کیا کام۔ جنھیں خدا نے خانہ نشینی کا حکم دیا ہے، اے عائشہ خدا سے ڈرو، اپنے گھر واپس جاؤ اور وہاں قرار پکڑو۔[1]

حضرت علیؑ کی لشکر آرائی و روانگی

جب حضرت علیؑ کو اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ حضرت عائشہ اور طلحہ اور زبیر نے بصرہ کی جانب خروج کیا ہے تو وہ بھی مع چار ہزار اہلِ مدینہ کے اس طرف روانہ ہوئے۔ ان چار ہزار آدمیوں میں آٹھ سو انصار اور چار سو وہ لوگ تھے جنھوں نے بیعتِ رضواں کا شرف حاصل کیا تھا۔ حضرت علیؑ نے فوج کی ترتیب اس طرح فرمائی :-

علمدارِ لشکر	حضرت محمد بن حنفیہ
سردارِ میمنہ	حضرت امام حسنؑ
سردارِ میسرہ	حضرت امام حسینؑ

[1] روضۃ الاحباب، تاریخ احمدی صفحہ ۱۷۹ و صفحہ ۱۸۰

سواروں کا افسر — حضرت عمار یاسر
پیادوں کا افسر — حضرت محمد بن ابی بکر
سردار مقدمۃ الجیش — حضرت عبداللہ بن عباس [۱]

حضرت ام سلمہ کا الوداع کہنا

عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ جب حضرت علیؑ بصرہ کی جانب جانے لگے تو وداع کے لیے حضرت ام سلمہ کے پاس گئے۔ حضرت ام سلمہ نے کہا، بسم اللہ و فی حفظ اللہ، خدا کی قسم تم حق پر ہو اور حق تمہارے ساتھ ہے۔ اگر خدا و رسول کا یہ حکم نہ ہوتا کہ ازواج نبیؐ اپنے گھروں میں قرار پذیر رہیں تو یقیناً میں تمہارے ساتھ چلتی [۲]

حضرت علیؑ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ روانہ ہو کر مقام ذیقار میں قیام پذیر ہوئے [۳]

حضرت خواجہ اویس قرنی رکاب امامت میں

عبداللہ ابن عباس مروی ہیں کہ موضع ذیقار میں لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص ضعیف و نحیف زادِ راہ پیٹھ پر باندھے اور پانی کی چھاگل گلے میں لٹکائے ہوئے پیادہ آ رہا ہے، لوگ اس بزرگ کو حضرت علیؑ کے پاس لائے۔ جب جانبین

---

[۱] تاریخ ابوالفدا۔ تاریخ احمدی صفحہ ۱۸۱ [۲] مستدرک حاکم، تاریخ احمدی صفحہ ۱۸۰
[۳] مروج الذہب، تاریخ احمدی صفحہ ۱۸۱

سے رسمِ تحیۃ و سلام ادا ہو چکی تو اس مردِ بزرگ سے پوچھا گیا کہ تمھارا کیا نام ہے؟ اور تم کس قبیلہ سے ہو؟ انھوں نے کہا کہ میں اویس قرنی ہوں' اے امیر المومنین! اپنا دستِ مبارک بڑھایئے تاکہ میں سعادتِ بیعت حاصل کروں. حضرت علیؓ نے پوچھا کہ کس بات پر میری بیعت کرو گے؟ اویس قرنی نے عرض کیا کہ اس بات پر بیعت کروں گا کہ تمھاری مدد و نصرت کر کے اپنا سر تمھارے قدموں پر نثار کر دوں[1]

حضرت علیؓ کا وفد کوفہ

بصرہ میں اتحادیوں کے اجتماع کی خبر سن کر حضرت علیؓ مدینہ کی فوج لے کر شہر سے نکلے، ربذہ پہنچ کر انھوں نے ایک وفد کوفہ روانہ کیا تاکہ وہاں سے فوج حاصل کی جائے۔[2]

اس وفد کی قیادت حضرت امام حسنؓ کر رہے تھے. حضرت عمار یاسر بھی ان کے ساتھ کوفہ آئے تھے۔ جب امام حسن علیہ السلام کوفہ پہنچے تو کوفہ کے گورنر ابوموسیٰ اشعری تھے اور وہ جامع مسجد کوفہ میں اس طرح تقریر کر رہے تھے:

ابوموسیٰ اشعری کی تقریر

"برادرانِ کوفہ!

۱؎ روضۃ الاحباب تاریخ احمدی صـ۱۸۱
۲؎ تاریخ اسلام سید عبدالقادر مرحوم صـ۳۵۰

تم لوگ عرب کی بنیاد بن جاؤ۔ تاکہ مظلوم اور خوفزدہ تمہارے دامن میں پناہ لیں، لوگو فتنہ اٹھتے وقت پہچان نہیں پڑتا بلکہ مشتبہ رہتا ہے۔ فرو ہونے کے بعد اس کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے، معلوم نہیں یہ فتنہ کہاں سے اٹھا ہے اور کس نے اٹھایا ہے، اس لیے تم لوگ اپنی تلواریں نیام میں کر لو، نیزے کے پھل نکال ڈالو کمانوں کے چلّے کاٹ دو، اور گھروں کے اندرون حصہ میں بیٹھ جاؤ۔ لوگو! فتنہ کے زمانے میں سونے والا کھڑے ہونے والے سے اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہے۔"

حضرت امام حسنؓ نے جب یہ تقریر سنی تو حضرت ابو موسیٰ اشعری کو روک دیا اور فرمایا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور جہاں جی میں آئے چلے جاؤ۔ اور آپ نے خود منبر پر چڑھ کر اہلِ کوفہ کو حضرت علیؓ کی امداد پر ابھارا، چنانچہ آپ کی دعوت اور حجر بن عدی کی تقریر پر ۹۶۵۰ کوفی حضرت علیؓ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت حسنؓ ان سب کو لے کر مقام ذیقار میں حضرت علیؓ سے مل گئے۔ اور جنگ کے فیصلہ تک برابر ساتھ رہے۔[1]

حضرت علیؓ کی صلح کے لیے جدوجہد

حضرت علیؓ بصرہ کے قریب پہنچے تو ان کے ساتھ بیس ہزار سپاہی تھے۔ آپ نے قعقاع بن عمر تمیمی کو ایلچی بنا کر اتحادیوں کے پاس بھیجا،

[1] اخبار الطوال ص ۱۵۲، سیر الصحابہ جلد ۶ ص ۵

اتحادی رہنماؤں سے ملے اور کہا کہ آپ لوگ خونِ عثمان کے عوض بصرے میں چھ سو آدمیوں کو قتل کر چکے ہیں۔ اب اگر لڑائی ہوئی تو مزید کشت و خون ہوگا۔ حضرت علیؓ بھی قاتلانِ عثمان کو سزا کے بغیر چھوڑنا نہیں چاہتے۔ مگر ابھی وہ مجبور ہیں۔ حضرت قعقاع نے ام المومنین حضرت عائشہ سے پوچھا کہ آپ کی تشریف آوری کا کیا مقصد ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ "اصلاح" قعقاع نے اس کی وضاحت چاہی تو انھوں نے کہا کہ مقتول خلیفہ کا قصاص اس پر قعقاع نے جواب دیا کہ آپ لوگوں نے قانون ہاتھوں میں لے کر بصرہ میں خونِ عثمان کے قصاص میں لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اس سے اہلِ بصرہ میں سے چھ ہزار آدمی آپ کے خلاف ہو گئے۔ پھر آپ لوگوں نے امر قصاص کو ملتوی کر دیا۔ کیا تمہارا قصاص کی نیت کو ترک کر دینا خلافِ قرآن نہ تھا، اس فتنہ کا علاج یہ ہے کہ موافق فضا اور امن و امان قائم کیا جائے۔ اس صورت میں ہر نوع کی اصلاح ہو سکے گی۔ اگر تم بیعت کر لو گے تو یہ امر امت کی بہتری کے لیے نیک فال ہوگا اور مظلوم خلیفہ کے قاتلوں سے قصاص بھی لیا جا سکے گا۔ خانہ جنگی کی صورت میں وہ لوگ اپنے کیے کی سزا بھگتنے سے بچ جائیں گے اور قوم بھی تیرِ حوادث کا ہدف ہو جائے گی۔ الغرض اسی طرح کئی روز گفت و شنید جاری رہی۔ اتحادیوں نے حضرت علیؓ کے استدلال پر اظہارِ پسندیدگی کیا۔ حضرت علیؓ نے حالات موافق پا کر بصرے کی طرف کوچ کیا اور حکم دیا کہ جو لوگ قتلِ عثمان میں کسی قسم کی اعانت کے مرتکب ہوئے ہیں پیچھے رہ جائیں۔ اور

ہمارے ہمراہ نہ آئیں[1]

مگر حضرت علیؑ کی اصلاح کے لیے جد و جہد ناکام رہی۔ جناب امام حسن علیہ السلام نے بھی حضرت عائشہ کے پاس جا کر معاملات کو ختم کرنیکی کوشش کی مگر ام المومنین نے فرزندِ رسول کی بات نہ مانی۔ اس سلسلہ میں سر امیر علی لکھتے ہیں :-

Ali who has pursued them closely besought them several times to desist from fratricidal war; but to no avail.[2]

"حضرت علیؑ نے انھیں جنگ بند کرنے کی ترغیب دی مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔"

جنگ جمل پر شیخ محمد عبدہٗ شارح نہج البلاغہ کا مختصر نوٹ

مختصر قصہ جنگِ جمل کا یہ ہے کہ طلحہ و زبیر جب علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کی بعیت کر چکے تو آپ کو مدینہ میں چھوڑا اور خود دونوں مکہ روانہ ہو گئے۔ اس حال میں کہ غصہ میں دونوں کے دونوں بھرے ہوئے تھے یہاں آ کے حضرت عائشہ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ان سے واقعات

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اول پروفیسر سید عبد القادر مرحوم و پروفیسر محمد شجاع الدین ص ۳۵۷ و ص ۳۵۸

[2] A Short History of Saracen P. 50

بلوچھے۔ اور طلحہ وزبیر نے سب واقعہ بیان کیا اور کہا کہ اب اہل مدینہ اس حال
میں ہیں کہ نہ حق کو پہچانتے ہیں نہ باطل کا انکار کرتے ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ
حضرت عائشہ نے کہا، تو ہمیں ان لوگوں کی جانب متوجہ ہونا چاہیے یا
شام جانا چاہیے۔ ایک شخص نے جواب دیا جو اس مجمع میں تھا کہ شام
میں تو معاویہ موجود ہیں اور وہ وہاں کا کام سنبھالے رہیں گے، لہٰذا شام
جانے کی ضرورت نہیں، بصرہ چلیے، بصرہ والے طلحہ کو چاہتے بھی ہیں
کہ وہ خلیفہ و امیر ہوں، چنانچہ ان سب نے بصرہ کا قصد کیا اور علی بن
مبنہ نے سامان سفر میں مدد دی۔ اور تمام چیزیں مہیا کیں اور ایک اونٹ
جس کا نام "عسکر" تھا حضرت عائشہ کی سواری کے لیے فراہم کرکے دیا
یہ علی بن مبنہ عثمان کی طرف سے یمن پر والی مقرر ہوئے تھے اور امیرالمومنین
علیؑ ابن ابی طالب نے ان کو معزول کر دیا تھا۔ تین ہزار آدمیوں کو لے کر
حضرت عائشہ نے یہاں سے کوچ کیا، جب یہ خبر امیرالمومنین کو معلوم
ہوئی تو آپ نے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔ اور پند و نصیحت کا
کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ مگر کوئی نصیحت کارگر نہ ہوسکی۔ جب
آپ مجبور ہوئے تو آپ نے بھی جنگ کی تیاری کی اور مقام بصرہ میں
دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ پھر بھی ایک مدت تک امیرالمومنین
جنگ کو ٹالتے رہے اور آخر کار میدانِ کارزار میں جنگ کے شعلے
بھڑکنے لگے۔

یہی اونٹ جس پر عائشہ سوار تھیں اس وقت بصرہ والوں کا رہنما تھا

اس کے گرد ہزاروں آدمی قتل ہو گئے۔ ستر قریشیوں نے اس اونٹ کی نکیل وقتِ جنگ تھامی اور سب کے سب قتل ہو گئے۔ آخر کار امیر المومنین کو فتح نصیب ہوئی اور حضرت عائشہ کے لشکر کو شکستِ فاش اٹھانی پڑی۔ اونٹ پے کر دیا گیا اور لوگ بھاگے۔ اس واقعہ میں طلحہ و زبیر بھی کام آگئے۔ حضرت عائشہ کے لشکر سے سترہ ہزار آدمی قتل ہوئے اور امیر المومنین کی فوج کے ایک ہزار ستر بہادر کام آئے۔[1]

جناب امیرؓ اور جنگ میں شرکت

علامہ سید مرتضیٰ حسین صاحب قبلہ لکھنوی مدظلہ العالی لکھتے ہیں:-

تھوڑے دنوں بعد ان بے قابو مسلمانوں نے دوسرا رخ اختیار کیا، جنگِ جمل کا میدان ہموار ہونے لگا، علمبردارانِ امن نے خونی منظر دکھانے کی خاطر تیاریاں شروع کر دیں، ابھی تک امامِ وقت خلیفۂ اسلام کی طرف سے نہ اعلانِ جنگ ہوا تھا نہ فوجی بھرتی، بلکہ حضرت کی لگاتار کوشش یہی تھی کہ صلح اور امن باقی رہے۔ مسلمان حقیقتوں سے دور نہ ہونے پائیں لیکن پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ صوبے کے گورنر اور مسجدوں کے خطیب یا تو یہ کوشش کر رہے تھے کہ لوگ علیؑ کے خلاف تلوار اٹھائیں یا کسی فریق کا ساتھ نہ دیکر امیر المومنین کے دفاعی نظام کو معطل کر دیں۔"

---

[1] سلسبیلِ فصاحت ص ۱۲۹

آغاز جنگ سے پہلے علی مرتضیٰؑ کی تقریر

دونوں لشکروں کے مقابل ہونے کے بعد حضرت علیؑ نے کھڑے ہو کر اپنی فوج سے ارشاد فرمایا:۔

"ایہا الناس! اگر تم فوج مخالف کو شکست دو تو زخمیوں اور قیدیوں کو نہ مارو، جو پیٹھ پھیر کر بھاگے اس کے تعاقب میں نہ جاؤ۔ کسی شخص کو برہنہ اور کسی مقتول کو مثلہ نہ کرو۔ اور ان کے اموال کے قریب نہ جاؤ۔ سوائے اس مال و متاع کے جو لشکر میں از قسم اسلحہ وغیرہ پڑا ہوا پاؤ۔"[1]

حضرت زبیر سے حضرت علیؑ کا خطاب

جنگِ جمل میں صفیں بندھ چکیں تو اس وقت امیر المومنین نے زبیر کو کئی دفعہ پکارا، چنانچہ زبیر صف سے نکل کر حضرت علیؑ سے اتنا قریب ہوئے کہ دونوں شاہسواروں کے گھوڑوں کی گردنیں ایک دوسرے سے مل گئیں۔ امیر المومنین نے زبیر سے کہا، کیوں زبیر! وہ وقت یاد ہے کہ جب تم مجھ سے ایک روز گلے مل رہے تھے اور رسول اللہؐ نے تم سے پوچھا کہ کیوں زبیر تم علیؑ سے محبت رکھتے ہو، تو تم نے جواب دیا تھا کہ کیوں نہیں! وہ میرے بھائی اور چچا کے لڑکے ہیں۔ تو رسول اللہؐ نے فرمایا

---

[1] تاریخ مروج الذہب، تاریخ احمدی صہ ۱۸۲

تھا کہ زبیر تم ایک روز علیؓ سے لڑو گے[1]

اسی واقعہ کو تاریخ ابو الفدا نے اس طرح بیان کیا ہے :-

"پھر حضرت علیؓ نے زبیر کو بلا کر کہا کہ زبیر تم کو یاد ہوگا کہ ایک دن رسول مقبولؐ کے ساتھ میرا گزر بنی غنم میں ہوا۔ آنحضرتؐ نے مجھے دیکھ کر تبسم فرمایا، اور میں بھی مسکرا دیا، تم نے میرے ہنسنے پر اعتراض کیا۔ اس پر رسول مقبولؐ نے فرمایا، کہ یہ تبسم بیجا نہیں، بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک روز تم علیؓ سے قتال کر کے ان کے حق میں ظلم کرو گے۔ زبیر نے کہا، بیشک مجھے وہ بات یاد آ گئی۔ اگر پہلے سے اس کا خیال ہو جاتا تو میں ہرگز یہاں نہ آتا"[2]

مستدرک حاکم میں جرورہ زمانی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علیؓ کو حضرت زبیر سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ اے زبیر تم کو خدا کی قسم بتاؤ کہ کیا رسول مقبولؐ نے نہیں کہا تھا کہ تم علیؓ سے ظالمانہ قتال کرو گے۔ حضرت زبیر نے کہا کہ ہاں بالکل سچ ہے مگر میں اس بات کو بھول گیا تھا[3]

حضرت زبیر کی جنگ سے روگردانی اور عبداللہ ابن زبیر

ان باتوں کو سنکر زبیر کو وہ واقعات یاد آ گئے اور انھوں نے فوراً اپنے گھوڑے

---

[1] شرح ابن ابی الحدید، الامامۃ والسیاستہ، استیعاب، اصابہ (حال زبیر) طبری سلسبیل فصاحت ص۹۵ [2] تاریخ ابو الفدا، تاریخ احمدی ص۱۸۲
[3] مستدرک حاکم، تاریخ احمدی ص۱۸۲

کی لگام پھیر لی۔ عبداللہ ابن زبیر نے پلٹنے کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا، کہ علیؑ
نے مجھے کچھ واقعات اور رسول اللہؐ کی احادیث یاد دلائی ہیں جنھیں زمانے
نے مجھے بھلا دیا تھا۔ اور اب میں پلٹا جاتا ہوں۔

اور تم لوگوں کے ہمراہ حضرت علیؑ سے جنگ نہیں کروں گا عبداللہ
نے کہا، یہ کچھ بھی نہیں، صرف یہ کہ تم اولادِ عبدالمطلب کی تلواروں سے ڈر گئے
اس لیئے پلٹے جاتے ہو۔

زبیر نے کہا، تجھ پر وائے ہو، تو مجھے جوشِ شجاعت دلاتا ہے۔ اور جنگ کے
لیے اُبھارتا ہے، حالانکہ میں قسم کھا چکا ہوں، کہ علیؑ سے جنگ نہیں کروں گا۔
عبداللہ ابن زبیر نے کہا کہ اپنی قسم کا کفارہ دے دو۔ اور لڑو ضرور، کہیں
قریش کی عورتیں تمھیں بودے پن کا الزام نہ دیں۔ حالانکہ تم بودے نہیں ہو۔
زبیر نے کہا، میرا غلام مکحول آج سے آزاد ہے، اور یہی میری قسم کا کفارہ
ہے۔ اس کے بعد نیزہ کی سنان نکال پھینکی۔ اور بغیر سنان کے نیزے سے
علیؑ کے لشکر پر حملہ کرنے لگا۔

امیرالمومنین نے لشکر کو آواز دی کہ روکنا نہیں، زبیر کو راہ دے دو۔ یہ نکل
جائے۔ زبیر حملہ کر کے پھر اپنے لشکر میں واپس گئے۔ اور پھر پلٹ کر دوسرا حملہ
کیا، پھر تیسرا حملہ کیا۔ پھر اپنے بیٹے سے کہا، وائے ہو تجھ پر، میرے حملے دیکھے
کیا نامردی اور بودا پن اسی کا نام ہے؟ یہ کہہ کر زبیر نے کچھ اشعار پڑھے جن کا
مفہوم یہ تھا:۔

"علیؑ نے مجھ کو وہ واقعہ یاد دلا دیا جس کو یاد کر کے میں ان سے

جنگ نہیں کرسکتا، درحقیقت ابوالحسن نے انصاف سے کام لیا، اور وہ بات کہی جس نے مجھے اس لغزش سے جو آج ہونے والی تھی بچایا میرے لیے دو چیزیں تھیں، یا عار و ننگ کہ بغیر لڑے ہوئے میدانِ جنگ سے واپس جاؤں یا جہنم کی آگ۔ سو میں نے عار کو نار پر ترجیح دی، بھلا مٹی کا بنا ہوا آدمی جہنم کی آنچ کب سہہ سکتا ہے۔[1]

صاحب اصابہ و استیعاب اور دیگر مورخین نے بھی اس واقعۂ بازگشت زبیر کو اپنی اپنی جگہ پر لکھا ہے۔ میدانِ جنگِ جمل سے زبیر کی بازگشت وہ عملی گواہی ہے جو جناب امیر علیہ السلام کی صداقت کو ثابت کر رہی ہے۔

واقعۂ قتل حضرت زبیر

جب حضرت زبیر جنگِ جمل سے نکل کر چلے تو "وادی السباع" میں انکا گزر ہوا۔ وہاں احنف بن قیس بنی تمیم کے ایک گروہ کے ساتھ موجود تھے۔ اور یہ جنگِ جمل میں کسی ایک طرف سے بھی شریک نہیں ہوئے تھے۔ احنف کو خبر دی گئی کہ زبیر وادی سباع سے گزر رہے ہیں۔ تو احنف نے بلند آواز سے کہا۔ "زبیر نے بھی کیا کیا ننگ و عار کے کام کیے، جنگِ جمل قائم کی اور جب تلواریں مسلمانوں کا خون چوسنے لگیں تو انھیں معرکۂ جنگ میں چھوڑ کے بھاگ نکلے یقیناً زبیر اس قابل ہیں کہ قتل کر دیے جائیں خدا انھیں قتل کرے۔"

---

[1] سلسبیل فصاحت ص ۹۸

احنف کا کلام سنکر عمرو بن جرموز نے زبیر کا پیچھا کیا۔ اور یہ بڑا اڑنت ساونت تھا۔ جب زبیر کے قریب پہنچا تو زبیر نے کہا، کیا مطلب ہے؟ کہا، میں تم سے پوچھنے آیا ہوں کہ جنگ جمل میں لوگ کیا کر رہے ہیں؟ زبیر نے کہا، کیا کر رہے ہیں، سب کے سب صفیں باندھے کھڑے ہوئے ہیں۔ اور تلواریں سرا رہی ہیں، ابن جرموز زبیر کے ساتھ ساتھ ہو لیا، اور ہر ایک، ایک دوسرے کے گھات سے بچتا جاتا تھا، جب چلتے چلتے نماز کا وقت آیا، تو زبیر نے کہا میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں، ابن جرموز نے کہا میں بھی نماز پڑھنا چاہتا ہوں زبیر نے کہا، تو میں تم کو امان دیتا ہوں تم مجھ کو امان دو۔ کہ ہم تم نماز سے فارغ ہو جائیں۔ ابن جرموز راضی ہوئے۔ زبیر نے وضو کیا۔ جب نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو ابن جرموز نے موقعہ پاکر وار کیا اور زبیر کو قتل کر دیا اور ان کا سر، تلوار اور انگوٹھی لے لی اور تھوڑی سی مٹی اٹھا کر ان کی لاش پر ڈال دی اور چلا گیا۔ اور احنف کے پاس پلٹ کر آیا تو احنف نے کہا، یہ تم نے بہت برا کیا، مجھے نہیں معلوم کہ تم نے برا کیا یا اچھا کیا۔ حضرت علیؑ کے پاس جاؤ اور ان سے پوچھو۔ ابن جرموز جناب امیر علیہ السلام کے پاس آیا۔ اجازت لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ سر، انگوٹھی اور تلوار تینوں چیزیں اس کے پاس تھیں اور اکثر نے لکھا ہے کہ صرف تلوار ساتھ تھی جناب امیر علیہ السلام نے پوچھا تو نے زبیر کو قتل کیا ہے؟ اس نے کہا، ہاں میں نے ہی قتل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا، خدا کی قسم صفیہ کا بیٹا، بزدل نہیں تھا، اور نہ بخیل تھا، مگر یہ کہو کہ برا وقت آ گیا تھا، اور موت پہنچ گئی تھی۔ پھر آپ نے

زبیر کی تلوار لی اور اس کو ہلا کے کہا، اس تلوار نے اکثر مقاماتِ جنگ میں رسول اللہ کی مدد کی ہے۔

ابن جرموز نے کہا: میں نے اتنا بڑا کام کیا ہے، کچھ انعام تو دیجیے۔ آپ نے فرمایا "میں نے رسول اللہ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ زبیر کا قاتل جہنمی ہے۔ یہی تیرا انعام ہے۔" ابن جرموز مایوس ہو کے چلا گیا، اور کچھ اشعار پڑھتا تھا جس کا مفہوم یہ تھا: سنو! میں تو زبیر کا سر علیؓ کے پاس لے گیا، اور سمجھتا تھا کہ مقرب ہوں گا، اور انعام ملے گا، مگر انھوں نے اُلٹے مجھے جہنم کی بشارت دی، کتنا بُرا یہ تحفہ ہے۔

یہی ابن جرموز نہروان میں خوارج کی طرف سے لڑا اور قتل ہوا۔ رسولؐ اور علی علیہ السلام دونوں کی پیشینگوئیاں اس کے جہنمی ہونے کی پوری اتریں مخالفت علیؑ سببِ جہنم ہوئی۔[1]

حضرت طلحہ کا انجام

دورانِ جنگ میں حضرت علیؑ کا طلحہ و زبیر سے آمنا سامنا ہوا۔ تو آپ نے زمانۂ رسولؐ کا ذکر کر کے ان دونوں کو ان کے موجودہ طرزِ عمل پہ شرم دلائی۔ اس پہ انھوں نے جنگ سے علیٰحدہ ہو جانے کا فیصلہ کیا، حضرت طلحہ میدان کارزار سے نکل رہے تھے، ایک تیر آپ کو لگا جو موت کا پیغامبر ثابت ہوا۔[2]

---

[1] سلسبیلِ فصاحت صہ ۹۹

[2] تاریخ اسلام سید عبدالقادر و محمد شجاع الدین جلد ۱ صہ ۳۶

حضرت طلحہ کا قاتل

مروان بن الحکم نے طلحہ کو ایسا تیر مارا کہ وہ مقتول ہوئے۔ حالانکہ طلحہ و مروان ایک ہی لشکر میں حضرت عائشہ کے ساتھ تھے۔[1]

ابراہیم بن محمد بن طلحہ سے روایت ہے کہ طلحہ کو بروز جنگ جمل مروان بن الحکم نے قتل کیا۔[2]

جنگِ جمل کی تفصیل

علامہ ابن ابی الحدید لکھتے ہیں:-

"مؤرخین نے جنگِ جمل کے جو مناظر دکھائے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ جن سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، واقدی نے اس باب کو بہت ہی شرح و بسط سے لکھا ہے۔ جس قدر رجز کے اشعار اس جنگ میں پڑھے گئے، اتنے کسی دوسری جنگ میں سنائی نہیں دیے سب سے زیادہ بنی ضبہ رجز پڑھ رہے تھے۔ جو حضرت عائشہ کے اونٹ کے گرد نثار ہو رہے تھے۔

---

[1] تاریخ ابوالفدا، تاریخ احمدی ص ۱۸۳

[2] مستدرک حاکم، تاریخ احمدی ص ۱۸۳

بنی ضُبّہ کے رجز اور ان کے اعتقادات

رجز کے اشعار کا ترجمہ اس طرح ہے :-

"ہم بنی ضُبّہ اصحاب جمل ہیں۔ ہم موت سے اس وقت مقابلہ کرتے ہیں جب وہ آئے اور نازل ہو، ہم حضرت عثمان کی سنانی نیزوں کی زبانوں سے سناتے ہیں۔ ہمارے شیخ کو ہمیں پلٹا دو۔ اور بس، ہمارے نزدیک موت شہد سے زیادہ شیریں ہے، اور جب موت آئے تو مر جانے میں کوئی ننگ و عار نہیں ہے، علیؑ عثمان کی جگہ میں بہت برے بدل ہیں، ہمارے شیخ سے ان کا کیا مقابلہ اور کیا برابری، کجا زمین پست اور کجا بلند چوٹیاں"

ان اشعار کے جواب میں اصحاب جناب امیر علیہ السلام میں سے ایک شخص نے اشعار پڑھے، ان میں سے دو شعروں کا ترجمہ اس طرح ہے:-

"حضرت عثمان کے بدل ہمیں خدا نے بہتر عوض اور بہتر بدل دیا وہ علیؑ ابن ابی طالب ہیں، میں وہ ہوں کہ جو جنگ میں آگے بڑھتا ہوں اور پیچھے نہیں ہٹتا اور سست نہیں ہوں، بلکہ ہر وقت جنگ کے لیے تیار ہوں، اور مشہور بہادر ہوں۔"

اہل البصرہ کا دُوسرا رجز

اس رجز کے اشعار کا ترجمہ :-

" اے بصرہ والو! لشکر والو! جو ایمان میں سخت ہو اٹھو اور اللہ سے مدد مانگو۔ ہمیں عجب رنگ کی خبر ملی ہے۔ کہ علیؑ نے عثمان کو قتل کر دیا۔ اچھا تو ہمارے شیخ کو اس طرح پلٹا دو جیسے کہ وہ تھے اے خدا تو عثمان کی مدد کے لیے مدد گار بھیج جو ان لوگوں کو قوت واقتدار کے ساتھ قتل کر دے "

یہ رجز سنکر اصحاب امیرالمومنینؑ میں سے ایک شخص نے ان ہی قوافی میں جواب دیا:۔

" قبیلۂ مذحج و ہمدان کی تلواریں اس بات سے انکار کرتی ہیں کہ عثمان کو اسی طرح پلٹائیں جیسا کہ وہ کبھی تھے۔ انھوں نے ہر قضیہ میں جو فیصلہ کیا حق اور نورِ قرآن کو چھوڑ دیا۔ لہٰذا موت کا پیالہ ایک پیاسے کی طرح پی گئے "۔

ایک بڈھے کا رجز

حضرت عائشہ کے لشکر سے ایک بڈھے نے رجز پڑھا۔ جس کے بعد جمل والوں کی صفیں جم گئیں اور لوگ جان دینے پر آمادہ ہو گئے۔ رجز کے اشعار کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"اے قبیلۂ ازد دیکھو تم پر تمھاری ماں کی حفاظت فرض ہے۔ کیونکہ تمھارا روزہ و نماز وہی ہیں اور وہ عزت و حرمت ہیں جو تم میں عام ہے۔ لہٰذا اپنی پوری کوشش اور عقل ان کے لئے

صرف کر دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمن کا زہر تمہارے زہر پر غالب آجائے کیونکہ اگر دشمن تم پر فتحیاب ہوا تو اپنی جور و جفا کا تمہیں نشانہ بنائے گا، اور تمہیں برباد کر دے گا۔ لہٰذا اپنی قوم پر فضیحت و رسوائی نہ آنے دینا اور قوم سے خبردار رہنا۔"

واقدی نے لکھا ہے کہ اس رجز سے اس روایت کی تصدیق ہوتی ہے کہ طلحہ و زبیر نے جمل والوں سے میدانِ جنگ میں یہ کہا تھا کہ ذرا جم کے لڑنا اگر علیؑ کی فتح کہیں ہوگئی تو وہ تمہاری ذلت و رسوائی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کریں گے، عورتوں کو اسیر کریں گے، عزتوں کی پردہ دری کریں گے، اولاد کو قتل کریں گے۔ لہٰذا ان لوگوں کی طرح لڑو جو عزت کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

ابو مخنف نے بھی بیان کیا ہے کہ اس بڈھے کے رجز سے زیادہ کوئی اور رجز جمل والوں کے لیے کارگر نہیں ہوا کیونکہ اس رجز کے سنتے ہی جمل والوں کی صفیں میدانِ جنگ میں قلعہ کی دیواریں بن گئیں۔

عوف بن قطن ضبّی کا رجز

عوف بن قطن ضبّی اس بڈھے کے رجز کو سنکر صفِ جنگ سے یہ کہتا ہوا نکلا:۔

"عثمان کا انتقام کسی سے نہیں لیا جاسکتا مگر علیؑ اور ان کی اولاد سے اور یہ کہہ کر یوں رجز پڑھا، اے امّاں جان! مجھ سے وطن

خالی ہوا اور چھپا، نہ میں قبر چاہتا ہوں نہ کفن، اسی جگہ سے عوف بن قطن اٹھے گا اور اس کا حشر یہیں برپا ہو گا۔ اگر آج میرے ہاتھ سے علیؑ یا حسن و حسین (علیہم السلام) یا ان کے بچے بچ گئے تو یہ بڑا گھاٹا ہے تو اس وقت میں رنج و غم سے مر جاؤں گا۔[1]

یہ ہے عداوتِ اولادِ رسولؐ کا جذبہ اور کربلا کے خونی مناظر کی تمہید۔

غرضیکہ حالت یہ تھی کہ تلواروں سے سر ٹوپیں اُڑ رہے تھے اور زمین پر گر رہے تھے، جیسے دھواں دھار بارش ہوتی ہے۔ شانوں سے ہاتھ کٹ کٹ کر گر رہے تھے۔ اور گٹوں سے نیچے اور کہنیوں سے کلائیاں، پیٹ کی کائنات بہادروں کے واروں سے زمین پر آرہی تھی اور بنی ضبہ ٹڈیوں کی طرح سے اونٹ کے گرد بچھے جاتے تھے۔ اور اپنی جگہ نہ چھوڑتے تھے۔ اسی طرح لوگ اونٹ کی نکیل پکڑتے تھے اور رجز پڑھتے تھے اور قتل ہو جاتے تھے کشتوں کے پشتے لگ گئے اور خون کے سوا میدانِ جنگ میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

حارث بن زہیر ازدی کا رجز

حارث بن زہیر اسدی اصحابِ علیؑ میں سے تھے۔ یہ لڑتے لڑتے اونٹ کے قریب پہنچے، اونٹ کی مہار ایک ضبیؔ کے ہاتھ میں تھی۔ آپ نے رجز پڑھا جس کا مطلب یہ تھا:-

"اے عائشہ! اے مادرِ گرامی آپ کیسی ماں ہیں، ماں تو اپنے بچوں پر رحم کرتی ہے ان کی دیکھ بھال کرتی ہے، انکی تربیت

---

[1] شرح ابن ابی الحدید جلد اول ص ۱۴۹ سلسبیل فصاحت ص ۱۳۰ تا ص ۱۳۱

کرتی ہے انھیں کھلاتی پلاتی ہے۔ اور آپ وہ ہیں کہ آپ نے ہزار دل کی جانیں لیں۔"

اس رجز کے بعد دونوں میں جنگ ہوئی اور دونوں مجروح ہو کر گر پڑے[1] ستر قریشیوں نے مہارِ شتر پکڑی، وہ سب کے سب قتل ہوئے۔ ان قریشیوں کے بعد "بنی ناجیہ" نے نکیل پکڑنی شروع کی حضرت عائشہ پوچھتی جاتی تھیں کہ اب کس کے ہاتھ میں اونٹ کی نکیل ہے۔ لوگ کہتے تھے، "بنی ناجیہ" تو آپ فرماتی تھیں۔

بنی ناجیہ! دیکھو جم کے لڑنا میں تو جانتی ہوں کہ تم میں قریش کے صفات ہیں[2] حالانکہ بنو ناجیہ مقدوح النسب ہیں۔ یہ سب کے سب اونٹ کی بدولت قتل ہو گئے۔

محمدؐ بن حنفیہ کو حکم

امیرالمومنین علیہ السلام یہ دیکھ کے ایک ایسے لشکر کے ساتھ جس میں مہاجرین و انصار تھے جو اسلحہ کے رنگ سے سبز نظر آتا تھا۔ آگے بڑھے آپ کے ساتھ آپ کے بیٹے امام حسنؑ و امام حسینؑ علیہما السلام اور حضرت محمد بن حنفیہ بھی تھے۔ علمِ لشکر جناب محمد بن حنفیہ کو دیا اور کہا، بیٹا آگے بڑھو اور اتنا بڑھو کہ اس علم کو اونٹ کی آنکھوں میں گاڑ دو۔ جناب

---

[1] شرح ابن ابی الحدید، سلسبیلِ فصاحت صـ ۱۳۳

[2] شرح ابن ابی الحدید جلد ۱ صـ ۵۱

محمد ابن حنفیہ علم لے کر بڑھنا چاہتے تھے کہ تیر اس کثرت سے پے در پے آنے لگے کہ آسمان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آپ تیروں کا یہ رنگ دیکھ کر ٹھٹکے، جناب امیرؑ نے فرمایا کچھ پروا نہ کرو آگے بڑھو، بیٹے نے عرض کیا بابا! دیکھیے تو تیر کتنے زیادہ آرہے ہیں۔ آپ نے اصحاب سے کہا تم ذرا دم لے لو۔ اور ان تیروں کو ختم ہو جانے دو۔ تیر انگلی کے دو ہی چلے باقی رہ گئے تھے۔ کہ پھر آپ نے جناب محمد بن حنفیہ سے کہا بیٹا بڑھو! وہ پھر کچھ ہچکچائے کیونکہ تیر کچھ کتنے نہ تھے۔ آپ بڑھ کے ان کے پاس آئے اور بایاں ہاتھ جناب محمد کے دہنے کندھے پر رکھ کر کہا "اقدم لا ام لک" آگے بڑھو تمھاری ماں نہ ہو (عرب میں یہ فقرہ مقامِ مدح و مقامِ مذمت دونوں جگہ استعمال ہوتا ہے) جب اس کلمہ کو جناب محمد بن حنفیہ یاد کرتے تھے تو روتے تھے۔ اور زندگی بھر رویا کیے۔ پھر امیر المومنین علیہ السلام کو بیٹے کی کچھ محبت آئی۔ اور دل پر کچھ چوٹ سی لگی۔ آپ نے محمد بن حنفیہ کے ہاتھ سے اپنے بائیں ہاتھ میں علمِ لشکر لے لیا۔

جناب امیر علیہ السلام کا حملہ

آپ دائیں ہاتھ میں ذوالفقار لے کر لشکر میں یوں ڈوب گئے جیسے کوئی پیراک پانی میں غوطہ لگاتا ہے۔ پھر لشکر کو پیس کے نکلے، تلوار دوہری ہو گئی تھی۔ آپ نے گھٹنوں سے سیدھی کی۔ اصحاب نے

عرض کی آپ ٹھہریں۔ اب ہم حملہ آور ہوتے ہیں۔ مگر آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور نہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھا لشکر پر نگاہ جمی ہوئی تھی اور شیر کی طرح گرج رہے تھے۔ پھر آپ لشکر میں ڈوب گئے، اور پھر جنگ کی۔ نہ آپ کسی طرف دیکھتے تھے نہ کسی بات کا جواب دیتے تھے۔ وہی حملوں میں میدان صاف تھا، پلٹ کر آئے، بیٹے کو نشانِ لشکر دیا، اور فرمایا،

"بیٹا دیکھو یوں لڑتے ہیں"

اصحاب نے عرض کی مولا اور کس کو یہ قدرت حاصل ہے، لوگوں نے عرض کی۔ آپ اپنی جگہ پر رہا کریں اور جنگ کے لیے تشریف نہ لے جایا کریں۔ فرمایا،۔

"میں تو خدا اور آخرت کے لیے جہاد کرتا ہوں۔ اس کے سوا میرا نصب العین کچھ بھی نہیں۔

محمد بن حنفیہ کی قیادت میں انصار کی جنگ

پھر جناب امیر علیہ السلام نے جناب محمد بن حنفیہ کو علم دیا اور فرمایا کہ جاؤ اور یوں لڑو کہ میری لڑائی اور میرا حملہ لوگ بھول جائیں اور یہ گروہ انصار تمہارے ساتھ ہے چنانچہ جناب خزیمہ ذوالشہادتین اور دیگر انصار رسولؐ جو بدر میں لڑ چکے تھے ہمراہ گئے۔ جناب محمدؐ نے خوب جنگ فرمائی۔

جناب خزیمہ کی مدح سرائی

جناب خزیمہ نے جناب امیر علیہ السلام سے عرض کیا۔ اگر آج محمد بن حنفیہ کی جگہ کوئی اور لڑتا تو بُری طرح شکست کھاتا، اور بڑی بدنامی ہوتی ۔ آپ نے انھیں آدابِ حرب تعلیم کیے تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ آپ نے اکثروں کو فنِ حرب کی تعلیم دی ہے مگر ان میں صرف محمد حنفیہ ہی نے تربیت کا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

انصار کی مدح اور حسنینؑ کا ذکر

انصار نے آکر عرض کیا مولا! وہ دادِ شجاعت آج آپ کے بیٹے نے دی ہے کہ اگر آپ کے بچے حسنؑ و حسینؑ نہ ہوتے تو ہم کہتے کہ محمد کا نظیر شجاعت و فنِ حرب میں عرب بھر میں کوئی نہیں۔
اس پر آپ نے فرمایا ہاں یہ سچ ہے مگر کہاں میرا بیٹا محمد اور کہاں رسولؐ کے بیٹے حسنؑ و حسینؑ، ان کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے؟

محمد کے دل میں عظمتِ حسنینؑ

الغرض محمد بن حنفیہ نے جنگِ جمل میں وہ دادِ شجاعت دی کہ آج تک تاریخیں ان حملوں کو محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ حضرت محمد بن حنفیہ سے جب کوئی پوچھتا تھا کہ علی ابن ابی طالب لڑنے کے لیے کیوں باربار

آپ ہی کو بھیجتے ہیں؛ حسنین علیہما السلام کو کیوں نہیں بھیجتے، تو آپ فرماتے تھے:-

"اس لیے کہ وہ دونوں میرے باپ کی آنکھوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور میں ان کا ہاتھ ہوں - لہٰذا آنکھوں کو ہاتھ سے بچاتے ہیں۔"[1]

جنگ کا خاتمہ

جب جناب امیر علیہ السلام نے دیکھا کہ ہزاروں قتل ہو گئے۔ امیرالمومنین نے آگے بڑھ کر آواز دی!

"بہادرو! دیکھتے کیا ہو، اس اونٹ کو پے کر دو اور جلد سے جلد پے کر دو ورنہ تمام عرب اس کے گرد قتل ہو جائے گا اور یوں ہی تلواریں اٹھ اٹھ کر گرتی رہیں گی۔"

یہ فرما کر آپ اپنے کاندھے پر ننگی تلوار رکھ کر آگے بڑھے اور اونٹ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اصحاب کو اشارہ کیا اور یہ جماعت خون کے دریا میں تیرتی ہوئی آگے بڑھی - وہاں تک پہنچی، ایسا سخت رن پڑا کہ جو بیان سے باہر ہے۔ آخرکار آپ قبیلۂ نخع کو لے کر اونٹ کے پاس پہنچ ہی گئے، اور بجیر نخعی سے کہا۔"ہاں بڑھ کر اونٹ پر وار کرو" انھوں نے ایک بھرپور ہاتھ چھوڑ دیا

---

[1] وفیات جلد اول ص ۳۵

اور وہ بلبلا کر گرا کہ ایسی آواز کبھی سنی ہی نہیں گئی تھی۔ اونٹ کا گرنا تھا کہ لوگوں نے ٹڈیوں کی طرح بھاگنا شروع کیا۔ اور یوں بھاگ رہے تھے جیسے ٹڈیاں تیز ہوا کے جھکڑ میں اڑتی ہیں۔
حضرت عائشہ کا ہودج آپ نے عبداللہ بن خلف کے گھر بصرہ میں پہنچا دیا۔

حضرت علیؑ کا ام المومنین بی بی عائشہ سے حسن سلوک

حضرت علی علیہ السلام نے محمد بن ابی بکر کو حکم دیا کہ جاؤ اپنی بہن کی حفاظت کرو۔ انھیں کسی قسم کا چشم زخم نہ پہنچنے پائے[1]

ام المومنین کی مدینہ کو روانگی

یکم رجب ۳۶ھ ہجری کو حضرت علیؑ نے حضرت عائشہ کو حضرت محمد بن ابی بکر اور امرائے بصرہ کی چالیس خواتین کے ہمراہ بصرہ سے روانہ کیا۔ چند کوس تک رخصت کرنے کے لیے خود بھی تشریف لے گئے۔ پھر اپنے دونوں صاحبزادوں حسنؑ و حسینؑ علیہما السلام کو بھیجا۔ اور حضرت عائشہ مکہ معظمہ تشریف لے گئیں، وہاں ذی الحجہ تک رہ کر ادائے حج کے بعد محرم ۳۷ھ میں عازم مدینہ منورہ ہوئیں[2]

---

[1] تاریخ اسلام مولفہ نشتر جالندھری ص ۲۳۲
[2] تاریخ اسلام مولفہ نشتر جالندھری ص ۲۳۲

جنگ جمل کے نتائج

اس جنگِ جمل میں حضرت ام المومنین کے تیس ہزار لشکریوں میں سے ۹ ہزار اور حضرت علیؑ کی بیس ہزار کی فوج میں سے ایک ہزار ستر آدمی کام آئے[1]
شیخ محمد عبدہ نے حضرت عائشہ کے لشکر کے کشتوں کی تعداد سترہ ہزار لکھی ہے۔ یہ اختلافِ روایات ہے۔ اس سے معلوم ہوا حضرت عائشہ کے لشکر کے مقتولین کم از کم نو ہزار اور زیادہ سے زیادہ سترہ ہزار تھے۔ جنگِ جمل کی کامیابی سے حضرت علیؑ کی سلطنتِ مصر، عرب اور فارس پر مستحکم ہو گئی[2]

بعد فتح جناب امیر علیہ السلام کا اعلان

حضرت علیؑ کے حق میں جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ آپ نے حضرت عائشہ کے بھائی محمد بن ابی بکر کو جو حضرت علیؑ کے ساتھ تھے حکم دیا کہ اپنی ہمشیرۂ محترمہ کی خبر گیری کریں۔ اور عام منادی کر دی کہ بھاگنے والوں کا تعاقب نہ کیا جائے۔ زخمیوں پر گھوڑے نہ دوڑائے جائیں۔ مالِ غنیمت نہ لوٹا جائے، جو ہتھیار ڈال دیں وہ مامون ہیں[3]

---

[1] تاریخ اسلام مولفہ نشتر جالندھری ص ۲۳۲ [2] تذکرۃ الکرام ص ۲۵۰
[3] سیر الصحابہ حصہ المہاجرین کی پہلی جلد خلفائے راشدین ص ۲۹۶

بعد فتح حضرت علیؑ کا خُلقِ عظیم

آپ فاتح کی حیثیت سے دوشنبہ کے دن مسجد میں جاتے ہیں اور وہاں نماز پڑھ کر بصرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ لوگ آپ سے آکر ملے، پھر آپ اپنی سواری پر حضرت عائشہ کے پاس گئے۔ جب عبداللہ بن خلف کے مکان کے پاس پہنچے جو بصرہ میں سب سے بڑا گھر تھا، تو دیکھا کہ عورتیں عبداللہ اور عثمان خلف کے دونوں بیٹوں پر رو رہی ہیں اور حضرت عائشہ بھی روتی تھیں اور صفیہ بنت حارث اوڑھنی سے منہ ڈھانکے ہوئے گریہ و زاری کر رہی ہیں۔ جب صفیہ نے جناب امیر علیہ السلام کو دیکھا تو کہا :۔

"اے علیؑ! اے دوستوں کے قاتل! اے جماعتوں کو الگ الگ کرنے والے! خدا تمھارے بچوں کو بھی یوں ہی یتیم کر دے جس طرح تم نے عبداللہ کے بچوں کو یتیم کیا ہے۔"

آپ نے صفیہ کا کوسنا سنا اور کوئی جواب نہ دیا، پھر حضرت عائشہ کے پاس آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ جب وہاں سے اٹھے تو پھر صفیہ نے کوسنا شروع کیا، آپ نے اپنی سواری روکی اور دروازوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں نے قصد کیا ہے کہ ان دروازوں کو کھول کر جو لوگ ان میں ہیں انھیں قتل کر دوں۔ اس کے اندر کچھ مجروح لوگ پناہ گزین تھے ان کو عائشہ نے پناہ دی تھی، ان لوگوں کی اطلاع پہلے ہی امیرالمومنینؑ کو پہنچ چکی تھی۔ مگر پھر آپ نے ان لوگوں کی طرف سے بے اعتنائی

سے کام لیا۔ اور کوئی توجہ نہیں فرمائی تھی۔ اس وقت اس کا اظہار کیا تو صفیہ سن کر خاموش ہوئی۔ آپ آگے بڑھے تو ایک شخص نے جو قبیلۂ ازد سے تھا اور صفیہ کی بد کلامی سن چکا تھا پکار کر کہا:۔

"دیکھو! خدا کی قسم یہ عورت صفیہ بچ کر جانے نہ پائے۔"

امیر المومنین ؑ کو سنکر اس شخص پر سخت غصہ آیا اور فرمایا:۔

"خبردار! چپ رہ، کوئی عیب گوئی نہ کی جائے اور پڑے ہوئے پردے چاک نہ کیے جائیں اور کسی گھر میں درآنہ داخل نہ ہوا جائے، اور کسی عورت کو برا بھلا کہہ کر غضبناک نہ کیا جائے چاہے وہ عورتیں تم لوگوں کو گالیاں بھی دیں اور تمھارے نیک لوگوں کی توہین بھی کریں، کیونکہ عورتیں بہت کمزور ہوتی ہیں اور ہمیں تو ایسی باتوں کی ممانعت مشرکین کی عورتوں کے لیے بھی کی گئی ہے چہ جائیکہ یہ عورتیں۔"

جناب امیر علیہ السلام یہ فرما کر آگے بڑھے، ایک شخص نے اطلاع دی کہ دو آدمی ایک ذات کو بہت برا بھلا کہہ رہے ہیں، اس سے بھی زیادہ جتنا صفیہ نے آپ کی شان میں گستاخی کی، آپ نے فرمایا ہو نہ ہو عائشہ کے لیے کہتے ہوں گے۔ اس نے کہا ہاں، ایک تو کہہ رہا تھا:۔

جزیتُ عنا اُمنا عقوقاً

"اے والدۂ گرامی! ہم لوگوں کی نافرمانیاں اور عاق ہونا آپ کو جزا میں دے دیا گیا ہے۔"

اور دوسرا کہہ رہا تھا :-

یا اُمنا توبی فقد خطئت

"مادرِ گرامی! توبہ کیجیے آپ نے بڑی خطا کی ہے۔"

ان لوگوں کو سزائیں دی گئیں اور سو سو کوڑے ان پر لگائے گئے[1]

اسی طرح وہ واقعہ بھی آپ کے خلقِ عظیم کی دلیل ہے کہ آپ نے بعد فتح جنگِ جمل حضرت عائشہ کو بڑے عزت و احترام سے لوگوں کی حفاظت میں جو مسلح تھے اور جو درحقیقت عورتیں تھیں بخیر و خوبی روانہ کیا اور حفاظت سے گھر پہنچایا۔

درحقیقت فاتحین مخالفوں سے یہ سلوک نہیں کیا کرتے مگر کیا ذات والاصفات تھی کہ باوجود اس کے کہ یہ لوگ آپ سے ناحق نبردآزما ہوئے پھر بھی آپ نے اپنے لشکر کو ان کے ساتھ روانہ کیا۔ اور کوئی ایسا سلوک نہیں کرنے دیا جو حضرت عائشہ یا ان کے ساتھیوں کے لیے ایذا رساں ہوتا۔

جناب امیرؑ کا فقہی انکشاف

جتنا بھی مال و اسلحہ و مملوک لشکرِ جمل میں غنیمت کی حیثیت سے ملا وہ سب آپ نے اپنے سرفروش اصحاب میں تقسیم کر دیا۔ اس بات پر مورخین کا اجماع ہے کہ لوگوں نے عرض کی کہ ساکنین بصرہ کو بھی ہم پر تقسیم کر

---

[1] تاریخ طبری جلد ۵ ص ۲۲۲

دیجیے تاکہ ہم انھیں غلام بنائیں۔ آپ نے فرمایا نہیں! جو کچھ تم نے میدانِ جنگ میں حاصل کیا وہ تمھارا حق ہے اور جو شہر بصرہ کے اندر محدود ہے وہ ان ہی کا ہے جن کے وہ گھر ہیں۔ جب لوگوں نے بہت اصرار کیا اور کہا کہ انکے ساتھ کفار کا سا سلوک ہونا چاہیے تو آپ نے فرمایا اچھا۔ سب سے پہلے قرعہ اندازی کرو۔ دیکھو ام المومنین حضرت عائشہ جس کے حصہ میں پڑیں اس کو دو۔ اب لوگ سمجھے اور عرض کیا "نہیں، اے امیرالمومنینؑ یہ کیونکر ممکن ہے" اسی عدم امکان کو آپ پہلے بھی سمجھا رہے تھے مگر اس طرح سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

حضرت ام المومنین عائشہ کی ندامت

جنگِ جمل کے بعد حضرت عائشہ کو اس کا ہمیشہ افسوس رہا۔

بخاری میں ہے کہ وفات کے وقت انھوں نے وصیت کی کہ مجھے روضۂ نبوی میں آپ کے ساتھ دفن نہ کرنا بلکہ بقیع میں اور ازواج کے ساتھ دفن کرنا، کیونکہ میں نے آپ کے بعد ایک جرم کیا ہے[1]

ابن سعد میں ہے کہ جب وہ یہ آیت پڑھتی تھیں وقرن فی بیوتکنّ اے پیغمبرؐ کی بیویو! اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھو، تو اس قدر روتی تھیں کہ آنچل تر ہو جاتا تھا۔[2]

---

[1] کتاب الجنائز، مستدرک حاکم جلد ۴ ص۶، سیر الصحابیات ص۲۶

[2] طبقات ابن سعد ص۵۱، جزء النساء، سیر الصحابیات ص۲۶

حارث ابن زہیر ازدی کے چچا زاد بھائی عبداللہ ازدی جو خود بھی جنگِ جمل میں حضرت علیؑ کی طرف تھے کہتے ہیں کہ میں جنگِ جمل کے بعد مدینہ گیا اور حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوا، سلام کیا، انھوں نے پوچھا، تم کون ہو؟ میں نے کہا کہ میں کوفہ کا ایک آدمی ہوں، کہا، بصرہ کی جنگ میں تم شریک تھے؟ میں نے کہا ہاں، کہا کس طرف سے؟ میں نے کہا حضرت علیؑ کی طرف سے لڑ رہا تھا، کہا تم نے وہ رجز بھی سنا تھا جو ایک شخص نے پڑھا تھا؟ میں نے کہا یہ شخص کون تھا؟ میں نے کہا میرا چچا زاد بھائی حارث ابن زہیر ازدی تھا، کہا تو پھر کیا ہوا، میں نے کہا ہوا کیا، وہ لڑ کر شہید ہو گیا۔ یہ سنکر ام المومنین بی بی عائشہ رونے لگیں اور اتنا روئیں کی جس کی حد نہیں اور فرمایا کاش میں جنگِ جمل سے بیس سال پہلے مرگئی ہوتی۔[1]

تقسیم اموال بیت المال بصرہ

جب حضرت علی علیہ السلام کو جنگِ جمل میں فتح ہوئی اور ایک حد تک امن و امان قائم ہو گیا۔ تو آپ بیت المال بصرہ میں تشریف لائے۔ آپ کے ہمراہ مہاجرین و انصار کا ایک گروہ تھا، ابو الاسود دوئلی کہتے ہیں کہ میں بھی اس وقت ہمرکاب ظفر انتساب تھا۔ جب آپ نے مالِ دنیا کی کثرت دیکھی تو فرمایا۔

---

[1] شرح ابن ابی الحدید۔ سلسبیل فصاحت ص ۱۳۳

"کسی اور کو دھوکا دے، کسی اور کو اپنے دام میں لے۔"

یہ کئی بار فرمایا، پھر ایک مرتبہ مال پہ نظر ڈالی اور اسے نگاہ سے جانچا اور فرمایا "پانچ پانچ سو درہم ہر ایک کو تقسیم کر دو۔" چنانچہ تقسیم کامل ہوئی اور بارہ ہزار انسانوں میں وہ مال جو ساٹھ لاکھ درہم تھا، پورا پورا تقسیم ہو گیا۔ اس پر ابن ابوالحدید کہتے ہیں کہ اس ذات کی قسم کہ جس نے رسول کو بحق مبعوث رسالت کیا نہ کوئی درہم کم ہوا اور نہ زیادہ ہوا۔ گویا آپ مقدار مال کو جانتے تھے کہ یہ اتنی ہے (یہ بھی جناب امیر علیہ السلام کے علم غیبت کی ایک مثال ہے۔ جتنا جتنا لوگوں کو تقسیم کیا تھا۔ اسی قدر آپ نے بھی لیا کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے عرض کی، اے امیرالمومنین! اگرچہ میں جنگ میں شریک نہ تھا مگر خدا عالم ہے کہ میرا دل آپ کے ساتھ تھا اور میں قلبی حیثیت سے شریک تھا۔ میرا حصہ بھی مجھے دیجیے۔ آپ نے وہی پانچسو درہم جو خود لیے تھے اسے دے دیے۔ اور فرمایا۔ آدمی اسی کے ساتھ ہو گا جس سے وہ محبت کرے۔[1]

---

[1] شرح ابن ابی الحدید سلسبیل فصاحت ص ۱۱۵ و ص ۱۱۶

دارالحکومت کی تبدیلی

رجب ۳۶ھ

تبدیلئ دارالحکومت پر مختلف مورخوں نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے اظہارِ خیال کیا ہے۔

ا۔ پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم و پروفیسر محمد شجاع الدین لکھتے ہیں :-

جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ نے مدینہ کی بجائے کوفہ کو اپنا دارالخلافہ مقرر کیا۔ اس وقت آپ کے عہدِ حکومت کو صرف سات ماہ گزرے تھے۔

۱۔ اس تبدیلی کا مقصد کوفہ کے لوگوں کی خوشنودی اور امداد کا حاصل کرنا تھا۔ کیونکہ جمل کی لڑائی اہلِ کوفہ کی مدد اور تعاون سے جیتی گئی تھی، اور وہی حضرت علیؓ کے زیادہ ممد و معاون تھے۔

۲۔ کوفہ سے دمشق بہت قریب تھا، اور یہاں بیٹھ کر حضرت امیر معاویہ کی ریشہ دوانیوں کا سدِ باب زیادہ بہتر طریقہ سے ہو سکتا تھا۔

۳۔ تبدیلئ دارالحکومت کا مقصد مدینہ کو خونریزی سے بچانا بھی تھا چنانچہ مدینہ سیاسی کشمکش کے مذموم نتائج سے محفوظ ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ جب عراق جانے کے لیے مدینہ سے نکلے

تو کسی دیوانے نے آپ کے گھوڑے کی لگام کو تھام لیا۔ اور حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے کہا:۔

"آپ یہاں سے نہ جائیے۔ اگر آپ ایک دفعہ چلے گئے تو مدینہ کی رونق جاتی رہے گی اور پھر یہ شہر اسلام کا پایۂ تخت کبھی نہیں ہوگا۔"

دیوانے کی یہ بڑ صحیح ثابت ہوئی۔ اس کے بعد یہ شہر پھر مسلمانوں کا سیاسی مرکز نہ بن سکا۔ اور اسے وہ اہمیت نہ حاصل ہو سکی جو رسول پاکؐ اور پہلے تین خلفاء کے زمانہ میں اسے حاصل تھی۔

۴۔ اس کے علاوہ مدینہ کی نسبت کوفہ زیادہ مرکزی مقام تھا۔ یہاں سے مملکتِ اسلامیہ کے تمام صوبوں کو سڑکیں جاتی تھیں۔ اور یہاں بیٹھ کر عالمِ اسلام کا انتظام زیادہ آسان تھا۔[1]

۲ ۔ صاجزادہ ابونعیم عبد الحکیم نشتر جالندھری و عبد الحمید صاحب حمید ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل لکھتے ہیں:۔

"جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ کے سامنے اولین و اہم ترین کام یہ تھا کہ شام کو زیرِ نگین کر کے حضرت معاویہ سے بیعت لی جائے۔ چنانچہ آپ نے اس مدعا کے حصول کے لیے مدینہ کی بجائے کوفہ کو دار الخلافہ بنانا مناسب سمجھا۔ مرکزِ خلافت کی یہ تبدیلی اس لیے بھی ضروری تھی کہ حضرت علیؓ کی فوج میں عظیم ترین

[1] تاریخ اسلام پروفیسر سید عبد القادر مرحوم صفحہ ۳۶۲، ۳۶۳

طاقت اہلِ کوفہ کی تھی۔ اور کوفہ مدینہ کی نسبت دمشق سے قریب تر بھی تھا۔[1]

۳ ۔ مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی لکھتے ہیں :-

"جنگِ جمل کے بعد حضرت علیؓ نے مدینہ منورہ چھوڑ کر کوفہ میں مستقل اقامت اختیار کی اور دار الحکومت حجاز سے عراق کو منتقل ہو گیا لوگوں نے اس تبدیلی کے مختلف وجوہ بیان کیے ہیں مگر میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ حضرت عثمان کی شہادت سے حرم نبوی کی جو توہین ہوئی اس نے علی مرتضیٰؓ کو مجبور کیا، کہ وہ آیندہ سلطنت کے سیاسی مرکز کو علمی اور مذہبی مرکز سے علیحدہ کر دیں۔ ایک وجہ یہ تھی کہ کوفہ میں حضرت علیؓ کے طرفداروں اور حامیوں کی اس وقت سب سے بڑی تعداد تھی۔ گو حضرت علیؓ نے مدینہ کو سیاسی شر و فساد سے بچانے کے لیے عراق کو دار الحکومت بنایا تھا۔ لیکن اس کا کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوا اس سے مدینہ کی سیاسی حیثیت ختم ہو گئی۔ اور خود علیؓ مرکزِ اسلام سے دور ہو گئے۔ جو سیاسی حیثیت سے آیندہ ان کے لیے مضر ثابت ہوا"[2]

میرے نزدیک حقیقت یہ ہے جس طرح ابوسفیان سرکارِ رسالت محمد مصطفیٰ ارواحنا لہ الفدا کی مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا باعث ہوا۔ اسی طرح اس کا بیٹا معاویہ گورنرِ شام خلیفۂ رسول حضرت علیؑ

---

[1] تاریخِ اسلام مولفہ اکبر شاہ نجیب آبادی جالندھری صفحہ ۲۳۲

[2] سیر الصحابہ حصہ مہاجرین کی پہلی جلد خلفائے راشدین صفحہ ۲۹۷

کی خلافت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے حضرت علیؑ کی مدینہ طیبہ سے کوفہ کی طرف ہجرت کا سبب ہوا۔

جمہور کہتے ہیں کہ سرکارِ رسالت کے زمانے میں مستقرِ سلطنت مدینہ منورہ تھا۔ پہلی اور دوسری اور تیسری خلافتوں کے زمانوں میں بھی مدینہ طیبہ دارالسلطنت رہا۔ حضرت امیرؑ نے مدینہ کی بجائے کوفہ کو دارالخلافہ قرار دیا۔

اس کا کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوا۔ اس سے مدینہ کی سیاسی حیثیت ختم ہو گئی اور خود علیؑ مرکزِ اسلام سے دور ہو گئے۔ جو سیاسی حیثیت سے آیندہ ان کے لیے مضر ثابت ہوا۔

حکیمِ اسلام حضرت علیؑ کے اقوال تدبّر و تفکّر چاہتے ہیں۔ ان کے لیے گہرے فکر کی ضرورت ہے۔ ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے نگاہِ بصیرت اور نورِ فراست درکار ہے۔ اگر انسان ایسا ہو جس کے متعلق کسی شاعر نے کہا ع

تو بہ تاریکی علی را دیدہ

تو وہ علی علیہ السلام کے اقوال و افعال کے علل و حکم کو کیا خاک سمجھے گا۔ آیئے حضرت علی علیہ الصلوٰۃ و السلام کے کوفہ کی طرف ہجرت اور اسے دارالخلافہ قرار دینے کے مصالح و حکم پر غور کریں۔ اور دیکھیں کہ حکیمِ اسلام بلکہ حکیمِ الٰہی نے مدینہ طیبہ کی بجائے کوفہ کو کیوں دارالسلطنت بنایا اور پھر ان کے اس فعل سے دینِ اسلام کن کن مفید امور سے مستفید ہوا۔

۱۔ پہلی وجہ تو وہی ہے جسے حضرت علی ابن ابی طالب کے اقوال و اعمال کو سرسری نظر سے دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ چونکہ حضرت علی علیہ السلام کے زمانے میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی اور جنگ کے مرکزی مقامات مدینہ سے دور تھے اور کوفہ سے نزدیک تھے اس لیے جناب امیر علیہ السلام کو جنگی وجوہات سے مدینہ کی بجائے کوفہ کو دارالخلافہ بنانا پڑا۔ یہ وجہ بھی معقول ہے۔ اور اسی وجہ کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی ہجرت کا سبب گورنر شام حضرت معاویہ کی بغاوت تھی۔

۲۔ مسلمانوں کے عام فتوحات کی وجہ سے دنیا کی مختلف قومیں جو تہذیب و تمدن میں مختلف تھیں۔ اخلاق و معاشرت میں مختلف تھیں مسلمانوں کے زیر نگین آچکی تھیں۔ مدینہ طیبہ اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی اخلاق و معاشرت کا گہوارہ تھا۔ اگر یہ مرکز روحانیت سلطنت کا مرکز و مستقر بھی رہتا تو ان اقوام مختلفہ کے افراد کا سیاسی ضروریات کے لیے ریاست کے صدر مقام میں جمع ہونا ناگزیر تھا۔ اس لیے اقوام مختلفہ کے اس اختلاط سے اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی اخلاق و معاشرت کے مٹ جانے یا کم از کم مخلوط ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے حکیم اسلام علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اسلام کی متاع عزیز کو مٹنے یا غلط ملط ہونے سے بچا لیا۔ اور صوبہ حجاز بالعموم اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ اسلام کے مرکز روحانیہ اس

ثقافتی تصادم سے محفوظ رہے ۔ ہم معین الدین صاحب ندوی سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ مفید نتیجہ نہیں ؟

۳ ۔ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کے صدر مقام دنیا بھر کی برائیوں دنیا بھر کی قبائح ، دنیا بھر کے فسق و فجور کے مرکز ہوتے ہیں ۔ اگر یقین نہ آئے تو لندن ، پیرس یا واشنگٹن جا کر دیکھ لیجیے کیونکہ مختلف اقوام و ملل کے لوگ سیاسی ضروریات کی وجہ سے صدر مقام میں آتے ہیں اور اپنی تمام برائیاں (VICES) اپنے ساتھ لاتے ہیں ۔ اور ان کے ذریعہ یہ قبائح عام ہو جاتی ہیں جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں اس حقیقت کی نقاب کشائی دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کے صدر مقام لندن ، پیرس اور واشنگٹن کر رہے ہیں ۔ دنیا کی کون سی برائی ہے جو ان شہروں میں موجود نہیں ۔

مدینہ اسلامی دولت مشترکہ کا سیاسی صدر مقام ہی نہیں تھا بلکہ وہ مرکز روحانیت تھا جہاں متمم مکارم اخلاق محمد مصطفےٰ ارواحنا لہ الفدا مدفون ہیں اگر اس مرکز روحانیت میں فواحشات و فسق و فجور عام ہو جاتا تو اس کا اسلام کی تبلیغ پر بہت بُرا اثر پڑتا ۔ اس لیے کہ اسلام اقوام عالم کو بلند اخلاق ، تزکیہ و تطہیر کی دعوت دے رہا تھا ۔ اور اپنے نظریات اور اصولوں اور اپنی تعلیم و تربیت سے گناہ اور معصیت کے تصور کو مٹانے کا مدعی تھا ۔ اگر اسلام کے ان بلند آہنگ دعووں کے برعکس مرکز روحانیت اسلام میں برائیاں عام ہوتیں تو دنیا کہتی کہ اسلام پر

تو یہ مثل صادق آتی ہے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہیں اور دکھانے کے اور ہیں۔ اس لیے جناب امیرؑ نے دارالخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل فرما کر مدینہ منورہ کی تقدیس و تمجید کو بھی برقرار رکھا اور تبلیغ اسلام کو بھی ان برے اثرات سے بچا لیا۔ جو اس صورت سے نمایاں ہوتے، اگر حکیم اسلام علیؑ کا یہ اقدام نہ ہوتا تو مدینہ، مدینۂ طیبہ نہ ہوتا۔

کیا یہ مفید نتیجہ نہیں؟

۴۔ قرآن حکیم کی زبان "عربی مبین" ہے اور اس زبان کے روزمرہ کا گہوارہ سرزمینِ حجاز مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے شہر تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بین الاقوامی دارالسلطنت میں مختلف زبانیں بولنے والے انسان جمع ہوتے ہیں۔ اس لیے دنیا کے بڑے بڑے سیاسی صدر مقاموں کی زبان بگڑ جاتی ہے۔ اگر مدینہ ہی سیاسی صدر مقام رہتا تو یہاں کی زبان "عربی مبین" بگڑ جاتی۔ چونکہ ابھی تک علوم قرآنیہ تفسیر و تجوید وغیرہ کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے قرآن حکیم کے معانی کے افہام و تفہیم کے لیے اس زبان کے روزمرہ کا قائم رکھنا ضروری تھا۔ جس میں قرآن حکیم نازل ہوا تھا۔ اس لیے حکیم اسلام علی ابن ابیطالب نے کوفہ کو صدر مقام قرار دے کر عربی مبین کے روزمرہ کو بگڑنے سے بچا لیا۔ یہ حضرت علیؑ بن ابی طالب کا علوم قرآنیہ پر احسان ہے۔ کیا یہ مفید نتیجہ نہیں؟

۵۔ بنی امیہ پہلی تین خلافتوں میں شام میں کافی اقتدار حاصل کر چکے تھے اور اس اقتدار سے ان میں تکبّر، تبختر، عیاشی، رنگیلا پن اور قیصر و کسریٰ کی ملوکانہ زندگی آ گئی تھی اس لیے شام اور اس کے گرد و نواح سے اسلام کی سادگی، مساوات، ایثار، مواسات، سب روپوش ہو گیا تھا۔ جناب امیر علیہ السلام اموی رنگیلے شہزادوں کے قریبی علاقوں میں رہ کر اسلام کی امتیازی خصوصیات کو پیش کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ دنیا و دین کا حقیقی تاجدار کوفے کے باغوں میں محنت مزدوری کرتا ہے اور اس سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہے۔ اور اسلامی بیت المال سے ایک پیسہ نہیں لیتا بلکہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے غلاموں کو خرید کر آزاد کرتا ہے۔ سخت غذا جَو کی روٹی پر گزارا کرتا ہے اور اس کے دستر خوان پر ایک سے زیادہ سالن نہیں ہوتا، اس کے پاس ایک ہی لیف خرما کا پیوند دار پیراہن ہے جسے وہ ہر جمعہ کو دھو کر پہنتا ہے اور تقریر کرتے ہوئے اس کو سکھاتا بھی جاتا ہے۔ نہ اس کے دروازہ پر دربان ہے نہ اس کے مکان پر پاسبان۔ وہ فقیروں میں زمین پر آ بیٹھتا ہے، دار الخلافہ کو کوفہ میں لا کر امیر المومنین بنی امیہ کی عیاشی سے متاثر علاقوں کے قریب اسلامی زندگی اور مساوات کا نمونہ پیش کرنا چاہتے تھے۔

کیا یہ مفید بات نہ تھی؟

۶۔ اسلام میں ایک خوبی ہے۔ اس میں جاہل سے جاہل اور سادہ سے

سادہ کسان، چرواہے اور مزدور کے لیے اطمینان کا سامان موجود ہے اور اسی طرح بلند فلسفی اور ادیب کے لیے بھی، عرب سادہ تھے۔ اس لیے فلسفیانہ نکات اور علم و حکمت کی باریکیوں کو سمجھنے کی ان میں اس قدر صلاحیت نہ تھی۔ جس قدر صلاحیت ایرانیوں میں تھی اس لیے سرکارِ رسالتؐ نے ان کی بلند ذہنیت ان کے ذہن و ذکا اور ان کی فراست اور جودتِ طبع کو پرکھ کر کہا تھا۔ لو کان الایمان فی الثریا لوجدہ اھل الفارس۔ اگر ایمان ثریا ستاروں میں بھی ہو اہلِ فارس وہاں سے بھی اسے پالیں گے، جناب امیر علیہ السلام کے یہ نبوی اشارہ پیشِ نظر تھا، وہ چاہتے تھے کہ کسی مقام پر کہ جہاں ایرانیوں کی عام آمد و رفت ہو قیام پذیر ہوں، اور اپنے فلسفہ و حکمت کو ایرانیوں جیسی ذہین اور بافراست قوم کے سپرد کر سکیں۔ اس زمانے میں کوفہ بین الاقوامی منڈی تھا۔ جہاں ابنائے عرب و ایران تبادلۂ اجناس کرتے تھے جناب امیر علیہ السلام نے کوفہ کو مستقر بنا کر اپنے علم و حکمت کو ایرانیوں میں نشو و نما دی۔ اگر آپ اسلام کے علوم و فنون کی تاریخ پڑھیں تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جس قدر ایرانیوں نے اسلام کے علوم و فنون، حکمت و فلسفہ و ادب کی خدمت کی وہ عربوں کو نصیب نہیں ہوئی۔ ان مختلف علوم و فنون کے علمبرداروں میں کوئی رازی ہے کوئی نیشاپوری، کوئی کوفی ہے

کوئی بخاری، کوئی غزالی ہے کوئی طوسی، کوئی ترمذی ہے تو کوئی تفتازانی۔ اور یہ علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام کے مدینہ سے ہجرت کرکے کوفہ میں آنے اور اسے اپنا مستقر بنانے کا نتیجہ ہے۔

کیا یہ مفید نتیجہ نہیں ؟

۷۔ اللہ کا حبیب محمد مصطفےٰؐ اس شہر میں پیدا ہوا جہاں اللہ کا گھر تھا، اور احدیت جلوہ نما تھی، اللہ نے ہجرت کا حکم دیا تاکہ ختم نبوت مدینہ میں منتقل ہو جائے۔ مکہ مرکزِ احدیت رہے اور مدینہ مرکزِ ختمِ رسالت"۔ اسی مصلحت کی بنا پر علیؑ کوفہ میں منتقل ہوئے تاکہ کوفہ کے مضافات میں نجفِ اشرف کی زمین مرکزِ ولایت وامامت بنے۔ اگر حجاز میں دو مرکز روحانیت ہوں تو عراق میں بھی کچھ مراکز روحانیت ہونے چاہئیں۔ اس لیے علیؑ کوفہ میں منتقل ہوئے تاکہ نجفِ اشرف کی زمین میں علم و روحانیت کا ایک ایسا مرکز قائم ہو جائے جہاں بابِ علمِ نبوی کی بارگاہ سے ہزاروں نفوس علوم اسلامیہ سے مالامال ہو کر نکلیں اور ساری دنیا کو فیوضِ علمیہ سے سیراب کریں۔ علی علیہ السلام مرکزِ اسلام سے دور نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے ایک نیا عظیم الشان مرکز اسلام قائم کر دیا۔ جو مدینہ طیبہ سے اسی طرح مربوط ہے۔ جیسا مدینۂ طیبہ مکہ مکرمہ سے معنوی طور پر ملحق ہے کیا یہ اقدام حضرت علیؑ کے لیے مُضر ثابت ہوا ؟

کیا یہ مفید نتیجہ نہیں ؟

۸ ۔ حضرت علی علیہ السلام مدینہ کی سیاسی حیثیت کو ختم کرنا چاہتے تھے کیونکہ مسلمانوں میں سیاستِ ربانیہ کی جگہ قیصر و کسریٰ کی مادی سیاست قائم ہو چکی تھی اور اس سیاست کے تحت مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کا احترام ہمیشہ خطرہ میں تھا۔ علی علیہ السلام اس احترام کی پاسداری کے لیے کوفہ کی طرف منتقل ہوئے۔ اور امام حسین علیہ السلام نے مدینہ اور کوفہ کو خیرباد کہہ کر کربلا کو کربلائے معلیٰ بنایا۔ جب کبھی بھی اربابِ سیاست کا رُخ مدینہ یا مکہ کی طرف ہوا تو ان مقامات مقدسہ اور عتباتِ عالیہ کی بے حرمتی کی انتہا نہ رہی۔ شہادت امام حسین علیہ السلام کے بعد عہدِ یزید میں اموی سیاست نے مدینہ طیبہ کا رُخ کیا۔ یزید نے مسلم بن عقبہ کو سالارِ لشکر بنا کر اہلِ مدینہ کے قتل و غارت کے لیے بھیجا تو اس نے حرہ کے مقام پر اہلِ مدینہ کو نہایت ذلت کے ساتھ قتل کیا اور تین دن تک حرم نبوی کی بے حرمتی کی۔ مہاجرین و انصار و تابعین اخیار جو اس واقعہ میں قتل ہوئے ان کی تعداد ایک ہزار سات سو ہے۔ اور عوام الناس دس ہزار تہ تیغ کر دیے گئے۔ عورت و اطفال اس شمار میں داخل نہیں۔ سات سو حفاظِ قرآن اور ستانوے قریشی تہ تیغ بے دریغ ہوئے فسق و فجور و زنا علانیہ مباح کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد ایک ہزار عورتوں نے حرام کے بچے جنے، مسجدِ نبوی کے اندر گھوڑے باندھے گئے اور روضۂ رسولؐ میں گھوڑوں نے بول و براز کیا۔ جو اہلِ مدینہ

قتل سے بچ گئے، وہ یزید کی بیعتِ غلامانہ پر اس شرط کے ساتھ مجبور کیے گئے، کہ یزید چاہے ان کو بیچ ڈالے چاہے آزاد کرے، چاہے ان سے خدا کی اطاعت کرائے چاہے ان کو خدا کی نافرمانی کا حکم دے[1]

ان حالات میں کیا مدینہ کی سیاسی حیثیت کا قائم رہنا مفید تھا؟ بلکہ یزید بن معاویہ کے زمانہ میں ہی مکہ معظمہ سیاست کا ہدف بنا، مسلم بن عقبہ نے مہم مدینہ کو سر کر کے بحالتِ بیماری مکہ کی جانب رخ کیا۔ مگر وہاں پہنچنے سے پہلے ہی راہ میں مر گیا۔ اور اپنا قائم مقام حصین بن نمیر کو کر گیا۔ حصین بن نمیر نے مکہ معظمہ پہنچکر عبداللہ بن زبیر کا محاصرہ کیا اور خانہ کعبہ پر سنگباری کر کے آگ لگادی۔ عبداللہ بن زبیر کے محاصرہ کو چالیس دن گزرے تھے کہ دفعتاً یزید کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی[2]

جب حصین بن نمیر کو مرگِ یزید کی خبر پہنچی تو اس نے مکہ سے راہِ فرار اختیار کی[3]

یہ ہیں سیاسی حیثیت کے نتائج۔ کیا سیاسی حیثیت کا ہونا مفید ہے یا اس کا ختم ہو جانا۔ پھر عبدالملک بن مروان کے زمانے میں مکہ معظمہ سیاست کا تختۂ مشق بنا۔ حجاج اور اصحاب ابن زبیر میں کئی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر

---

[1] جذب القلوب عبدالحق محدث دہلوی، حج الکرامہ نواب صدیق حسن خاں، تاریخ احمدی صفحہ ۳۴۳-۳۴۴

[2] تاریخ ابوالفدا، تاریخ احمدی صفحہ ۳۳۴ و صفحہ ۳۳۵ [3] جذب القلوب، تاریخ احمدی صفحہ ۳۳۵

کو عبداللہ بن زبیر محصور ہو گئے اور حجاج نے بیت اللہ پر سنگ باری شروع کر دی۔ ۷۲ھ کے اختتام تک یہ حالت قائم رہی۔ آخر جمادی الاخریٰ ۷۳ھ میں سات مہینہ قتال کرنے کے بعد عبداللہ بن زبیر مقتول ہوئے۔[1]

یہ ہیں مقامات مقدسہ میں سیاسی حیثیت کے قائم رکھنے کے نتائج

کہ ؏ ہیچ کافر نکند آنچہ مسلماں کردند

۹۔ جناب امیر علیہ السلام کے مدینہ سے دارالحکومت کو تبدیل کر کے کوفہ میں لے جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ سرکارِ رسالتؐ تمام بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ ان کی بعثت کافۃ للناس تھی۔ اور اس زمانے میں انسانیت چار نسلوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔

۱۔ سامی نسل۔ (Sematic Race) اس نسل سے عرب اور بنی اسرائیل تھے اور جناب رسالتمآب خود اسی نسل سے تھے۔

۲۔ آریائی نسل (Aryan Race) اسلام میں اس نسل کی نمائندگی سب سے پہلے حضرت سلمان نے فرمائی۔ جن کی محبت نے رسول اللہؐ کی زبان سے السلمان منا اھل البیت کا امتیاز حاصل کیا۔

---

[1] تاریخ ابن الوردی، تاریخ احمدی ص ۲۳۹

کانت مودۃ سلمان لہ نسباً
ولم یکن بین نوح وابنہ رحماً
"حضرت سلمان کی محبت ان کا نسب بن گئی اور حضرت نوحؑ
اور ان کے بیٹے میں کوئی رشتہ و رابطہ نہ رہا۔"
۳۔ تاتاری نسل (Mongolian Race) اس کا اسلام
میں پہلا ثمرہ حضرت صہیب رومی تھے۔
۴۔ افریقائی نسل (African Race) جس کی شیدائے
توحید شخصیت، حضرت بلال نمائندگی کر رہے تھے۔
ان تمام نسلوں کے انسانوں سے رابطہ پیدا کرنا اللہ کے مقبول محمدؐ و
آلِ محمدؐ علیہم السلام کا اہم و اولین فریضہ تھا تاکہ ان کی نسلی عصبیت
(Racial Antagonism) کو دور کیا جائے۔ اور ان کی
اجنبیت کو رفع کرکے ان کو اسلام سے مانوس کیا جائے۔ دارالخلافہ
کا تبدیل کرنا اس سلسلہ کی پہلی کڑی اور اس جدوجہد کا اولین
اقدام تھا۔ آریائی نسل کو عربوں سے نسلی عصبیت کی وجہ سے
سخت نفرت تھی۔ چنانچہ فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں ایرانی شاہزادہ
کا جو قول نقل کیا ہے وہ اسی نفرت کا مظہر ہے۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار	عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو	تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اور چونکہ ایران بزور شمشیر فتح ہوا تھا اور تاریخ بتاتی ہے کہ فتح

ایران کی لڑائیوں میں لاکھوں ایرانی قتل ہو چکے تھے۔ جنگِ بویب میں جو ۱۳ھ میں ہوئی ایک لاکھ ایرانی مارے گئے تھے۔ چنانچہ اکبر جالندھری لکھتے ہیں :-

" مثنیٰ نے پُل توڑ دیا جس سے بے شمار ایرانی تلوار کے گھاٹ اُتر گئے اور بہت سے دریا میں غرق ہو گئے "[1]

جنگِ قادسیہ میں تیرہ ہزار مسلمان کام آئے اور ایک لاکھ ایرانی قتل ہوئے[2]

جلولا کی جنگ میں ایک لاکھ ایرانی مارے گئے اور تین کروڑ کا مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا[3]

نہاوند کی لڑائی میں ڈیڑھ لاکھ ایرانی قتل ہوئے[4]

ایرانیوں کے اس کشت و خون سے نسلی عصبیت میں بھی اضافہ ہوا اور وہ شدید نفرت پیدا ہوئی جو ہر مفتوح قوم کو فاتحین سے ہوتی ہے جناب امیر علیہ السلام دارالخلافہ کو کوفہ میں منتقل کر کے نسلی عصبیت اور قومی نفرت کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ عسکری منظر کے علاوہ روحانی مناظر ایرانیوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں المدرج عماد الدین حسین اصفہانی الشہیر بعماد زادہ لکھتے ہیں :-

" ایران کو عراق کی ہمسائیگی اور جوار حاصل تھا۔ ایرانیوں کی

---

[1] تاریخ اسلام جلد ۲ تالیف اکبر جالندھری صـ ۱۲۹ [2] تاریخ اسلام سید عبد القادر مرحوم صـ ۲۴۱ [3] تاریخ خلافتِ اسلامیہ صـ ۱۰۸
[4] تاریخ خلافتِ اسلامیہ صـ ۱۱۳

قابلیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہمیشہ اپنی لیاقت، قدرت فعالیت اور شخصیت کے اظہار میں کوشاں رہے۔ انھیں دارالخلافہ کے بدلنے سے امیر المومنین علیہ السلام نے ایرانیوں کی تربیت و تہذیب، ارتقائے عمل و روشنائی فکر میں نہایت اہم اثرات پیدا کیے ہیں۔ ایک ایسی سرزمین جو کلدانی اور سریانی تہذیبوں کا گہوارہ رہی تھی اور جس پر قبائل ربیعہ و مضر اثرانداز رہے تھے، جو سرزمین بڑی بڑی سلطنتوں کا مرکز رہی جناب امیر علیہ السلام نے ان کی اسلامی تربیت سے ایک انقلاب پیدا کر دیا۔"[1]

پھر یہی مورخ لکھتا ہے:-

"جناب امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے زمانۂ خلافت میں (اپنے تربیت دیے ہوئے) ایرانیوں کو مختلف امور پر مامور کیا اور انھوں نے فنون علم و ادب میں شایان شان فعالیت کا ثبوت دیا۔ چنانچہ دفاترِ اسلام کی تنظیم ان ہی کے ہاتھ سے عمل میں آئی۔"[2]

مشہور اہلِ قلم خلیل جبران مجلہ "العرفان" طبع صیدا میں تحریر فرماتے ہیں:-

"میرے عقیدہ میں علیؑ ابن ابی طالب پہلے عرب ہیں جنھوں نے پوری اسپرٹ کے ساتھ سرکارِ رسالتؐ کا قرب اور ہمسائیگی اختیار

---

[1] امیر المومنین، زندگانی حضرت علیؑ ابن ابی طالب (فارسی) ص۳۶۷ و ص۳۶۸

[2] امیر المومنین (فارسی) ص۳۶۹

کی اور دن رات آنحضرتؐ کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے اور وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے دو لبوں سے رسول اللہؐ کے کلام و آہنگ کا اعلان کیا۔ اور ایسے لوگوں (یعنی ایرانیوں) تک رسول اللہؐ کی حقیقی آواز اور مقاصد کو پہنچایا جنھوں نے اس آواز کو نہیں سنا تھا اور وہ اس سے آشنا نہیں تھے اور انھوں نے اپنے فصیح و بلیغ کلام سے سننے والوں کی حیرت و استعجاب کو اس قدر بڑھایا کہ وہ کانپ اٹھے۔

جن لوگوں نے علی علیہ السلام سے لڑائی جھگڑے کیے وہ ابنائے جاہلیت اور نادان زادے تھے، علیؑ دنیا سے شہیدِ عظمت ہو کر رخصت ہوئے اور جب زخمی ہوئے اللہ کی عبادت نماز ان کے دونوں لبوں میں جاری تھی۔ ایسی حالت میں وہ دنیا سے رحلت فرمائے آخرت ہوئے کہ ان کا دل اپنے پروردگار کے شوق و اشتیاق سے لبریز تھا۔ عرب عناصر نے علیؑ کو نہ پہچانا، یہاں تک کہ علیؑ نے کوفہ کو دارالسلطنت بنا کر عرب کے ہمسایہ میں ایک ایسی قوم یعنی ایرانیوں کو اپنے اثرات سے متاثر کیا کہ انھوں نے سنگریزہ اور جواہر میں شناخت کی اور فرق و تفاوت معلوم کیا۔

عرب جو صدرِ اسلام میں رسمِ جاہلیت سے کینہ و عناد کا مظاہرہ کر رہے تھے انھوں نے علیؑ کو نہیں پہچانا، ہجرت

کے بعد سالہا سال تک علی علیہ السلام بنی امیہ کی خواہشات اور خصومت و عناد کا تختۂ مشق رہے۔ اس لیے ان کا حقِ معرفت ادا نہ ہوا۔ اور ان کا بلند مقام ضائع ہوتا رہا۔ فتح ایران کے بعد ایرانیوں نے کوفہ میں اس امر پہ توجہ کی نظر ڈالی انھیں سنگ ریزوں میں جواہرات پا کر ان کی معرفت پہ قیام کیا۔ ان کی نصرت اور اعانت میں گامزن ہوئے۔ اور ان کے مقدس افکار و مقاصد کی نشر و اشاعت میں فداکاری و جاں نثاری دکھلائی۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ایرانیوں نے دنیا میں علی علیہ السلام کا تعارف کرایا تو یہ اغراق و مبالغہ نہیں۔ کیونکہ عرب شیعہ آدابِ عربیت کے زیر اثر اس خدمت کو انجام نہ دے سکے۔ لیکن ایرانیوں نے اسے خوب سمجھ لیا تھا کہ علیؑ دانشگاہِ عالم کے بہترین استاد ہیں اور ان ہی کی رہنمائی میں ہم توفیقاتِ الٰہیہ کے شاہد کو اپنی آغوش میں لے سکتے ہیں۔ اور تہذیب و مدنیت کے انتہائی عروج پہ پہنچ سکتے ہیں"۔ ؎۱

اور جناب امیر علیہ السلام کے عہد میں جب ایران شاہی خاندان کی دو شاہزادیاں شہر بانو اور کیہ بانو دربارِ خلافت میں آئیں تو آپ نے شہر بانو کا عقد حضرت امام حسین علیہ السلام اور کیہ بانو کا محمد بن ابی بکر سے کیا۔ شہر بانو سے جو اولاد پیدا ہوئی وہ ائمہ اہل بیتؑ تھے۔ ان رہنماؤں کی رہنمائی میں

؎۱ امیر المومنین (فارسی) زندگانی علیؑ بن ابی طالب ص ۳۶۹ و ص ۳۷۰

ایرانیوں کی نسلی عصبیت اور مفتوحانہ نفرت کا جذبہ ختم ہوگیا۔ اور ایران نے اسلام کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔

۱۰۔ تبدیلیٔ دارالحکومت کا ایک سبب یہ تھا کہ حضرت علیؑ ابن ابیطالب کوفہ اور اس کے مضافات کو اپنی اولاد سے متعارف کرانا چاہتے تھے تاکہ مدینہ سے یہ دُور افتادہ علاقہ اس خاندان کو پہچان لے جس نے انھیں اسلام کی دولت سے مالامال کیا ہے۔ وہ علمِ امامت نیز فراست سے جانتے تھے کہ ایک دن اس خاندان کو مصائب و آلام میں مبتلا ہو کر اسی سرزمین پر آنا ہے۔ آج یہ انھیں پہچان لیں۔ قیامِ کوفہ میں حضرت زینب سلام اللہ علیہا عورتوں کو درس تفسیر و حدیث سے مستفید فرماتی رہیں، اس سے مقصود بھی تعارف تھا، علی علیہ السلام چاہتے تھے ان کے اخلاق، ان کے تمدن ان کی معاشرت کا عرفان اہلِ عراق حاصل کرلیں، اگر زینب طاہرہؑ کو بھی کوفہ کے بازار میں تقریر کرنا پڑے تو میرے لب و لہجہ سے مانوس فوراً پکار اٹھیں کہ یہ مخدّرہ تو بازارِ کوفہ میں اس طرح تقریر فرما رہی ہیں جیسے سلونی کہنے والے علیؑ مسجدِ کوفہ کے منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے ہوں، ان کے حجاب اور ان کے عزت و ناموس کی معرفت حاصل ہو جائے۔ اور کوفہ کی دنیا انکے اصولوں سے آشنا ہو جائے۔

تلك عشرة كاملة

علیؑ ابن ابی طالب کو اللہ اور رسولؐ کے لیے مدینہ سے ہجرت فرما کر پھر مدینہ جانا نصیب نہ ہوا۔ یہ مہاجر امام مسجدِ کوفہ میں شہید ہوئے اور نجفِ اشرف میں مدفون، ان پر قرآن حکیم کی یہ آیت صادق آتی ہے۔

"جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہجرت کرے، گھر سے نکلے، پھر اسے موت پالے تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔"

نظم و نسق میں تبدیلی

جناب امیرالمومنین علیہ السلام بصرہ کی عنانِ حکومت حضرت عبداللہؓ ابن عباس کے سپرد کر کے خود مع فوج عازمِ کوفہ ہوئے۔ قیامِ کوفہ کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے نظم و نسقِ خلافت میں ایک نئی تبدیلی کر دی اور اس نظامِ نو کے ماتحت گورنروں کا تقرر اس طرح ہوا:۔

مقام	گورنر	مقام	گورنر
۱۔ مدینہ	سہل بن حنیف	۲۔ مصر	قیس بن سعد
۳۔ مدائن	یزید بن قیس ارحبی	۴۔ آذربائیجان	اشعث بن قیس
۵۔ بحرین	عمر بن ابی سلمہ	۶۔ کوار خیر خود	مصلقہ بن ہبیرہ
۷۔ اصطخر	منذر بن جارود	۸۔ فارس	زیاد بن ابیہ
۹۔ کسکر	قدامہ بن عجلان	۱۰۔ بہرہ شیر	عدی بن حاتم

مقام	گورنر	مقام	گورنر
۱۱۔ سیستان	ربعی بن کاس	۱۲۔ خراسان	خلید بن کاس

۱۳۔ موصل، نصیبین، دار ہجر، نجار، آمد میا فارقین ہیت عانات اور شام کے علاقے۔ اشتر نخعی [1]

کوفہ پہنچ کر جب حضرت علیؓ نے اپنے مقبوضات میں نئے سرے سے حکام و عمال کا تعین کیا، اس وقت سوائے شام اور فلسطین کے باقی تمام عالمِ اسلام یعنی مصر، عرب، عراق، ایران، اور خراسان حضرت علیؓ کے زیر اقتدار تھے [2]

خراسان میں بغاوت

جب حضرت خلید بن کاس خراسان پہنچے تو انھیں خبر ملی کہ خاندان کسریٰ کی ایک لڑکی نے نیشاپور پہنچ کر بغاوت کرا دی ہے۔ چنانچہ انھوں نے نیشاپور پر فوج کشی کر کے بغاوت فرو کی اور اس کو بارگاہِ خلافت میں بھیج دیا۔ جناب امیرؑ نے اس کے ساتھ نہایت لطف و کرم کا برتاؤ کیا۔ اور اس سے فرمایا، کہ اگر وہ پسند کرے تو اپنے فرزندِ اکبر حضرت امام حسنؑ سے نکاح

---

[1] تاریخ اسلام مولفہ نشتر جالندھری صـ ۲۳۲ و صـ ۲۳۳

[2] تاریخ اسلام مولفہ سید عبدالقادر مرحوم صـ ۳۶۳

کردیں۔ اس نے کہا کہ وہ ایسے شخص سے شادی کرنا نہیں چاہتی جو ابھی خود مختار نہ ہو۔ اگر خود جناب امیر اپنے عقد نکاح سے مشرف فرمائیں تو بطیب خاطر حاضر ہوں ۔ حضرت علیؓ نے انکار فرمایا اور اسے آزاد کر دیا کہ جہاں چاہے رہے اور جس سے چاہے بیاہ کرے[1]

---

[1] سیر الصحابہ جلد ا خلفائے راشدین ص ۲۹۸

جنگِ صفین

اسباب

بنی ہاشم اور بنی امیہ کی مخالفت

عبد مناف کے فرزندوں میں ہاشم بڑے باصولت اور صاحب اثر تھے اگرچہ ان کے بھائیوں میں عبد الشمس کا بھی شمار تھا مگر اپنے باپ کے اوصاف و مراتب کی پوری شان ہاشم میں ہی نظر آتی تھی۔ اس لیے وہ تمام امتیازات جو عبد مناف کو حاصل تھے وہ ان کے بعد ہاشم کے لیے تسلیم کیے گئے۔

امیہ جو اپنے کو عبد الشمس کا بیٹا کہتا تھا اس نے ہاشم کا مقابلہ کرنا چاہا! اور کوشش کی کہ عزت اور سرداری کا تاج حضرت ہاشم کے سر سے اتارے مگر نتیجہ میں ناکامی اور رسوائی ہوئی۔ مخالفت کی آگ کے شعلے حسرت اور بیچارگی کے ساتھ وقتی طور پر بیٹھ گئے مگر دل میں حسد اور عداوت کی چنگاریاں سلگنے کے لیے رہ گئیں۔

بنی ہاشم اور بنی امیہ کے اختلافات کی ابتدا یہیں سے

ہے[1] بنی ہاشم اور بنی امیہ کا اختلاف قبائلی عناد نہ تھا بلکہ دونوں قبیلوں کی طبیعتیں متضاد تھیں۔ چنانچہ مصر کے دورِ حاضر کے مفکر عباس محمود العقاد اپنی تالیف ابوالشہدا میں مزاجانِ مختلفان کے عنوان سے لکھتے ہیں:۔

"بنی ہاشم موحّد خدا پرست تھے تو بنی امیہ ماحول کے اثرات سے بُت پرست ہو چکے تھے۔ بنی ہاشم میں شفقتِ خلق کا جذبہ تھا تو بنی امیہ سرمایہ دارانہ ذہنیت سے انسانیت کا خون چوستا چلے جاتے تھے۔ بنی ہاشم عفیف و پاکدامن بنی امیہ رنگیلے مزاج عیاش، بنی ہاشم ایثار و قربانی سے موصوف، بنی امیہ اقتدار دوست خود غرض۔ بنی ہاشم مجسمۂ روحانیت صاحبانِ سیاست ربّانیہ، بنی امیہ مجسمۂ مادیت علمبردارِ سیاستِ مادیہ[2] طبیعتوں کا یہ اختلاف رنگ لایا، ابوسفیان تا امکان محمد مصطفےٰ سے لڑتا رہا۔ معاویہ بن ابی سفیان نے حضرت علیؑ سے بغاوت کی اور متعدد لڑائیاں لڑا اور ہزارہا مسلمانوں کا خون اس بغاوت سے بے دریغ بہا۔ اور اس کا بیٹا یزید اسی خونریزی کا باعث ہوا جو دردِ دل رکھنے والے انسان کو قیامت تک خون کے آنسو رلاتی رہے گی اور بنی امیہ کے تاجداروں نے بنی ہاشم کے

---

[1] شہیدِ انسانیت ص ۔ ۲
[2] ابوالشہدا باب اوّل تحت عنوان مزاجانِ مختلفان

خون بہانے میں کبھی دریغ نہ کیا۔

تاریخ اسلام میں سید عبد القادر مرحوم پروفیسر محمد شجاع الدین لکھتے ہیں :۔

"بنی ہاشم اور بنی امیہ قریش کے ایک معزز خاندان کی دو شاخیں تھیں ۔ رسولِ خدا ہاشمی تھے آپ نے اعلانِ نبوت کیا تو بنی امیہ آپ کی مخالفت میں پیش پیش رہے ۔ تا کہ عرب کی سرداری ہاشمی کو نہ مل جائے ۔ بدر اور احد کی جنگوں میں متعدد اموی سردار رسولِ کریمؐ کے خلاف رہے اور ان میں سے اکثر حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ کی بے پناہ تلواروں کا شکار ہو گئے ۔ فتح مکہ کے بعد ابو سفیان ، معاویہ وغیرہ بہت سے اموی مسلمان ہو گئے "[1]

ان کے مسلمان ہونے کی حیثیت یہ ہے کہ جب امویوں کی قوت بالکل ٹوٹ گئی ۔ اب اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے انھوں نے قبولِ اسلام کی نقاب اوڑھ لی ۔ اور وہ موقع کے منتظر رہنے لگے کہ کب اسلام کی طاقت ذرا کمزور ہو اور کب انھیں اپنے گئے ہوئے اقتدار کو واپس لانے کا موقع ملے ۔

فتح مکہ کے بعد ابوسفیان اور اس کی اولاد کا اسلام ایک ایسا واقعہ ہے جس سے ہر انسان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ فوج کی ہیبت سے انسان سر جھکا سکتا ہے مگر اپنے

---

[1] تاریخ اسلام جلد اول صفحہ ۳۶

دل میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ فتح مکہ سے کیا ہوا؟ کہ وہ دشمن جو اب تک پھنکاریں مارتے ہوئے اژدھے کی طرح سامنے موجود تھا مارِ آستین بن کر خفیہ ریشہ دوانیوں کے لیے آزاد ہو گیا اور کوئی شبہ نہیں کہ دشمن کی یہ صورت اس صورت سے زیادہ خطرناک ہے۔ جبکہ وہ خنجر بکف گلا کاٹنے کے لیے سامنے کھڑا ہوا ہو۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے یہی خیال تھا کہ انکے بارے میں اسلام کے نقاد حضرت علیؑ بن ابی طالب نے فرمایا تھا، یہ لوگ حقیقتاً اسلام نہیں لائے بلکہ اسلام کے سامنے انھوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اور بس۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی زندگی میں ان کے اس مقصد کی تکمیل مشکل تھی۔ ان سب کی بڑی احتیاط کی جاتی تھی ان کو عام مسلمانوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہونے دیا جاتا تھا۔ اور نہ ان کو مسلمانوں پر حاکم بنایا جاتا تھا، بلکہ اکثر تحفے تحائف دے کر ان کی دلجوئی بھی کی گئی تاکہ یہ لوگ اپنے ظالمانہ انداز بھول جائیں اور اگر یہ نہیں تو ان کی آیندہ نسلیں اسلام میں رہ کر امن و امان کی زندگی اختیار کر لیں۔[۱]

سرکارِ رسالتؐ کے بعد ابوسفیان نے حضرت علی علیہ السلام کو بڑھا کر جنگ کی بنیاد ڈالنے کی ترغیب دی تھی

---

[۱] شہیدِ انسانیت ص۱۳۷ ص۱۳۸ و ص۱۳۹

اگر علیؑ کی جگہ کوئی جذباتی انسان ہوتا تو ابوسفیان کا یہ حربہ اتنا کاری تھا کہ اسلام کی بنیاد ہل جاتی۔ مسلمان اسوقت خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتے اور اسلام کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا، مگر وہ نورِ الٰہی سے دیکھنے والے نباضِ فطرت علیؑ تھے جنھوں نے مخاطب کے مقصد کو تاڑ لیا اور ڈانٹ کر جواب دیا، تو ہمیشہ اسلام اور اہلِ اسلام کا دشمن رہا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: استیعاب ج ا ص۲۴۵، ج ۲ ص۴۱۰ مطبوعہ حیدرآباد دکن، صواعق محرقہ ص۲۷[1]

جب ادھر سے مایوسی ہوئی تب انھوں نے چولا بدلا اور اربابِ اقتدار سے جا ملے، فتوح ملکی کے دروازے سے داخل ہو کر قصرِ حکومت میں پہنچ گئے۔ حضرت عمر کے حکم سے یزید بن ابی سفیان کا تقرر شام کی گورنری پر ہوا۔ جب یزید کا انتقال ہوا تو حضرت عمر نے ان کے بھائی معاویہ کو ان کی جگہ مقرر کیا۔ اور ساٹھ ہزار اشرفی ماہوار گورنری کی تنخواہ بھی مقرر فرما دی[2] پھر ایک دن فلسطین کا علاقہ بھی ان کے سپرد کر کے انھیں تین صوبوں کا گورنر جنرل بنا دیا۔ حضرت عمر کا ایک ایسے خاندان کو برسرِ اقتدار لانا، ابوسفیان کے بیٹے یزید کو شام جیسے زرخیز صوبہ کا گورنر مقرر کرنا اسکے

---

[1] شہیدِ انسانیت ص۱۳۹ و ص۱۴۰ [2] استیعاب جلد ا ص۲۵۳

مرنے پر ساٹھ ہزار اشرفی ماہانہ پر اس کے بھائی معاویہ کو اس کی جگہ مقرر کرنا اور اسے برابر ترقی دیے جانا یہاں تک کہ تین حاصل خیز صوبوں شام، فلسطین اور یردون پورے طور پر اس کے سپرد کر دینا تاریخ کے طالب علم کے لیے سرمایۂ حیرت ہے۔ اور پھر ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر دوسرے گورنروں کو معمولی معمولی باتوں پر باز پرس کر رہے ہیں، ڈانٹ رہے ہیں، حتیٰ کہ معزول بھی کر رہے ہیں مگر اس کے برخلاف اس خاندان کی کج رویوں کو برداشت کیا جاتا ہے اور ان کے بارے میں بے بسی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں ان کی طاقت اور بھی بڑھ گئی، جب علیؑ خلیفہ ہوئے تو ہوا کا رخ بدل گیا۔ حضرت عثمان کے بعد بالاتفاق مسلمانوں نے آپ کو شہنشاہِ اسلام تسلیم کر لیا۔ مگر شام کے حاکم امیر معاویہ نے آپ کی خلافت کو پسند نہیں کیا، اولادِ ہاشم کی حکومت یوں ہی بنی امیہ کے لیے قابلِ برداشت نہ تھی، اس پر حضرت علیؑ کی پابندئ شریعت سے سخت گیری، نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفت کی چنگاریاں دہکتے دہکتے جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور بنی امیہ نے حاکمِ شام کی سرکردگی میں جنگ شروع کر دی۔

حضرت معاویہ کا تعارف

صاحبِ سیر الصحابہ بعض لغزشوں کے ضمن میں لکھتے ہیں :-

"جنابِ امیرؓ کے مقابلے میں ان کا صف آرا ہونا اور اس میں کامیابی کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز وسائل استعمال کرنا، حضرت حسنؓ سے لڑنا، اسلامی خلافت کو موروثی حکومت میں بدل دینا، ان میں سے ہر واقعہ ان کی ایسی کھلی غلطی ہے جسے کوئی حق پسند مستحسن قرار نہیں دے سکتا۔ خصوصاً یزید کی ولیعہدی سے اسلامی خلافت کی روح ختم اور اسلام میں موروثی بادشاہت کی رسم قائم ہو گئی۔ ان واقعات نے عوام کو چھوڑ کر حق پسند خواص کو بھی امیر معاویہ سے بدظن کر دیا۔"[1]

ایک انگریز مورخ آسبورن نے معاویہ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے :-

Asbete unscrupuless and pitiless the first caliph of Ommayao. Shranh from no crime neccessary to secure his positation munder

---

[1] سیر الصحابہ جلد ۶ صـ ۹۲ و صـ ۹۳

was accustomed mode of removing a formable opponent and yet this cool calculating atheistic arab ruled over the regions of Islam.
(Osborn — Islam under the Arab)

"پہلا اموی خلیفہ جو نہایت پُرفن، بے عقیدہ اور بے رحم تھا کسی ایسے جرم کے ارتکاب سے دریغ نہ کرتا تھا جو اس کی پوزیشن کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہو، اپنے زبردست مخالف کو میدان سے ہٹانے کے لیے اس کا سب سے زیادہ آزمایا ہوا حربہ قتل کر دینا تھا۔ پھر بھی یہ سوچ سمجھ کر کام کرنے والا دور بین لا مذہب عرب اسلامی ممالک پر حکومت کرتا رہا۔"

جنگ کے لیے معاویہ کی ریشہ دوانیاں

احمد بن داؤد دینوری نے اپنی کتاب الاخبار الطوال میں حضرت معاویہ کی ریشہ دوانیوں کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"تمام بلادِ اسلامیہ نے حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کر لی لیکن حضرت معاویہ اور شام کے لوگوں نے ان کی خلافت کو قبول نہ کیا۔ اس پر حضرت علیؑ نے جریر بن عبداللہ

کو خط دے کر حضرت معاویہ کے پاس بھیجا اور اس سے بیعت کا مطالبہ کیا، اس سے حضرت معاویہ کو بہت تشویش ہوئی اور انھوں نے عمرو ابن عاص کو جو بیت المقدس کے قریب ایک گاؤں میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا، مشورہ کے لیے بلایا، آخر دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا"۔[1]

معاویہ اور عمرو عاص کا مکالمہ

حضرت معاویہ نے عمرو عاص کو بلا کر اپنی مشکلات پیش کیں۔

عمرو عاص - علیؑ کا معاملہ البتہ اہم ہے۔ مسلمان کبھی تم کو ان کے برابر نہیں سمجھ سکتے۔

معاویہ - وہ عثمان کے قتل میں معاون تھے، امت اسلامیہ میں پھوٹ ڈال کر فتنہ پیدا کیا۔

عمرو عاص - لیکن تمھیں سبقت اسلام اور قرابتِ نبوی کا شرف حاصل نہیں اور میں خواہ مخواہ تمھاری کامیابی کے لیے کیوں مدد کروں؟

معاویہ - تم کیا چاہتے ہو؟

عمرو عاص - مصر

معاویہ - مصر تو کسی طرح عراق سے کم نہیں۔

عمرو عاص - لیکن مصر کا مطالبہ اس وقت ہے جب تم علیؑ کو مغلوب

---

[1] اسلام کی تاریخ جلد اول مولفہ سید عبد القادر مرحوم ص ۳۶۶

کرچکوگے اور تمام دنیائے اسلام تمھارے زیرنگیں ہوگی۔

امیر معاویہ کو ان کے خدمات کی بہت ضرورت تھی۔ اس لیے اس گفتگو کے دوسرے دن مصر دینے کا تحریری وعدہ کرکے عمرو بن عاص کو ملالیا۔[1] (یہ ہے سیاسی رشوت)

عمرو عاص کے مشورے

عمرو عاص کے مل جانے سے معاویہ کا بازو بہت قوی ہو گیا۔ انھوں نے ان کو مشورہ دیا، عمائد شام کو یہ یقین دلا کر کہ عثمان کے قتل میں حضرت علیؑ کا ہاتھ شامل تھا، ان کو ان کی مخالفت پر آمادہ کرو۔

سب سے پہلے شرجیل بن سمط کندی کو جو شام کے سب سے بڑے با اثر آدمی ہیں، اپنا ہم خیال بناؤ۔[2]

پہلے مشورہ پر حضرت معاویہ نے اس طرح عمل کیا:۔

خون آلود کرتہ

حضرت معاویہ نے حضرت عثمان کا خون آلود کرتہ اور آپ کی زوجۂ محترمہ حضرت نائلہ کی انگلیوں کی نمائش کرکے سارے شام میں آگ لگا

---

[1] یعقوبی ج ۲ ص ۲۱۷، سیر الصحابہ جلد ۶ ص ۴۷

[2] اخبار الطوال ص ۱۶۸ و ص ۱۶۹، سیر الصحابہ ج ۶ ص ۴۸

دی۔ لوگ آتے تھے اور یہ المناک منظر دیکھ کر زار زار روتے تھے۔ شامیوں نے قسم کھالی کہ جب تک وہ قاتلینِ عثمان کو قتل نہ کریں گے اس وقت تک نہ بستر پر لیٹیں گے اور نہ بیویوں کو چھوئیں گے۔[1]

الغرض عمائدِ شام کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی کہ عثمان کے خون میں علیؓ کا ہاتھ بھی شامل تھا۔

پھر عمرو عاص کے مشورہ کے مطابق شرجیل بن سمط کندی کو دمشق طلب کیا۔ چنانچہ راستہ میں حضرت معاویہ کے بھیجے ہوئے لوگ اسے ملتے تھے اور اسے حضرت علیؓ کے خلاف بھڑکاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ حضرت علیؓ حضرت عثمان کے قتل کے ذمہ دار ہیں۔ شرجیل کندی دمشق کے قریب پہنچا تو امرائے دربار اور اکابرِ شہر نے اس کا پُرجوش استقبال کیا اور بڑی عزت و احترام سے اُسے دمشق میں لے آئے۔ یہاں بھی حضرت معاویہ کے حامی سایہ کی طرح اُس کے ساتھ لگے رہے اور حضرت علیؓ کے خلاف کان بھرتے رہے۔ حتیٰ کہ اسے پوری طرح یقین ہوگیا کہ حضرت معاویہ حق پر ہیں اور حضرت علیؓ نے مسندِ خلافت پر قبضہ کرنے کے لیے حضرت عثمان کو قتل کرادیا ہے۔ اس کے بعد شرجیل کندی نے تمام شام کا دورہ کیا اور لوگوں کو حضرت علیؓ کے خلاف بھڑکانے

---

[1] تاریخ طبری ج ۷ ص ۵۶۱

لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل شام حضرت علیؓ کے دشمن ہو گئے۔ اور انھوں نے حضرت معاویہ کا ساتھ دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس طرح یہ سیدھا سادا درویش جس کو دنیا کے حالات کا کچھ علم نہیں تھا حضرت معاویہ کے دامِ تزویر میں پھنس گیا اور اس نے حضرت علیؓ کی مخالفت پر کمر باندھ لی[1]

تبرا کی ابتدا

حضرت معاویہ نے اس پر اکتفا نہ کی بلکہ اس نے شام کے لوگوں کے جوش کو قائم رکھنے کے لیے حضرت علیؓ اور بنی ہاشم کے خلاف وسیع پیمانہ پر پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ چنانچہ دمشق کی جامع مسجد میں نمازِ ظہر کے بعد بنی امیہ کا جھنڈا بلند کیا جاتا تھا، اس پر حضرت عثمان کا خون آلود قرآن اور ان کی بیوی نائلہ کے ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلیاں آویزاں ہوتی تھیں، ان کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا، وہ دیوانہ وار اس کے گرد گھومتے اور ماتم کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ حضرت علیؓ اور ان کے اہل و عیال اور ان کے خاندان کے لوگوں پر تبرا بھیجتے تھے اور ان سے حضرت عثمان کے خون کا بدلہ لینے کا اعلان کرتے تھے[2]

---

[1] تاریخ اسلام جلد اول سید عبدالقادر مرحوم ص ۳۶۲ و ص ۳۶۵

[2] تاریخ اسلام جلد ا ص ۳۶۵ مؤلفہ پروفیسر عبدالقادر مرحوم

تبصرہ:-

ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی برکت اللہ صاحب بھوپالی لکھتے ہیں :-

"حضرت معاویہ اور عمرو عاص نے مسندِ خلافت پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی تھی اور وہ حصول مقصد کے لیے برے بھلے سب حربے استعمال کرنے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت علیؓ کو شکست دینے کے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ انھوں نے ہر قسم کے کذب وافتراسے لوگوں کو بھڑکایا اور انھیں حضرت علیؓ کے خلاف لاکر کھڑا کر دیا۔ حضرت علیؓ نے مسلمانوں میں افتراق اور خانہ جنگی کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی ہر چند کوشش کی لیکن ان کی کوئی پیش نہیں گئی۔ حضرت معاویہ مسند خلافت پر قبضہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اپنے مخالفوں کی کسی بات پر کان نہیں دھرتے تھے[1] ان سیاسی چالوں اور کذب و افتراء سے حضرت معاویہ کو اہلِ شام کی حمایت کا کامل یقین ہو گیا، تو انھوں نے جریر بن عبداللہ قاصد جنابِ امیرؑ کو شام سے چلے جانے کا حکم دیا۔ اور کہا کہ اپنے آقا علیؑ سے جاکر کہہ دو کہ میں اسکو خلیفہ تسلیم نہیں کرتا اور اس کے ہاتھ پر کبھی

---

[1] تاریخ اسلام جلد ا سید عبدالقادر ص ۳۶۸

بیعت نہیں کروں گا۔ اس پر جریر بن عبداللہ اپنا سامنہ لے کر کوفہ واپس چلے گئے[1]"

جناب امیر علیہ السلام حالانکہ عصمت اور نص کی حیثیت سے خلیفۂ رسولؐ تھے مگر انھوں نے حضرت معاویہ کے مسلمات سے استدلال کر کے ان سے مطالبۂ بیعت کیا تھا۔ اور جریر ابن عبداللہ کو جو خط دے کر بھیجا تھا۔ اس کا مضمون اس طرح پر تھا۔

مطالبۂ بیعت

" ابوبکر و عمر کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں نے میری بیعت کر لی ہے، اب کسی کے لیے لیت و لعل کی گنجائش نہیں (کیونکہ تمھارا عقیدہ ہے) کہ خلیفہ کے انتخاب کا حق مہاجرین اور انصار کو ہے اور ان کے انتخاب کے بعد جو شخص بیعت سے پہلو تہی کرے گا اس سے بیعت لی جائے گی۔ مہاجرین و انصار کی طرح تم بھی بیعت کر لو، خیر و فلاح اسی میں ہے ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ، تم قاتلین عثمان کو حیلہ قرار دے کر بہت کچھ کر چکے۔ بیعت کے بعد باقاعدہ مقدمہ پیش کرو میں کتاب و سنّت کی روشنی میں اس کا فیصلہ کروں گا[2]"

حقیقت یہ ہے کہ جناب امیر علیہ السلام ہر حیثیت سے اس وقت خلیفہ

---

[1] تاریخ اسلام جلد ا سید عبدالقادر ص۲۶۷ و ص۲۶۸

[2] تاریخ اسلام تالیف اکبر شاہ نجیب آبادی۔۔۔ ص۲۲۳

وقت تھے، منصوص من اللہ تھے اور وراثتاً بھی تھے۔ علمِ لدنی و عصمت کی قابلیتوں کے لحاظ سے بھی تھے آپ کی خلافت پر تمام اہلِ حل و عقد کا اجماع بھی تھا، مہاجرین و انصار نے بھی آپ کی بیعت کی تھی۔ تمام صحابہ ان کی خلافت پر مُہرِ رضا و رغبت ثبت کر چکے تھے۔ چند گنتی کے افراد تھے جنھوں نے ان سے انحراف کیا تھا اور ان کے انحراف سے اکثریت میں کوئی خلل نہیں پڑا تھا جن معنوں میں بھی خلافت کو لے لیجیے وہ خلیفہ تھے۔ بہرحال جب آپ اسوقت خلیفۂ برحق تھے ان حالات میں جو بھی آپ سے بغاوت کرے واجب القتل تھا۔ سرکارِ رسالت کا صریحی حکم ہے۔ ستکون ھنات وھنات فمن اراد ان یفرق ھذہ الامۃ وھم جمیع فاضربوا راسہ بالسیف کائنا من کان۔

"عنقریب طرح طرح کی بے ہودگیاں رونما ہوں گی، پس جو شخص امتِ اسلام میں پراگندگی پیدا کرنا چاہے جبکہ مسلمانوں کا شیرازہ متحد ہو تو اس کا سر تلوار سے اڑا دو، خواہ کوئی بھی ہو۔" اسی مضمون کی سیکڑوں حدیثیں پیغمبر کی تمام صحاح، مسانید و سنن میں موجود ہیں[1]

کون بتلائے کہ معاویہ نے امیرالمومنین کے خلاف بغاوت کر کے امت کے ساتھ بھلائی اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی کی یا وہ باغی تھے انھوں نے خدائی انتظام کی اہانت اور حکومت الٰہیہ کی ذلت کی۔ اطاعت

---

[1] اموی دورِ خلافت جلد اول ص ۳۵۲

سے خارج جماعت سے جدا اور دائرۂ اتحاد و اسلام سے باہر ہو گئے صریحی ارشادات پیغمبرؐ کی روشنی میں وہ باغیوں کے سرغنہ ٹھہرتے ہیں جس طرح حالت شرک میں بروز جنگ بدر سرغنۂ مشرکین تھے۔ ان کا انجام ان کے آغاز سے کس قدر حیرت انگیز حد تک مشابہ ہے۔ اسی وجہ سے پیغمبرؐ نے امیرالمومنینؑ کو ان سے جنگ کرنے کی تاکید کی تھی۔ پیغمبرؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا، کون انکار کر سکتا ہے اس سے کہ معاویہ کے اصحاب ہی نے جناب عمار کو شہید کیا۔ اس کے بعد یہ بھی قابل غور ہے کہ قتل عثمان کے فوراً بعد ہی امیرالمومنینؑ کی بیعت مدینہ میں ہوئی اور تمام مہاجرین و انصار نے آپ کی بیعت کی۔ معاویہ کی بیعت بھی شام کے اوباشوں نے کی۔ وہ بھی بعد میں کی، اور مذہب اسلام کا صریحی حکم ہے کہ ایسے خلیفہ کو فوراً قتل کر دینا چاہیے کیونکہ پیغمبرؐ تاکید کر چکے ہیں اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الاخر منھما۔ جب دو خلیفوں کی بیعت ہو جائے تو جس کی آخر میں بیعت ہو اسے قتل کر دو۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں پیغمبرؐ کی ایک اور حدیث ہے جسے علامہ مناوی نے کنوز الدقائق ص۱۵۵ پر لکھا ہے۔ "جو شخص خلافت کے معاملہ میں علیؑ سے جنگ کرے اسے قتل کر دو خواہ کوئی بھی ہو"

اصحاب امیرالمومنینؑ اور اصحاب معاویہ کی جنگ میں کتاب الٰہی کا یہ فیصلہ نظر انداز کرنا ناممکن ہے کہ :-

وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احدٰھما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتی تفئ الی امر اللہ۔

"اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں ایک دوسرے سے جنگ کریں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، اگر ایک جماعت زیادتی پر تلی ہو تو اس سے جنگ کرو۔ یہاں تک کہ وہ حکمِ خدا ماننے پر مجبور ہو جائے۔"

اس آیت سے ائمہ فقہ نے باغیوں سے جنگ کرنے کے حکم پر استدلال کیا ہے۔ اور اصحاب معاویہ بہ نص پیغمبرؐ گروہ باغی تھے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ یہ آیت دلیل ہے اس امر کی کہ گروہِ باغی سے قتال واجب ہے، جو امام سے بغاوت کرے یا کسی مسلمان سے[1]

علامہ زیلعی لکھتے ہیں حق علیؑ کے ہاتھوں میں تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ پیغمبرؐ نے جناب عمارؓ سے فرمایا تھا تقتلک الفئۃ الباغیۃ "تمھیں باغی گروہ قتل کرے گا" اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عمارؓ علیؑ کے ساتھ تھے اور انھیں اصحابِ معاویہ نے قتل کیا[2]

امام الحرمین لکھتے ہیں، "علیؑ امام برحق تھے اور آپ سے لڑنے والے باغی تھے"[3]

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۱۶ صفحہ ۳۱۷ [2] نجم الھدایہ جلد ۴ صفحہ ۲۶۹

[3] کتاب الارشاد امام الحرمین۔

حسنِ ظن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ باغیوں کی نیت بھلائی کی تھی اگرچہ ان سے خطا ہوئی ہے[1]

جنگ کی تیاری اور سعیٔ مصالحت

جریر سے حالات کی اطلاع پاکر حضرت علیؓ کے لیے حرب وضرب کے آتشیں سمندر میں کودنا ناگزیر ہو گیا۔ چنانچہ آنحضرت نے تیاریاں شروع کر دیں۔ صلح کوش، امن پسند اور ہمدرد ملت مسلمانوں نے فرزندانِ توحید کی باہمی خانہ جنگی روکنے کی تدبیریں کیں۔ چنانچہ اس ضمن میں شام کے ایک متقی بزرگ ابومسلم خولانی چند افراد کی معیت میں حضرت امیر معاویہ کے پاس گئے اور ان سے کہا:-

علیؓ ابن ابی طالب علیہ السلام سے مقابلہ کی کیوں ٹھانی ہے۔ تم کس بنا پر ان کی برابری کا دعویٰ کرتے ہو؟"

امیر معاویہ نے جواب دیا، میں فضیلت میں ان کا مدِّمقابل ہونے کا مدعی نہیں، آپ جانتے ہیں کہ عثمان مظلوم شہید کیے گئے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ قاتلوں کو ہمارے سپرد کر دیا جائے۔ ہم ان سے بیعتِ خلافت کرلیں گے۔ ابومسلم نے کہا:-

"اچھا تو اسی مضمون کی ایک تحریر دے دو۔ میں اسے علی علیہ السلام کے پاس پہنچاؤں گا۔"

---

[1] اموی دورِ خلافت جلد اول ص ۳۵ تا ص ۳۵۶

چنانچہ حضرت امیر معاویہ نے یہ خط تحریر کیا:-

"امابعد! خلیفہ عثمان تمھارے یہاں تمھاری موجودگی میں قتل کیے گئے۔ تم برابر شور و غوغا سنتے رہے اور اپنے قول و فعل سے منع نہ کیا، اگر تم نے صدق و خلوص سے مدافعت کی ہوتی تو ہم میں کا کوئی فرد تمھارے خلاف نہ ہوتا تم پر دوسرا الزام ہے کہ تم نے عثمان کے قاتلوں کو پناہ دی ہے اور وہ اس وقت تمھارے دستِ راست ہیں۔ ہمیں یہ بھی اطلاع پہنچی ہے کہ تم خونِ عثمان سے بری الذمّہ ہونے کا اعلان کرتے ہو۔ اگر تم راستی پر ہو تو قاتلوں کو قصاص کی غرض سے ہمارے حوالہ کردو، ہم سب سے پہلے تمہاری بعیت کو تیار ہیں۔ اگر یہ منظور نہیں تو ہمارا تمھارا فیصلہ صرف تلوار کرے گی۔ واللہ ہم لوگ دنیا کے کونے کونے سے عثمان کے قاتلوں کو ڈھونڈ کر تہ تیغ کریں گے۔ یا خود نذرِ اجل ہوجائیں گے۔"[1]

قصاص ایک سیاسی چال

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ خونِ عثمان ایک سیاسی بہانہ تھا، دراصل حضرت علیؑ سے جنگ کرنا مقصود تھی۔ امیر معاویہ نے باوجود موقعہ اور قدرت حضرت عثمان کی مدد نہیں کی۔ حضرت عثمان کے

---

[1] تاریخ اسلام مولانا نشتر جالندھری صت ۲۳۵

مخالفت ۰ ،۷ دن تک مدینہ میں مقیم رہے۔ چالیس دن تک ان کے مکان کا محاصرہ رہا کیا اتنے عرصہ میں ان کی مدد کے لیے دمشق سے عسکری کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ حضرت عثمان نے حاکم شام امیر معاویہ اور دیگر امرا کو نصرت کیلیے بلایا، کوئی نہ آیا، طلب نصرت کے لیے حضرت عثمان نے جو خط معاویہ کو لکھا تھا اس کے الفاظ یہ تھے :۔

"واضح ہو کہ اہل مدینہ کافر ہو گئے ہیں اور اطاعت سے منہ پھیر لیا ہے اور بیعت توڑ ڈالی ہے۔ تم شام کے لڑنے بھڑنے والوں کو تند و تیز سواریوں پر میری طرف بھیجو[1]"

یہ فرمان جب امیر معاویہ کے پاس پہنچا تو انھوں نے اس کی تعمیل میں تساہل سے کام لیا۔ بلکہ نتیجہ کے منتظر ہو گئے[2]

حضرت نے اسی مضمون کے فرمان دیگر عمال کو بھی بھیجے تھے۔ جو اکثر بنی امیہ میں سے ہی تھے۔ مگر کوئی مدد کو نہ پہنچا۔ واقعات بتلاتے ہیں کہ جیسے یہ لوگ منتظر تھے کہ شورش بڑھے اور اپنے اپنے صوبوں میں خود سرانہ قابض ہو جائیں، آخر اہل شورش نے حضرت عثمان کو قتل کر ڈالا۔ جب آپ کے قتل کی خبر عمرو بن العاص کو پہنچی تو بہ فخر کہا میں ابو عبداللہ ہوں۔ جو ٹھان لیتا ہوں بغیر کر گزرے نہیں رہتا[3]

گورنر شام معاویہ جو اسی ہزار فوج لے کر صفین پہ چڑھ دوڑے، اگر اسی

---

[1] طبری جلد ۳ ص ۴۰۲ [2] طبری ص ۱۱۵ ۳۵ھ

[3] شہید انسانیت ص ۱۴۷

فوج کے ساتھ مدینہ پہنچ جاتے تو کیا وہ ہزار آدمی جو حضرت عثمان کا محاصرہ کیے ہوئے تھے ان کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اور حضرت عثمان قتل ہو سکتے تھے ؟

بلکہ اس مصیبت کی گھڑی میں بنی امیہ کے ستون اپنے خاندان کے خلیفہ کو جس کی بدولت اونچے عہدوں پر فائز ہو گئے تھے اور جس نے ان کے لیے بیت المال سے بڑے بڑے وظیفے مقرر کر دیے تھے چھوڑ کر شام کی طرف چلتے بنے [1]

طلحہ قاتلان حضرت عثمان کی جماعت میں سے تھے۔ اور حضرت عثمان سے دو بدو انھوں نے مخالفانہ گفتگو کی۔ عمرو عاص کی بھی یہی حالت تھی [2] اور یہی لوگ طالبانِ خونِ عثمان تھے۔ حضرت علی علیہ السلام نے صلائے عام دی تھی کہ مجھے قاتلان عثمان بتاؤ۔ میں انھیں سزا دوں گا۔ آپ نے تحقیقات بھی شروع کر دی تھی۔ چنانچہ نائلہ زوجۂ محترمہ حضرت عثمان کے بیانات ہوئے۔ انھوں نے کہا صرف دو اشخاص ان کے قاتل تھے۔ میں ان کا نام نہیں جانتی۔ اگر میرے سامنے آجائیں تو پہچان لوں۔ محمد ابن ابی بکر سچ کہتے ہیں وہ قاتل نہیں ہیں [3] قتل کے وقت نائلہ کے علاوہ کوئی وہاں موجود نہ تھا۔ جب وہی قاتلان

---

[1] اموی سیاست سید اکبر علی ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی ص ۳۲

[2] عمرو عاص و طلحہ قاتلان و دشمنان عثمان میں سے تھے تاریخ ابن خلدون اردو ترجمہ ج ۴ ص ۳۰۵ مسند امام احمد حنبل الجزء الاول ص ۶۲

[3] صواعق محرقہ ابن حجر مکی الباب الثامن ص ۱۱۷ شمس التواریخ خلافت عثمانی ص ۶۱۷۔ تاریخ الخمیس

عثمان کا نام و پتہ نہ دے سکیں تو اور کون بتاتا۔ خونِ عثمان کا قصاص طلب کرنے والوں نے بھی قاتلانِ عثمان کے نام نہیں بتلائے۔ تمام مصری لشکر (اور ان کے معاونین کوفیوں اور بصریوں) کو جناب امیرؑ کیونکر خونِ عثمان کے عوض قتل کر دیتے۔ وہ لوگ تو محض اس ارادے سے آئے تھے کہ حضرت عثمان سے ان کے افعال کی توبہ کرائیں۔ خلع خلافت کرائیں یا مروان کو ان سے لے لیں۔ چنانچہ طلحہ نے کہا کہ اگر حضرت عثمان مروان کو حوالہ کر دیتے تو یہاں تک نوبت نہ آتی[1] اگر ان میں سے ایک یا دو نے زیادتی کی اور حضرت عثمان کو قتل کر دیا تو سارا لشکر اس فعل کا ذمہ دار نہیں۔ دراصل یہ تو دشمنانِ علیؑ کی ایک سیاسی چال تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ حضرت علیؑ مصریوں (کوفیوں اور بصریوں) پر سختی کریں اور وہ لوگ حضرت علیؑ کے مخالف ہو جائیں[2]

حضرت معاویہ کے مطالبہ پر لمحات فکریہ

۱۔ کیا دنیا کی کسی سلطنت کے کسی صوبہ کے گورنر کو حق ہے کہ اپنی مرکزی حکومت سے جسے ارباب حل و عقد نے قائم کیا ہو۔ یہ مطالبہ کرے کہ کسی واقعۂ قتل کے ملزموں کو اس کے حوالہ کیا جائے حالانکہ قتل کی واردات کسی دوسرے صوبہ میں ہوئی ہو۔ اگر ان

---

[1] شمس التواریخ صد ۶۱۶

[2] اموی دورِ خلافت ج ۱ صد ۳۱۴ و صد ۳۱۵

ملزموں کو میرے حوالہ نہ کیا گیا تو میں مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کردوں گا۔ اور اگر ایسا گورنر مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کردے تو مرکزی حکومت کو اس سے کیا سلوک کرنا چاہیے؟

۲۔ کیا دنیا کی کسی عدلیہ کی تاریخ میں یہ مثال ملتی ہے؛ کہ مقتول کے ورثا وہ بھی قریبی نہیں بلکہ دور کے رشتہ دار یہ مطالبہ کریں کہ ان تمام انسانوں کو جن پر قتل کا ذرا سا بھی شبہ ہے اور اگرچہ وہ سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ہوں ہمارے حوالے کردیا جائے۔ تاکہ ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر جو سلوک بھی چاہیں ان سے کرسکیں؟

ہرمزان، جفینہ اور دختر ابولولو کا قتل

مقتول کے ورثا کا مغلوب الغضب ہوکر قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر حدودِ شرعیہ کو معطل کرکے بیگناہ انسانوں کو قتل کرنے کا واقعہ پیش آچکا تھا۔ جب حضرت عمر زخمی ہوئے، عبداللہ ابن عمر نے ہرمزان پر حملہ کرکے اسے قتل کرڈالا۔ ہرمزان اہواز کا ایرانی گورنر تھا حضرت عمر کے عہد میں جب اہواز فتح ہوا تو یہ اسیر ہوکر مدینہ آیا۔ اور جناب عمِ رسولؐ حضرت عباس کے دستِ مبارک پر مشرف باسلام ہوا۔ حضرت عمر نے بیت المال سے دو ہزار سالانہ اس کا وظیفہ مقرر کردیا۔ مگر

ان کے فرزندِ ارجمند عبداللہ ابن عمر نے اعانت بالقتل کے شبہ میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ راویوں کا بیان ہے کہ جب ہرمزان نے تلوار کی ضربت محسوس کی تو اس کی زبان پر لا الٰہ الا اللہ جاری ہوا۔ پھر عبداللہ جفینہ کے پاس آئے۔ اور اسے بھی مار ڈالا۔ راوی کا کہنا ہے کہ جب اس نے موت محسوس کی تو اس نے اپنی پیشانی پر صلیب بنائی۔ پھر عبداللہ ابولولو کے گھر میں گھُسے اور اس کی کمسن بچی کو مار ڈالا۔ صہیب اور سعد بن ابی وقاص کی جدوجہد سے داؤ پیچ کرکے ان سے تلوار چھین لی گئی۔ پھر عبداللہ قید کردیے گئے۔ جب یہ مقدمہ حضرت عثمان کے ہاں پیش ہوا تو حضرت عثمان نے کہا میں ہرمزان کا بھی ولی ہوں اور ان لوگوں کا بھی جنھیں عبداللہ نے قتل کیا ہے۔ میں عبداللہؓ کو معاف کرتا ہوں اور اپنے پاس سے ہرمزان کی دیت بیت المال میں جمع کیے دیتا ہوں۔ حضرت عثمان کی سیرت اس کی متقاضی تھی، بھلا اپنی خلافت کا آغاز وہ قریش کے ایک نوجوان اور حضرت عمر کے فرزند کو قتل کرکے کیسے کرسکتے تھے؟ اس لیے انھوں نے عافیت کا پہلو تلاش کیا، اپنے مالِ خاص سے دیت ادا کرکے عبداللہؓ کی جان بچالی۔ حضرت عثمان کا ایسا فیصلہ بڑی اچھی سیاست تھی، بشرطیکہ اس مقدمہ کو خالص سیاسی حیثیت سے دیکھا جائے۔ بہت سے مسلمان حضرت عثمان کے اس فیصلہ پر راضی نہ ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ بھی ان ہی میں تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کے زمانۂ

خلافت میں اگر عبداللہ آپ کے ہاتھ آجاتا تو عدلیہ کے تقاضے سے مقدمہ کی پوری تحقیقات کے بعد جرم ثابت ہونے پر اس سے ضرور قصاص لے کر رہتے۔ لیکن عبداللہ بھاگ نکلا، معاویہ کے پاس چلا گیا اور ان ہی کی طرف سے جنگِ صفین میں شریک ہوکر علی سے لڑا اور مارا گیا۔ حضرت علی علیہ السلام سے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بھی ایسا ہی وطیرہ اختیار کریں کہ خلفاء، اور دیگر صحابہ کبار مہاجرین و انصار کے ورثا کو کھلی چھٹی دے دیں کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنا انتقام خود لے لیا کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اکابر قوم اپنی من مانی کرتے جو جی چاہتا کر بیٹھتے، خلیفۂ وقت کے سامنے اپنا مقدمہ پیش نہ کرتے اور نہ کوئی ثبوت اور گواہ پیش کرتے۔ اس صورت میں حکومت کا نظم و نسق ہی درہم برہم ہوجاتا۔ عدل و انصاف کا دنیا میں نام باقی نہ رہتا۔ ہر شخص مالک و مختار ہوتا اور شعائرِ دین تباہ و برباد ہو کر رہ جاتے۔ قانونِ الٰہی اور شریعتِ بیضا میں تعطل آجاتا[1]

حضرت معاویہ کا جناب امیر علیہ السلام کو یہ لکھنا کہ اگر آپ نے اپنے قول و فعل سے قاتلوں کو منع نہیں کیا، سراسر کذب و افترا ہے۔ جناب امیر علیہ السلام نے اس جھگڑے کو ختم کرانے میں کوئی

---

[1] اموی دورِ خلافت حصہ اول خلاصہ از ص ۵۵ تا ص ۸۳ بحوالہ بیہقی و یعقوبی و مشہور مصری فلسفی مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔

دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

چنانچہ اہل سنت مورخ نشتر جالندھری لکھتے ہیں:۔

"حضرت علیؑ نے بلوائیوں کو سمجھا بجھا کر ہٹا دیا۔ لیکن جب وہ چلے گئے تو بلوائیوں نے پھر کاشانۂ خلافت کا محاصرہ کر لیا[۱] حضرت علیؑ بلوائیوں کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے۔ لیکن آخر ان کا بھی کچھ بس نہ چلا[۲]

حضرت علیؑ نے بلوائیوں کو اسی وقت متفرق کر دیا لیکن مروان نے حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہو کر ایسی باتیں کیں کہ حضرت عثمان نے مروان کی معزولی کا حکم مسترد کر دیا[۳]

محاصرہ کے ایام میں حضرت علیؑ نے امام حسنؑ کو بھیج دیا تھا وہ دروازے پر پہرہ دے رہے تھے[۴]

حضرت عثمان کے عہدِ خلافت میں فتنہ و فساد شروع ہوا تو حضرت علیؑ نے اس کے رفع کے لیے انکو نہایت مخلصانہ مشورے دیے[۵]

حضرت عثمان سے اصلاحات کا وعدہ لے کر انقلاب پسندوں کو اپنی ذمہ داری پر واپس کیا[۶]

---

[۱] تاریخ اسلام صفحہ ۲۰۶ [۲] تاریخ اسلام صفحہ ۲۰۶ [۳] تاریخ ابن الوردی تاریخ احمدی صفحہ ۱۵۹ [۴] خلفائے راشدین صفحہ ۲۴۳ [۵] خلفائے راشدین صفحہ ۲۸۶ [۶] خلفائے راشدین صفحہ ۲۸۶

اپنے دونوں صاحبزادوں کو احتیاطاً حفاظت کے لیے بھیج دیا، جنہوں نے نہایت تندہی اور جانفشانی سے مدافعت کی۔ یہاں تک کہ اس کشمکش میں خود زخمی ہوئے۔" [1]

کیا اپنے زمانۂ اقتدار میں حضرت معاویہ نے قاتلانِ عثمان سے قصاص لیا؟

حضرت معاویہ کے خط کا جو انھوں نے حضرت علیؓ کے نام ابومسلم خولانی کے ذریعہ بھیجا تھا آخری جملہ یہ تھا:—

"واللہ ہم لوگ دنیا کے کونے کونے سے عثمان کے قاتلوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تہ تیغ کریں گے یا خود نذرِ اجل ہو جائیں گے۔"

کیا یہ الفاظ ہی تھے یا اس پر حضرت معاویہ نے کبھی عمل کیا؟ کیا امام حسنؑ سے معاہدۂ الترائے جنگ کے بعد جب حضرت معاویہ کو مملکتِ اسلامیہ پر پورا تسلط حاصل ہو گیا تو اس وقت ان کی مملکت میں قاتلانِ عثمان موجود تھے۔ کیا انھوں نے تلاش کر کے گرفتار کیا؟ ان کو سزا دی؟ یا کبھی قصاصِ خونِ عثمان کا تذکرہ وہ اپنی زبان پہ لائے؟ ہرگز نہیں۔

حضرت معاویہ پولیٹیکل آدمی ہونے کی حیثیت سے جناب امیر علیہ السلام کو قتلِ عثمان سے متہم کر کے اور عوام کو متاثر کر کے

---

[1] خلفائے راشدین ص ۲۸۸

اپنی ناجائز خواہشات کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ ہمارے اس خیال کی تائید معاویہ کے اس خیال سے ہوتی ہے جو حضرت معاویہ اور حضرت عائشہ بنت عثمان کے درمیان مدینہ طیبہ میں ہوئی۔ جب حضرت امام حسن علیہ السلام سلطنت دسے دست کش ہوگئے تو حضرت معاویہ نے حضرت عثمان کا ذکر چھوڑ دیا، اس کے بعد مدینہ طیبہ گئے حضرت عائشہ بنت حضرت عثمان سے گفتگو ہوئی۔

حضرت عائشہ بنت حضرت عثمان - تم نے میرے باپ کا بدلہ لینے کا خیال چھوڑ دیا، حکومت حاصل ہوتے ہی اپنی زبان بند کرلی۔

حضرت معاویہ۔ لوگوں نے میری اطاعت قبول کرلی۔ میں نے امن قائم کردیا، اس وقت تم یہ غنیمت سمجھو کہ امیرالمومنین حضرت عثمان کی بیٹی اور امیرالمومنین معاویہ کی بھتیجی کہلاتی ہو۔ اگر میں تمہاری خاطر سے طلب و قصاص کے لیے موجودہ معاملات کو بدلوں اور معاملہ دگرگوں ہوکر حکومت میرے ہاتھ سے نکل جائے تو اسوقت تم معمولی عورت رہ جاؤ گی۔[1]

جو خطبہ حضرت معاویہ نے مدینہ طیبہ میں دیا تھا وہ بھی ہمارے استدلال کا مویّد ہے:-

"میں دنیا کی طرف مائل ہوا، وہ میری طرف جھک پڑی میں اس کا بیٹا ہوں اور وہ میری ماں!"[2]

---

[1] عقد الفرید، اموی دورِ خلافت ج ا ص ۳۹۳ و ۳۹۴ [2] عقد الفرید، اموی دورِ خلافت ج ا ص ۳۹۴

سنی المذہب مورخ نشتر جالندہری لکھتے ہیں:۔

"ابو مسلم خولانی جب معاویہ کا خط لے کر حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں کوفہ پہنچے اور خود بھی زبانی عرض کیا:۔

"آپ ہمارے امیر ہیں، خلیفہ ہیں، عثمان مظلوم و شہید کے قاتلوں کو ہمارے حوالے کر دیجیے، ہم آپ کے دست و بازو ہونگے اور کوئی شخص آپ کا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔"

حضرت علی علیہ السلام نے ابو مسلم سے کہا، اچھا آج کا دن ٹھہریئے، کل مفصل جواب دوں گا۔ اگلے دن جامع کوفہ میں ابو مسلم خولانی نے یہ نظارہ دیکھا کہ دس ہزار مسلح آدمی نعرہ لگا رہے ہیں۔ "ہم سب عثمان کے قاتل ہیں" (یہ اس رائے عامہ کا اثر تھا جو حضرت عثمان کے خلاف ہو چکی تھی) اس پر حضرت علیؑ نے فرمایا۔ "انتہائی جد و جہد کے باوجود میں اس گتھی کو سلجھانے میں قاصر رہا" امیر معاویہ کے خط کا یہ جواب لکھا:۔

"عثمان کے قتل سے میرا کوئی واسطہ نہیں، میں نے کسی کو ان کے خلاف برانگیختہ نہیں کیا۔ ہاں جب یہ معاملہ حد سے زیادہ بگڑ گیا تو میں خانہ نشین ہو گیا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم قصاص عثمان کی آڑ میں مطلب برآری کرنا چاہتے ہو، اگر تم اس مفسدہ پردازی سے باز نہ آؤ گے تو تمہارے ساتھ

باغیوں کا سا سلوک کیا جائے گا۔

اور عمرو عاص کو تحریر فرمایا:۔

"دنیا کسی کام نہ آئے گی۔ یہ طریقِ عمل چھوڑ دو۔ معاویہ کی غلطی میں اس کی پشت و پناہ بن کر اپنے نامۂ اعمال کو داغ نہ لگاؤ۔"[1]

جناب امیرؑ کی روانگی

جب حضرت معاویہ پر جناب امیر علیہ السلام کی صلح کے لیے جد و جہد کا کچھ اثر نہ ہوا۔ چنانچہ سید امیر علیؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

With his usual humanity Ali endeavered to bring out a peacaful settlement but mowayiah was inflated by pride and wanted imppo--sible conditions. To avoid unnecess--ary shedding of blood Ali offered to end the quarrel by personall combat but the ommayaes declined the challange.[2]

"اس انسانی درد کی وجہ سے جو علیؑ کا معمول تھا ایک پُرامن تصفیہ کے لیے جد و جہد کی۔ معاویہ تکبر و تبختر سے ناممکن الوقوع

---

[1] تاریخ اسلام مولفہ نشتر جالندہری صفحہ ۲۳۶ [2] ہسٹری آف سارا سین صفحہ ۵۰

شرائط چاہتا تھا، غیر ضروری خونریزی سے بچنے کے لیے علیؑ نے کہا، آؤ ہم تم لڑیں اور آپس میں فیصلہ کریں۔ مگر بنی امیہ نے اس سے انکار کر دیا تو حضرت علیؑ ابومسعود انصاری کو کوفہ میں اپنا قائم مقام مقرر کر کے ذی الحجہ ۳۶ھ میں اسی ہزار سپاہ کے ساتھ شام کی طرف بڑھے۔ اس فوج میں ستر بدری صحابہ سات سو بیعتِ رضوان کے جانباز اور چار سو مہاجر و انصار صحابہ تھے۔ ہراول دستہ زیاد بن نضر اور شریح بن ہانی کے زیر قیادت تھے۔ حضرت علیؑ چاہتے تھے کہ اس لشکر کی مدد سے اہلِ شام کو شکست دے کر مسلمانوں کو از سرِ نو متحد کریں۔ معاویہ نے صفین کے مقام پر فوجیں اتاریں اور اہم اور مناسب جگہوں پر قبضہ کر کے مورچے بنا لیے[۱]

حضرت علیؑ کا ورود اور پانی کے لیے کشمکش

علامہ مفتی جعفر حسین صاحب مدظلہ، لکھتے ہیں: ۔

"امیرالمومنینؑ ابھی صفین پہنچے نہ تھے، کہ معاویہ نے گھاٹ کا راستہ بند کرنے کے لیے دریا کے کنارے چالیس ہزار آدمیوں کا پہرہ لگا دیا تا کہ شامیوں کے علاوہ کوئی وہاں سے پانی نہ لے سکے۔ جب امیرالمومنین کا لشکر وہاں پر اترا تو اس گھاٹ کے علاوہ آس پاس کوئی گھاٹ نہ تھا۔ کہ وہاں سے پانی لے

---

[۱] تاریخ اسلام پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم ص ۳۶۹

سکتے۔ اور اگر تھا تو اونچے نیچے ٹیلوں کو عبور کر کے وہاں تک پہنچنا دشوار تھا، حضرت نے صعصعہ بن صوحان کو معاویہ کے پاس بھیجا اور ان سے کہلوایا کہ پانی سے پہرہ اٹھا لیا جائے مگر معاویہ نے اس سے انکار کیا۔ ادھر امیر المومنین علیہ السلام کا لشکر پیاسا پڑا تھا۔ حضرت نے یہ صورت دیکھی تو فرمایا اٹھو اور تلوار کے زور سے پانی حاصل کرو۔ چنانچہ ان تشنہ کاموں نے تلواریں نیاموں سے کھینچ لیں اور تیر کمانوں میں جوڑ لیے اور معاویہ کی فوجوں کو درہم برہم کرتے ہوئے دریا کے اندر تک اتر گئے۔ اور ان پہرہ داروں کو مار بھگایا۔

اب حضرت کے اصحاب نے بھی چاہا کہ جس طرح معاویہ نے گھاٹ پر قبضہ جما کر پانی کی بندش کر دی تھی ویسا ہی اس کے اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ برتاؤ کیا جائے اور ایک شامی کو بھی پانی نہ لینے دیا جائے اور ایک ایک کو پیاسا تڑپا کر مارا جائے۔ مگر امیر المومنینؑ نے فرمایا، تم بھی وہی جاہلانہ قدم اٹھانا چاہتے ہو جو ان شامیوں نے اٹھایا تھا، ہرگز کسی کو پانی سے نہ روکو جو چاہے پیئے اور جس کا جی چاہے پانی لے جائے۔ چنانچہ جناب امیر المومنین کی فوج کا دریا پر قبضہ ہونے کے باوجود کسی کو پانی سے نہیں

روکا گیا اور ہر ایک شخص کو پانی لینے کی پوری پوری آزادی دی گئی۔"[1]

جنگ کی تاخیر اصحاب امیرؑ کی بے چینی اور جناب امیرؑ کا جواب

صفین میں جب امیر علیہ السلام کے اصحاب نے اذنِ جہاد دینے میں تاخیر پر بے چینی کا اظہار کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:۔

"تم لوگوں کا یہ کہنا کہ یہ پس و پیش کیا اس لیے ہے کہ میں موت کو ناخوش جانتا ہوں اور اس سے بھاگتا ہوں؛ تو خدا کی قسم مجھے ذرا پروا نہیں کہ میں موت کی طرف بڑھوں یا موت میری طرف بڑھے اور اس طرح تم لوگوں کا یہ کہنا کہ کیا مجھے اہلِ شام سے جہاد کرنے کے جواز میں کچھ شبہ ہے تو خدا کی قسم اس جنگ کو ایک دن کے لیے بھی التوا میں نہیں ڈالا۔ مگر اس خیال سے کہ ان میں سے شاید کوئی گروہ مجھ سے آکر مل جائے اور میری وجہ سے ہدایت پا جائے اور اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے میری روشنی کو بھی دیکھ لے اور مجھے یہ چیز گمراہی کی حالت میں انھیں قتل کر دینے سے کہیں زیادہ پسند ہے اگرچہ اپنے گناہوں کے ذمہ دار بہر حال یہ خود ہوں گے۔"[2]

---

[1] ترجمہ نہج البلاغہ ج اول ص ۱۸۸ و ص ۱۸۹ [2] ترجمہ نہج البلاغہ خطبہ ۵۵ ص ۱۹۱ و ص ۱۹۲

آغازِ جنگ

مئی ۶۵۷ء مطابق ذی الحجہ ۳۶ھ جنگ کا آغاز ہوا لیکن کوئی خونریز یا فیصلہ کن معرکہ نہ ہوا۔ ہر روز ایک دو معمولی جھڑپیں ہو جاتی تھیں فریقین کھل کر لڑنے سے انکار کرتے رہے۔ کہ کہیں عرب قوم کا خاتمہ ہی نہ ہو جائے۔ کیونکہ کسی نہ کسی طرف ہر قبیلہ کے چیدہ چیدہ دلاور میدانِ جنگ میں موجود تھے۔

التوائے جنگ۔ سال نو کے آغاز پر ایک ماہ پھر جنگ بند رہی۔ اور صلح کی کوششیں ہوتی رہیں لیکن اس کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا[1]

ماہِ صفر میں حضرت علیؓ اور معاویہ کے لشکروں میں بمقام صفین لڑائی شروع ہونے سے پہلے حضرت علیؓ نے اپنے اصحاب کو بلا کر کہا کہ جب تک جنگ کی ابتدا فوج مخالف کی طرف سے نہ ہو تم نے لڑائی کا اقدام نہیں کرنا اور جو بھاگے اسے نہ مارنا اور مخالفین کے اموال میں سے کچھ نہ لینا۔ اور کسی کو برہنہ نہ کرنا[2]

جنگ

جب معاویہ کی طرف سے جنگ کا آغاز ہوا تو ۸ صفر کو حضرت علیؓ نے اس کشمکش کا خاتمہ کرنے کے لیے عام حملہ کا حکم دیا۔ اور فریقین میں معرکہ آرائی کا آغاز ہوا۔

---

[1] اسلام کی تاریخ سید عبدالقادر صفحہ ۳
[2] تاریخ ابن الوردی، تاریخ احمدی صفحہ ۱۹۷

قلب فوج میں صاحب ذوالفقار مدینہ کے چیدہ چیدہ دلاوروں کے ساتھ مقیم تھے۔ میمنہ میں بصرہ کی فوجیں حضرت عبداللہ ابن عباس کی نگرانی میں تھیں اور میسرہ کی قیادت مالک الاشتر کے سپرد تھی۔ جس میں کوفہ کے سورما تھے۔ گیارہ سے تیرہ صفر تک تین دن خونریز جنگ ہوئی۔[1]

عمار یاسر نے حضرت علیؑ کی رفاقت میں قتال عظیم کیا۔ باوجودیکہ انکی عمر کچھ اوپر ۹۰ برس کی تھی وہ لڑائی کے وقت حربۂ جنگ لیے ہوئے یہ کہتے جاتے تھے کہ اسی نشان کے ساتھ رسول اللہؐ کی ہمراہی میں تین لڑائیاں لڑ چکا ہوں۔ اب یہ چوتھی لڑائی ہے۔ اس وقت عمار جو رجز پڑھ رہے تھے اس کا مطلب یہ تھا "قتال کر رہے ہیں ہم تم سے تاویل قرآن پر جس طرح تم پر تنزیلِ قرآن پر قتال کر چکے ہیں"۔[2]

ابوسعید سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا تھا کہ "اے علیؑ جس طرح میں نے تنزیلِ قرآن پر کفار سے قتال کیا ہے اسی طرح تم تاویلِ قرآن پر قتال کروگے"۔[3]

اثنائے جنگ میں عمار نے پینے کے لیے پانی مانگا تو ایک عورت نے دودھ لا کر پیش کیا جس کو پی کر عمار نے کہا کہ اللہ سچا ہے اور اس کا رسولؐ سچا ہے۔ آج میں اپنے احباب یعنی رسول مقبولؐ اور ان کے گروہ حق شناس سے ملاقات کروں گا۔ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ دنیا میں

---

[1] تاریخ اسلام سید عبدالقادر مرحوم صفحہ ۳۷ و صفحہ ۱۷۱ [2] تاریخ ابوالفدا و تاریخ احمدی صفحہ ۱۹۷ و صفحہ ۱۹۸
[3] مسند احمد حنبل و مستدرک حاکم و تاریخ احمدی صفحہ ۱۹۸

میرا آخری رزق پانی ملا ہوا دودھ ہوگا۔ پھر عمار نے جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔[1]

یہ حدیث صحیح متفق علیہ ہے کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا، عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا۔[2]

ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔" افسوس! عمار کو گروہِ باغی قتل کرے گا، عمار اس گروہ کو جنت کی طرف بلاتے ہوں گے اور وہ گروہ عمار کو جہنم کی طرف بلاتا ہوگا۔"[3]

جب حضرت عمار یاسر ——— شہید ہوئے تو عمرو بن عاص نے قتال سے ہاتھ روک لیا اور اس باب میں جماعتِ کثیر نے عمرو بن عاص کا اتباع کیا، معاویہ نے عمرو بن عاص سے اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ہم رسول اللہ ص سے سن چکے ہیں کہ عمار کو گروہ باغی قتل کرے گا، اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم لوگ باغی ہیں۔ معاویہ نے کہا، چپ رہو۔ عمار کے قاتل ہم نہیں ہیں بلکہ علیؑ ہیں جنھوں نے عمار کو لا کر ہم میں ڈال دیا حضرت علیؑ کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے کہا کہ جو شخص مجھے عمار کا قاتل کہے گویا وہ یہ کہتا ہے کہ حضرت حمزہ کے قاتل رسول مقبول ص ہیں، کیونکہ آنحضرت ص ہی نے حضرت حمزہ کو کفار سے لڑنے کے لیے بھیجا تھا۔[4]

---

[1] تاریخ ابن الوردی، تاریخ احمدی ص۱۹۸۔ [2] تاریخ ابوالفدا، تاریخ احمدی ص۱۹۸
[3] صحیح بخاری، تاریخ احمدی ص۱۹۸
[4] خلاصۃ الوفا، تاریخ خمیس، تاریخ احمدی ص۱۹۹

جب حضرت عمار شہید ہوئے تو حضرت علیؑ نے بیس ہزار فوج سے ایسا شدید حملہ کیا کہ لشکرِ شام کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔[۱]

پھر حضرت علیؑ نے ندا دی، اے معاویہ ہمارے تمہارے درمیان یہ لوگ کیوں قتل ہوں، آؤ ہم تم لڑیں تاکہ جو شخص اپنے مقابل کو قتل کرے امرِ متنازعہ فیہ اس کے لیے مستقیم ہو جائے۔ یہ سنکر عمرو عاص نے معاویہ سے کہا کہ حضرت علیؑ نے بہت انصاف کی بات کہی ہے۔ معاویہ نے کہا، واہ کیا انصاف کی بات کہی ہے! تو جانتا ہے کہ جو شخص علیؑ سے لڑتا ہے وہ قتل ہوتا ہے۔ عمرو عاص نے کہا، مگر اس وقت انکا مقابلہ نہ کرنا تمہارے لیے بہت ہی نازیبا ہے۔ معاویہ بولے کہ بجا ہے۔ تو چاہتا ہے کہ میں قتل ہوں اور میرے بعد تو حکومت کرے۔[۲]

جب معاویہ حضرت علیؑ سے لڑنے کو نہ نکلے اور عمرو عاص نے ان کو اس بات پر ملامت کی تو انھوں نے خود عمرو عاص کو مجبور کیا کہ تم علیؑ سے لڑنے کے لیے جاؤ۔ حتیٰ کہ عمرو عاص نے تعمیلِ حکم کے بغیر کوئی چارہ نہ دیکھا تو بمقتضائے بندگی بیچارگی لڑنے کے لیے میدان جنگ میں آئے، حضرت علیؑ نے عمرو عاص کو دیکھتے ہی تلوار اٹھائی اور چاہا کہ ان پر وار کریں عمرو عاص جھٹ ننگے ہو گئے اور بولے کہ بھائی میں اپنے گرمی کے جوش میں نہیں آیا بلکہ مجبوراً آیا ہوں۔ حضرت علیؑ

---

[۱] تاریخ ابن الوردی، تاریخ احمدی صفحہ ۲۰۰

[۲] تاریخ ابوالفدا، تاریخ احمدی صفحہ ۲۰۰

نے اپنا منہ پھیر لیا، اور فرمایا کر جا تو نے اپنی خلاصی کا بُرا حیلہ اختیار کیا عمرو عاص فوراً اپنے لشکر میں بھاگ گئے۔[1]

حذیفہ بن یمان کے دو بیٹے سعید اور صفوان اپنے باپ کی وصیت کے موافق جنگ صفین میں حضرت علیؑ کی رفاقت میں لڑ کر شہید ہوئے۔[2]

حضرت اویس قرنی بھی جناب امیرؑ کی رفاقت میں گروہ باغی کے ہاتھ سے قتل ہو کر راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔[3]

حضرت علیؑ کی رفاقت میں خزیمہ بنت ثابت انصاری ذوالشہادتین اور اویس قرنی زاہد التابعین مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔[4]

معاویہ کے ایک لشکری مخنف بن سلیم نے ابو ایوب انصاری سے جو حضرت علیؑ کی فوج میں تھے کہا کہ تم نے رسول اللہؐ کی ہمراہی میں مشرکین سے قتال کیا تھا، اور آج مسلمانوں کو قتل کرنے آئے ہو؟ ابو ایوب نے جواب دیا کہ رسول اللہؐ نے مجھے ناکثین، قاسطین و مارقین کے قتال پر مامور فرمایا ہے۔ ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ ہم کو رسول اللہؐ نے ناکثین و قاسطین و مارقین کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا۔ تو ہم نے پوچھا تھا کہ یا رسول اللہؐ ہم کس کے ساتھ ناکثین و قاسطین و مارقین سے قتال کریں گے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ علیؑ ابن ابی طالب کے ساتھ، جن

---

[1] تاریخ مروج الذہب مسعودی، تاریخ احمدی صـ۲۰۰ و صـ۲۰۱

[2] تاریخ کامل ابن اثیر، تاریخ احمدی صـ۱۹۸ و صـ۱۹۹

[3] روضۃ الاحباب، تاریخ احمدی صـ۱۹۹ / [4] تاریخ خمیس، تاریخ احمدی صـ۱۹۹

کی رفاقت میں عمار بن یاسر شہید ہوں گے[1]

ناکثین سے اہلِ جمل، قاسطین سے اہلِ صفین اور مارقین سے خوارج مراد ہیں[2]

لیلۃ الہریر

جب وہ شبِ جمعہ ہوئی جسے لیلۃ الہریر کہتے ہیں تو اس رات اور اس کی صبح کو حضرت علیؓ نے بنفسِ نفیس ۵۲۳ آدمی اپنے ہاتھ سے قتل کیے۔ حضرت علیؓ کے میمنۂ لشکر پر مالک اشتر تھے۔ انھوں نے جنگ میں ایسی جد و جہد، شجاعت و جلادت سے کام کیا کہ فتح کے آثار نمایاں ہو گئے۔ قریب تھا کہ معاویہ کے لشکر کے اکابر چلّا اٹھے کہ خدا ہی ہماری عورتوں اور لڑکیوں پر رحم کرے۔ پس معاویہ نے مضطرب ہو کر عمرو عاص سے کہا کہ اگر مصر کی حکومت مطلوب ہے تو اب جلد کوئی حیلۂ مفر سوچو۔ ورنہ ہم لوگ ہلاک ہوا چاہتے ہیں۔ عمرو عاص نے اپنے لشکر والوں سے کہا، ایہا الناس! جس کے پاس قرآن ہو وہ اس کو اپنے نیزہ پر بلند کرے۔ یہ سنتے ہی اہلِ لشکر نے کثرت سے قرآنِ مجید نیزوں پر بلند کر کے آواز دی کہ ہمارے تمھارے درمیان کتاب اللہ ہے[3]

جب لشکرِ شام نے قرآن بلند کیے تو اہلِ عراق نے جو حضرت علیؓ

---

[1] اسد الغابہ، ابن اثیر، تاریخ احمدی ص۲۰۱ [2] نہایہ علامہ ابن اثیر، تاریخ احمدی ص۲۰۲

[3] مروج الذہب مسعودی، تاریخ احمدی ص۲۰۲

کے لشکر میں تھے ۔کہا ،کہ اے علیؓ ! تم کتاب اللہ کو کیوں قبول نہیں کرتے ،حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ تم لوگ دشمن سے مقابلہ کرنے میں حق اور صدق پر ثابت قدم رہو۔ عمرو عاص ، معاویہ ، ابن ابی معیط ، ابن ابی سرح و ضحاک بن قیس نہ اہل دین ہیں نہ اہلِ قرآن ، میں انھیں خوب جانتا ہوں ۔ بخدا انھوں نے قرآن کو محض مکاری اور فریب سے بلند کیا ہے ۔ اہلِ عراق بولے کہ تم ہم کو کتاب اللہ کی طرف جانے سے کیوں روکتے ہو ،جب کہ ہم اس کی جانب بلائے جا رہے ہیں ۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ مخالفین کے مقابلہ میں میرا یہ مقاتلہ صرف اس لیے ہے کہ وہ حکمِ خدا اور کتاب اللہ کے موافق عمل کریں ۔ لیکن وہ احکامِ خدا کی نافرمانی کر رہے ہیں[1]

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ معاویہ والوں کا فریب ہے ۔جو انھوں نے قرآن بلند کیے ہیں ۔ حالانکہ وہ قرآن سے کوئی تعلق نہیں رکھتے یہ سنکر اشعث بن قیس کندی جو معاویہ سے در پردہ ملا ہوا تھا ، کہنے لگا کہ اگر تم معاویہ والوں کی درخواست منظور نہیں کروگے تو میں ابھی تمھارے پاس سے چلا جاؤں گا[2]

حضرت علیؓ نے کہا میں تم سے زیادہ کتاب اللہ کو قبول کرنے کا سزاوار ہوں مگر جانتا ہوں کہ رفع مصاحف سے مخالفین کا مقصودِ عمل بکتاب اللہ نہیں ہے بلکہ وہ لڑائی سے عاجز آگئے ہیں اپنی کامیابی

---

[1] تاریخ ابوالفدا ، تاریخ احمدی ص ۲۰۳

[2] تاریخ ابن واضح ، تاریخ احمدی ص ۲۰۳

سے مایوس ہو چکے ہیں اور ہماری فتح کا ان کو یقین ہو گیا ہے - لہذا اس حیلہ سے اپنی جان بچانا چاہتے ہیں - میں ان سے قتال کرونگا تاآنکہ وہ حکمِ خدا پر راضی ہوں، حضرت علیؑ کی سپاہ میں سے اکثر امرا و اعیان جو معاویہ سے رشوت لے چکے تھے - کہنے لگے کہ اے امیرالمومنینؑ تم معاویہ کی درخواست قبول کرو - کیونکہ وہ کتاب اللہ کی طرف بلاتا ہے - ورنہ ہم تم کو دشمن کے حوالے کردیں گے - حضرت علیؑ نے فرمایا، اِنا للہ و انا الیہ راجعون[1]

جنگ کا خاتمہ

مسعود تمیمی اور زید بن حصین طائی جو بالآخر خارجی ہو گئے تھے کہنے لگے کہ اے علیؑ! جب تم کتاب اللہ کی طرف بلائے جاتے ہو تو قبول کرو - ورنہ ہم تم کو قوم کے حوالے کردیں گے - اور تمہارے ساتھ وہ برتاؤ کریں گے جو عثمان بن عفان کے ساتھ کر چکے ہیں - حضرت علیؑ نے کہا کہ اگر تم میرے مطیع ہو تو جنگ سے روگردانی اختیار نہ کرو اور اگر نافرمان ہو تو جو مناسب سمجھو کرو - انھوں نے کہا کہ کسی کو بھیج کر اشتر کو بلواؤ - جناب امیر علیہ السلام نے ان کے کہنے کے مطابق اشتر کو بلوایا - انھوں نے کہلا بھیجا کہ یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ میں اپنی جگہ سے ہٹایا جاؤں - اسی اثنا میں جہاں اشتر لڑ رہے تھے شور و غل بڑھا

---

[1] روضۃ الاحباب، حبیب السیر، تاریخ احمدی ص ۲۰۳ و ص ۲۰۴

لوگوں نے حضرت علیؑ سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے ہی قتال کا حکم دیا ہے روکا نہیں۔ حضرت علیؑ نے کہا، کیا تم نے قاصد سے مجھے سرگوشی کرتے ہوئے دیکھا ہے اور کیا میں نے جو بات اس سے کہی تھی وہ تم نے نہیں سنی، انھوں نے کہا کہ اچھا پھر کسی کو بھیج کر اشتر کو بلواؤ ورنہ ہم تم سے منحرف ہو جائیں گے۔

حضرت علیؑ نے اشتر سے دوبارہ کہلا بھیجا کہ چلے آؤ۔ یہ حکم سن کر اشتر کہنے لگے کہ میں سمجھ گیا۔ بے شک عمرو عاص نے قرآن بلند کر کے اختلاف ڈال دیا۔ پس مالک اشتر نے میدان جنگ سے واپس آکر کہا کہ افسوس تم دشمنوں کے فریب میں آگئے ورنہ جو فوج اس وقت قتال سے روک دی گئی وہ ہر طرح غالب آگئی تھی۔[1]

تحکیم

سرکار علامہ مفتی جعفر حسین صاحب مدظلہ العالی نے واقعۂ تحکیم پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:۔

"جب اہل عراق کی خونریز تلواروں سے شامیوں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اور لیلۃ الہریر کے تابڑ توڑ حملوں نے ان کے حوصلے پست اور ان کے ولولے ختم کر دیے تو عمرو بن عاص نے

---

[1] تاریخ ابوالفداء، تاریخ احمدی ص ۲۰۴ و ص ۲۰۵

معاویہ کو یہ چال سمجھائی کہ قرآن کو نیزوں پر بلند کر کے اسے حکم ٹھہرانے کا نعرہ لگایا جائے جس کا اثر یہ ہوگا کہ کچھ لوگ جنگ کو رکوانا چاہیں گے اور کچھ جاری رکھنا چاہیں گے اور ہم اس طرح ان میں پھوٹ ڈلوا کر جنگ کو دوسرے موقعہ کے لیے ملتوی کرا سکیں گے۔ چنانچہ قرآن نیزوں پر بلند کیے گئے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند سرپھروں نے شور و غوغا مچا کر تمام لشکر میں انتشار و برہمی پیدا کر دی اور سادہ لوح مسلمانوں کی سرگرمیاں فتح کے قریب پہنچ کر دھیمی پڑ گئیں اور بے سوچے سمجھے کہ ہمیں جنگ پر قرآن کے فیصلہ کو ترجیح دینا چاہیئے[1] اکثر قرآن کو مسلمانوں نے دام تزویر بنایا۔ اسی لیے حافظ شیراز کو ان واقعات سے متاثر ہو کر کہنا پڑا:

حافظا مے خور د رندی کن و خوش باش ولے
دامِ تزویر مکن چوں دگراں قرآن را

چنانچہ اس مکر و فریب سے جب جنگ ختم ہو گئی تو پھر مفتی صاحب قبلہ لکھتے ہیں:-

اب یہ طے پایا کہ دونوں فریق میں سے ایک ایک حکم منتخب کر لیا جائے تاکہ وہ قرآن و سنت کے مطابق خلافت کا فیصلہ کریں، معاویہ کی طرف سے عمرو بن عاص قرار پایا اور حضرت علیؑ کی طرف سے لوگوں نے ابو موسیٰ اشعری کا نام پیش کیا۔ حضرت نے اس غلط انتخاب کو دیکھتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم نے تحکیم کے بارے میں میرا حکم نہیں مانا تو اتنا تو کرو کہ اس ابو موسیٰ کو حکم نہ بناؤ۔ یہ بھروسہ کا آدمی نہیں ہے۔ یہ عبداللہ ابن

---

[1] ترجمہ نہج البلاغہ صفحہ ۱۸۰

مجلس ہیں، یہ مالک اشتر ہیں ان میں سے کسی کو منتخب کر لو مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ اور اسی کے نام پر اڑ گئے۔ حضرتؑ نے فرمایا اچھا جو چاہو سو کرو، وہ دن دور نہیں کہ اپنی بے راہ رویوں پر اپنے ہاتھ کاٹو گے؟

حکمین کی نامزدگی کے بعد جب عہد نامہ لکھا جانے لگا تو علی ابن ابیطالبؑ کے نام کے ساتھ امیرالمومنین لکھا گیا، عمرو ابن عاص نے کہا کہ اس لفظ کو مٹا دیا جائے اگر ہم انہیں امیرالمومنین سمجھتے ہوتے تو جنگ کیوں لڑی جاتی حضرت نے پہلے تو اسے مٹانے سے انکار کیا اور جب وہ کسی طرح نہ مانے تو اسے مٹا دیا اور فرمایا کہ یہ واقعہ حدیبیہ کے واقعہ سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ کہ جب کفار اس پر اڑ گئے تھے کہ پیغمبرؐ کے نام کے ساتھ رسول اللہؐ کا لفظ مٹا دیا جائے۔ اور پیغمبرؐ نے اسے مٹا دیا۔ اس پر عمرو عاص نے بگڑ کر کہا کہ کیا آپ ہمیں کفار کی طرح سمجھتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا تمہیں کس دن ایمان والوں سے لگاؤ رہا ہے اور کب انکے ہمنوا رہے ہو؟ بہر صورت اس قرارداد کے بعد لوگ منتشر ہو گئے۔ اور ان دونوں حکموں نے آپس میں صلاح و مشورہ کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ علیؑ بن ابی طالب اور معاویہ دونوں کو معزول کر کے لوگوں کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ جسے چاہیں منتخب کر لیں، جب اس کے اعلان کا وقت آیا تو عراق اور شام کے درمیان مقام دومۃ الجندل میں اجتماع ہوا اور یہ دونوں حکم بھی مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ سنانے کے لیے پہنچ گئے، عمرو عاص نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے ابوموسیٰ سے کہا کہ میں آپ پر سبقت کرنا سوء ادب سمجھتا ہوں۔ آپ سن و سال کے لحاظ سے بزرگ ہیں۔ پہلے آپ اعلان فرمائیں؛ چنانچہ ابوموسیٰ باتوں میں

آ گئے، اور جھومتے ہوئے مجمع کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:-

"اے مسلمانو! ہم نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ علیؓ بن ابی طالب اور معاویہ کو معزول کر دیا جائے اور انتخابِ خلافت کا حق مسلمانوں کو دے دیا جائے وہ جسے چاہیں منتخب کر لیں۔"

اور یہ کہہ کر بیٹھ گئے۔ اب عمرو عاص کی باری آئی اور اس نے کہا:-

"اے مسلمانو! تم نے سن لیا کہ ابو موسیٰ نے علیؓ بن ابی طالب کو معزول کر دیا ہے۔ میں بھی اس سے متفق ہوں، رہا معاویہ تو اس کے معزول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا میں اسے اس جگہ پر نصب کرتا ہوں۔"

یہ کہنا تھا کہ ہر طرف شور مچ گیا۔ ابو موسیٰ بہت چیخے چلائے کہ یہ دھوکا ہے فریب ہے اور عمرو ابن عاص سے کہا کہ تم نے چالبازی سے کام لیا ہے اور تمہاری مثال اس کتے کی سی ہے کہ جس پر کچھ لادو، جب ہانپنے کا چھوڑ دو۔ عمرو بن عاص نے کہا کہ تمہاری مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہیں، الغرض عمرو بن عاص کی چالاکی کام کر گئی اور معاویہ کے اکھڑے ہوئے قدم پھر سے جم گئے۔

یہ تھا اس تحکیم کا مختصر ساخاکہ جس کی اساس قرآن و سنت کو قرار دیا گیا تھا۔ مگر کیا یہ قرآن و سنت کا فیصلہ تھا؟ یا ان فریب کاریوں کا نتیجہ جو دنیا دار ہمیشہ اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے کام میں لایا کرتے ہیں۔ کاش کہ

تاریخ کے ان اوراق کو مستقبل کے لیے مشعلِ راہ بنایا جائے اور قرآن و سنت کو آڑ بنا کر حصولِ اقتدار اور دنیا طلبی کا وسیلہ نہ بننے دیا جائے۔

امیر المومنین علیہ السلام کو جب تحکیم کے اس افسوسناک نتیجہ کی اطلاع ملی تو آپ منبر پر تشریف لائے اور یہ خطبہ ارشاد فرمایا جس کی لفظ لفظ سے آپ کا اندوہ و قلق جھلک رہا ہے اور ساتھ ہی آپ کی صحتِ فکر و نظر، اصابت رائے اور دور رس بصیرت پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔[1]

بعد تحکیم خطبہ جناب امیرؑ

"ہر حالت میں اللہ کے لیے حمد و ثنا ہے، گو زمانہ ہمارے لیے جانکاہ مصیبتیں اور صبر آزما حادثے لے آیا ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ یکتا و لاشریک ہے اس کے ساتھ کوئی دوسرا خدا نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس کے عبد اور رسول ہیں۔

(تمہیں معلوم ہونا چاہیے) کہ مہربان، باخبر اور تجربہ کار ناصح کی مخالفت کا ثمرہ حسرت و ندامت ہوتا ہے، میں نے اس تحکیم کے متعلق اپنا فرمان سنا دیا تھا، اور اپنی قیمتی رائے کا نچوڑ تمہارے سامنے رکھ دیا تھا۔ کاش کہ "قصیر" کا حکم مان لیا جاتا، لیکن تم تو تند خو مخالفین اور عہد شکن نافرمانوں کی طرح انکار پر تل گئے، یہاں تک کہ ناصح خود

---

[1] ترجمہ اردو نہج البلاغہ صفحہ ۱۶۱ تا صفحہ ۱۶۲

اپنی نصیحت کے متعلق سوچ میں پڑ گیا۔ اور طبیعت اس چقماق کی طرح بجھ گئی کہ جس نے شعلہ بھڑکانا بند کر دیا ہو......

میں تمھیں متنبہ کرتا ہوں کہ تم لوگ اس نہر کے موڑوں اور اس نشیب کی ہموار زمینوں پر قتل ہو کر گرے ہوئے ہو گے۔ اس عالم میں کہ نہ تمھارے پاس اللہ کے سامنے کوئی واضح دلیل ہو گی اور نہ کوئی روشن ثبوت، اس طرح کہ تم اپنے گھروں سے بے گھر ہو گئے اور پھر قضائے الٰہی نے تمہیں اپنے پھندوں میں جکڑ لیا۔ میں نے تمھیں پہلے ہی اس تحکیم سے روکا تھا لیکن تم نے میرا حکم ماننے سے مخالف پیمان شکنوں کی طرح انکار کر دیا، یہاں تک کہ مجبوراً مجھے بھی اپنی رائے کو ادھر موڑنا پڑا جو تم چاہتے تھے، تم ایک ایسا گروہ ہو جس کے افراد کے سر عقلوں سے خالی اور فہم و دانش سے عاری ہیں۔ خدا تمھارا بُرا کرے، میں نے تمھیں نہ کسی مصیبت میں پھنسایا ہے اور نہ تمھارا بُرا چاہا ہے[1]"

اس تحکیم کے متعلق سر سید امیر علی لکھتے ہیں :-

"The rebels were defeated in three successive battles and Muawiah was ready to fly from the field when a trick of his

---

[1] ترجمہ نہج البلاغہ ص ۱۶۹ و ص ۱۸۳

accomplice Amr, son of al-As saved them from destruction. He made his mercenries the copies of the Koran to their lances and flags and shout for quarters. The soldiers of the Caliph at once desisted from pursuit, and called upon him to refer the dispute to arbitration. The Caliph saw through the ruse practised by the rebels, but the clamour of the army led him to consent to the course suggested. The choice of an arbitration on his side fell unfortunately on a weak old man named Abu Musa Ansari, who was also secretly hostile to Ali. Nor was he any match for the astute Amr, the son of al Aas, who

represented Moawiah. The caliph deprived thus of the fruit of his victories by his own soldiers, retired in disgust with his army towards Kufa.[1]

"تین پے در پے جنگوں میں باغیوں کو شکست ہوئی۔ معاویہ میدان جنگ سے بھاگنے کے لیے تیار تھا جب کہ اس کے رفیقِ کار عمرو بن العاص کی فریب کاری نے انھیں تباہی سے بچا لیا۔ اس نے اپنے زردوست سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے نیزوں اور برچھوں سے قرآن باندھ لیں اور صلح کے نعرے لگائیں، خلیفہ کے قشون قاہرہ نے غنیم کی فوجوں کے تعاقب سے اپنے ہاتھ روک لیے اور معاملہ کو تحکیم کے سپرد کر دیا، خلیفہ کی بصیرت نے اس کی تہ میں باغیوں کا جو فریب و مغالطہ تھا اسے بھانپ لیا تھا، لیکن فوج کے شور و غوغا نے اس طریق کار کو منظور کروا لیا جو انھوں نے تجویز کیا تھا! اس تحکیم کی وجہ سے فتنۂ خوارج رونما ہوا اور جناب امیرؑ کو ان سے دوچار ہونا پڑا۔"

---

[1] History of Saracen. P 51

فتنۂ خوارج، جنگِ نہروان

ہم نے اپنی تاریخ کے اس حصّہ کو اپنے محسن علامہ سید مرتضیٰ حسین صاحب لکھنوی کے افادات سے اخذ کیا ہے۔

نہروان نہروان ایک موضع کا نام ہے جو کوفہ کے راستہ میں لبِ نہر واقع ہے۔[1]

حرورا صحرائے حرورا کی جانب کوفہ کے نزدیک ایک قریہ ہے اسی مناسبت سے خوارج نہروان کو حروریہ بھی کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا مخالفانہ اجتماع اسی صحرا میں پہلے پہل ہوا تھا۔ اور امیر المومنین کے خلاف اسکیمیں تیار ہوئی تھیں۔[2]

اس گروہ کی ابتدا صفین کے موقعہ پر خوارج نے اصرار کیا تھا کہ تحکیم قبول کر لی جائے۔ حالانکہ جناب امیر المومنینؑ سمجھ رہے تھے کہ یہ فریب ہے۔ اس لیے انھوں نے اس رائے کو نہ ماننا چاہا، لیکن خوارج نے دھمکی دی کہ اگر آپ نے تحکیم قبول نہ کی تو ہم آپ سے لڑیں گے۔ آخر امیر المومنینؑ نے تحکیم قبول کر لی تو خوارج نے کہا غیر اللہ کو حکم بنانا کفر ہے۔ لہٰذا تحکیم توڑ کر جنگ شروع کر دیجیے۔ امیر المومنینؑ نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا، اب یہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک تحکیم کا

---

[1] نہج البلاغہ کامکمل اردو ترجمہ صفحہ ۲ [2] نہج البلاغہ مکمل اردو ترجمہ

فیصلہ سامنے نہ آجائے اور یہ معلوم نہ ہوجائے کہ وہ فیصلہ کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں ؛ اس وقت تک کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن خوارج اپنی بات پر اڑے رہے، یہاں تک کہ وہ حضرت کے لشکر سے باہر چلے گئے، بیعت فسخ کردی اور جنگ و پیکار پر آمادہ ہوگئے۔[۱]

چنانچہ ان کے متعلق سر سید امیر علیؒ بلگرامی لکھتے ہیں :-

Here the men who had been most clamourous at Saffin for the reference to arbitration now repudiated it, and denounced it as sinful. [2]

"یہاں پر وہ لوگ جو صفین میں تحکیم کے تقرر کے لیے سب سے زیادہ شور و شغب کر رہے تھے اب اس سے دست بردار ہوگئے اور انھوں نے اب اس کے گناہ ہونے کا اعلان کردیا۔"

جب حضرت علی علیہ السلام قبل فیصلۂ تحکیم صفین سے کوفہ واپس تشریف لائے تو بارہ ہزار آدمیوں نے لشکرِ حیدری سے کنارہ کش ہو کر حروراء میں اقامت اختیار کی۔

---

[۱] نہج البلاغہ کا مکمل اردو ترجمہ صفحہ ۲۰۰ و صفحہ ۲۰۱

[2] The History of Saracen . P51

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:-
"پہلے ان لوگوں نے مجھے جنگ ملتوی کرنے پر مجبور کیا، پھر تحکیم پر ناپسندیدگی ظاہر کی، اور اب چاہتے ہیں کہ عہد شکنی کر کے قبل از فیصلہ پھر جنگ شروع کردوں، خدا کی قسم یہ نہیں ہو سکتا، حاضرین میں اس جماعت کے لوگ بھی تھے، سب ایک ساتھ چلانے لگے،

"لا حکم الا اللہ"

"اللہ کے سوا کوئی حکم نہیں" ۔ اور ایک شخص نے سامنے آ کر نہایت بلند آہنگی سے کہا:-

"ولقد اوحی الیک والی الذین من قبلک لئن اشرکت لیحبطن عملک ولتکونن من الخاسرین۔
(زمر ۷)

"(اے محمد) تم پر اور تم سے پہلے انبیاء پر یہ وحی بھیجی گئی۔ اور تم نے خدا کی ذات میں دوسرے کو شریک بنایا تو تمہارے سب اعمال بیکار ہو جائیں گے اور تم خسارہ اٹھانے والوں میں ہو گے۔"

حضرت علیؑ نے برجستہ جواب دیا:-
"فاصبر ان وعد اللہ حق ولا یستخفنک الذین لا یوقنون" (روم ۶۰)

"تو صبر کر خدا کا وعدہ حق ہے اور جو لوگ یقین نہیں رکھتے، وہ تیرا استخفاف نہ کریں۔"

غرض رفتہ رفتہ اس جماعت نے ایک مستقل فرقہ کی صورت اختیار کر لی
دومۃ الجندل کی تحکیم کا افسوسناک نتیجہ ملک میں شائع ہوا تو اس فرقہ نے جناب
مرتضیٰؑ کی بیعت توڑ کر عبداللہ بن وہب الراسبی کے ہاتھ پر بیعت کی، کوفہ
بصرہ، انبار اور مدائن وغیرہ میں جس قدر اس فرقہ کے لوگ موجود تھے وہ سب
نہروان میں جمع ہوئے اور عام طور پر قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔[1]

سر سید امیر علی لکھتے ہیں :-

They openly mutinied and with drawing to Nahrawan on the boarder of the desert assumed a threatening attitude. They refused either to return to duty or quietly to disperse to their homes.[2]

"انھوں نے کھلم کھلا بغاوت اختیار کی اور انھوں نے صحرائی
سرحد پر نہروان میں جمع ہو کر ہتک آمیز وطیرہ اختیار کیا۔ وہ
نہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے اپنی ملازمت پر آتے تھے اور نہ
ہی خاموشی سے منتشر ہو کر اپنے گھروں کو جاتے تھے۔"

---

[1] نہج البلاغہ کا مکمل ترجمہ ص ۲۰۱

[2] The History of Saracen P. 51

خوارج کے عقائد و خیالات

اس نئے فرقہ کی توضیح یہ ہے :-

"حضرت علیؓ خلیفۂ برحق تھے، ان کی بیعت ضروری تھی۔ اس سے انکار کرنے والے یعنی امیر معاویہ اور ان کے ساتھی کبیرہ گناہ کے مرتکب تھے اور اللہ اور رسولؐ کے باغی اور کافر تھے۔ اس لیے بحکم قرآن واجب القتل تھے۔ ایسے لوگوں سے مصالحت کرنا اور معاملہ ثالثوں کے سپرد کرنا نامناسب تھا۔ ان کے ساتھ فیصلہ تلوار کے ذریعہ ہی ہو سکتا تھا، چونکہ حضرت علیؓ نے ثالثی قبول کر کے قرآن پاک کے صریح فیصلہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ اب ان کی خلافت بھی ناجائز ہے اور وہ اور ان کے ساتھی امیر معاویہ اور ان کے ساتھیوں کی طرح کافر اور واجب القتل ہیں۔ ثالث مان لینے کا مطلب یہ ہے کہ خود حضرت علیؓ کو بھی اپنی امامت پہ شک تھا۔ ان پہ یہ لوگ اس لیے بھی معترض تھے کہ انھوں نے اپنی مرضی کے خلاف لشکریوں ہی کی ضد پہ تحکیم کو مانا تھا، اور وہ بھی اس طرح کہ حکم تو قرآن ہی تھا، مگر ان دو انسانوں کو قرآنی اصولوں کے مطابق فیصلہ کرنا تھا۔ یہ خیالات ان کی منطقی بے راہ روی کا نتیجہ تھے۔"[1]

---

[1] تاریخ اسلام جلد اول پروفیسر سید عبدالقادر صفحہ ۳۸۰ و ۳۸۱

قتلِ عام خارجیوں کا عقیدہ تھا کہ معاملاتِ دین میں حکم مقرر کرنا مرے سے کفر ہے۔ پھر ان دونوں حکموں نے جس طریقہ پر اس کا فیصلہ کیا اس کے لحاظ سے خود وہ دونوں اور ان کے انتخاب کرنے والے کافر ہیں اور اس عقیدہ سے جس کو اتفاق نہ ہو اس کا خون مباح ہے۔ چنانچہ انھوں نے عبداللہ بن خباب اور ان کی اہلیہ کو نہایت بیدردی سے قتل کر دیا۔ اس طرح ام ستان اور صیدایہ کو مشق ستم بنایا۔ اور اس طرح جو انھیں ملا اس کو یا تو اپنا ہم خیال بنا کر چھوڑا یا تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ حضرت علیؑ کو ان جگرخراش واقعات کی اطلاع ہوئی تو حارث بن مُرّہ کو دریافتِ حال کے لیے بھیجا، خارجیوں نے ان کا بھی کام تمام کر دیا۔[1]

شام اور خوارج جناب علی مرتضیٰؑ اُس وقت نئے سرے سے شام پر فوج کشی کی تیاری کر رہے تھے لیکن جب خارجیوں کی سرکشی اور قتل و غارت اس حد تک پہنچ گئی تو اس ارادہ کو ملتوی کر کے خارجیوں کی تنبیہ کے لیے نہروان کا قصد کرنا پڑا۔[2]

نامہ و پیام خارجی نہروان میں پہلے سے جمع تھے۔ حضرت علیؑ نے جنگ چھیڑنے سے پہلے خارجیوں کے پاس پیام بھیجا:-

"تمھارے جن آدمیوں نے ہمارے آدمیوں کو قتل کیا ہے ان کو قصاص کے لیے ہمارے حوالہ کر دو تو ہم تم کو چھوڑ دیں گے۔ شاید خدا تم کو راہِ راست پر لے آئے۔"

---

[1] نہج البلاغہ کا مکمل اردو ترجمہ صفحہ ۲۰۱ و ۲۰۲ [2] خلفائے راشدین صفحہ ۳۱۳ و صفحہ ۳۱۴

ان لوگوں نے جواب دیا :-

"ہم سب نے قتل کیا ہے اور ہم تمھارا اور ان کا خون مباح سمجھتے ہیں"[1]

اس جواب کے بعد آپ نے حضرت ابو ایوب انصاری اور قیس بن سعد انصاری کو سمجھانے کے لیے بھیجا، ان دونوں بزرگوں نے ہرچند راہِ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن خوارج برابر اپنی ضد پر قائم رہے۔ آخر میں آپ خود اتمامِ حجت کے لیے تشریف لے گئے اور ان کے سامنے تقریر کی۔

خطبہ جناب امیر علیہ السلام

"اے وہ گروہ! جسے محض ضد نے پیدا کیا ہے اور خواہشِ نفس نے اسے قبولِ حق سے روکا ہے، تم لوگ شبہ اور غلطی میں مبتلا ہو گئے ہو، میں تم کو اس سے متنبہ کرتا ہوں، تاکہ تم گمراہی پر قائم نہ رہو اور ایسی حالت میں نہ مارے جاؤ۔ کہ خدا کے سامنے تمھارے لیے کوئی دلیل باقی نہ رہے، کیا تم کو معلوم نہیں کہ میں نے حکمین سے یہ شرط لی تھی کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ میں نے تم کو اسی وقت آگاہ کر دیا تھا، کہ تحکیم کی تجویز محض فریب ہے لیکن تم نے ہی اسے قبول کرنے پر اصرار کیا، میں نے اس شرط پر اسے منظور کیا تھا کہ دونوں حکم اس چیز کو زندہ کریں گے جسے قرآن نے زندہ کیا ہے۔ اور اس کو ختم کریں گے جسے قرآن نے ختم کیا

---

[1] اخبار الطوال ص ۲۱۰ و ابن اثیر جلد ۳ ص ۱۳۶

ہے لیکن حکموں نے خواہش نفس پر عمل کر کے کتاب وسنت کی مخالفت کی اس لیے ہم نے ان کے فیصلہ کو رد کر دیا۔ اب ہم پچھلی حالت پر لوٹ آئے ہیں"

خوارج نے اس کا جو جواب دیا وہ یہ تھا:۔

"جب ہم نے حکم کی تجویز قبول کی تھی اس وقت کافر ہو گئے تھے اب ہم نے توبہ کر لی ہے۔ اگر تم بھی ہماری طرح توبہ کر لو تو ہم تمہارے ساتھ ہیں، ورنہ پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:۔

"اگر میں کفر کا اقرار کروں تو گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ مناسب صورت یہ ہے کہ تم اپنے کسی معتبر آدمی کو ہمارے پاس گفتگو کے لیے بھیجو، اگر وہ مجھے قائل کر دے تو میں اپنی غلطی کا اعتراف کر کے توبہ کر لوں گا، اگر وہ قائل ہو جائے تو تمہیں خدا سے ڈرنا چاہیے۔"[1]

اس تجویز پر خارجیوں نے عبداللہ بن الکوا کو گفتگو کے لیے بھیجا، دونوں میں مباحثہ ہوا، لیکن خوارج اپنی رائے سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔ اور حضرت علیؑ کو مجبوراً مقابلے میں آنا پڑا۔

تاہم آغاز جنگ سے پہلے ایک مرتبہ پھر حضرت ابو ایوب انصاری کو امان کا علم دے کر اعلان کرا دیا کہ جو شخص اس علم کے نیچے آ جائے یا لوٹ جائے یا خارجیوں کا ساتھ چھوڑ دے، وہ مامون ہے۔ اس اعلان پر ایک خارجی

---

[1] اخبار الطوال ص ۲۲۱ و ۲۲۲

سردار فروہ بن نوفل اشجعی نے اپنے ساتھیوں سے کہا :-

"ہمارے پاس علیؓ سے جنگ کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔ اس لیے لوٹ چلنا چاہیے۔ اور اس وقت تک کوئی حصہ نہ لینا چاہیے جب تک ان سے لڑنے یا ان کی پیروی کر لینے میں کسی ایک نتیجہ پر نہ پہنچ جائیں۔"

چنانچہ وہ پانچسو آدمیوں کو لے کر لوٹ گیا۔ ایک اور جماعت کوفہ واپس چلی گئی۔ ایک ہزار حضرت علیؓ کے جھنڈے کے نیچے آ گئے۔ اور عبداللہ بن وہب راسبی کے ساتھ بہت تھوڑی تعداد واپس آ گئی۔

اس وقت بھی حضرت علیؓ نے اپنے آدمیوں کو جنگ کی ابتدا کرنے سے روکے رکھا تا آنکہ خود خارجیوں نے لاحکم الا اللہ کا نعرہ لگا کر اس زور سے حملہ کر دیا کہ پہلے ہی حملہ سے حضرت علیؓ کا پیدل دستہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور خارجی علوی فوج کے میمنہ اور میسرہ پر ٹوٹ پڑے اور اس شجاعت و پامردی سے لڑے کہ ان کے اعضا کٹ کر الگ ہو جاتے تھے لیکن اس حالت میں بھی وہ لڑتے رہتے تھے۔ ایک خارجی شریح بن ابی ادفیٰ کا پاؤں کٹ گیا، وہ اس حالت میں بھی لڑتا رہا۔[۱]

سر سید امیر علی بلگرامی لکھتے ہیں :-

Their conduct became at last so serious as to compel the

---

[۱] نہج البلاغہ مکمل اردو ترجمہ ص ۲۰۳

caliph to attack them. The majority fell fighting; a few escaped to Al-Bahrain and Al-Ahsa, where they formed the nucleus of the fanatical horde which time after time harrased the empires by their sanguinary attacks.[1]

"جب اُن کی روش اس قدر خطرناک ہوگئی کہ خلیفہ اُن پر حملہ آور ہونے پر مجبور ہوگئے۔ اُن کی اکثریت میدانِ جنگ میں قتل ہوگئی، چند گنتی کے بچ کر البحرین اور الاحصا پہنچے جہاں انھوں نے مذہبی جنونیوں کا مرکز قرار دیا وہ وقتاً فوقتاً سلطنتوں کو اپنے خونی حملوں سے پریشان کرتے رہے۔"

حضرت علیؑ کی فوج نے نہروان میں پوری شجاعت سے اُن کا مقابلہ کیا بالآخر ایک خوں ریز جنگ کے بعد خوارج کو نہایت فاش شکست ہوئی اور وہ ایک ایک کرکے مارے گئے۔[2]

---

[1] History of the Saracens. P. 51

[2] اخبار الطوال ص ۲۲۳ - ابن اثیر ج ۳

جنگ ختم ہونے کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خارجی مقتولین میں اس کی لاش کو تلاش کرنا شروع کیا جس کے متعلق رسول اللہ نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔ چنانچہ تمام علامات کے ساتھ ایک لاش برآمد ہوئی تو فرمایا۔

اللہ اکبر! خدا کی قسم رسول اللہ نے کس قدر صحیح ارشاد فرمایا تھا۔[1]

یوں تو خوارج عہد بنو امیہ و بنو عباس میں بھی پائے جاتے تھے لیکن خال خال اور وہ بھی روپوش اور زمین دوز ہوکر۔ چنانچہ کتاب الآغانی میں ان کا ذکر ملتا ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ فرقہ بالکل ختم ہوگیا' البتہ اب موجودہ زمانے میں اگر کہیں اِن کا وجود ہے تو وہ ایک چھوٹی سی ریاست عمان و مسقط میں' جہاں کا فرمانروا بھی خارجی ہے اور باشندے بھی۔[2]

عمان اور مسقط کے علاوہ زنجبار میں بھی اس فرقے کے لوگ آباد ہیں سلطانِ زنجبار اسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ میرے زنجبار کے قیام کے دنوں میں میرے محترم دوست حسین۔ اے۔ رحیم مدظلہ نے ان کے قاضیٔ شریعت سے مجھے ملایا وہ زنجبار سے ۱۷ میل کے فاصلہ پر ایک عظیم الشان باغ میں رہتے ہیں ان سے تبادلۂ خیالات بھی ہوا۔ انہوں نے مجھے اپنے اصول و عقائد کی کتاب بھی دی۔ یہ کتاب شرح النیل وشفا العلیل ہے جو مجتہد الامہ الشیخ محمد بن یوسف کی تالیف ہے۔ یہ کتاب دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ قاہرہ (مصر) کے مکتبہ سلفیہ میں طبع ہوئی۔ اسے پڑھ کر ان کے اصول و عقائد

---

[1] خلفائے راشدین ص ۲۱۵

[2] نہج البلاغہ مکمل اردو ترجمہ ص ۲۰۳

مجھے معلوم ہوئے (محمد لطیف انصاری)

عزمِ شام کا ترک کرنا

جنگِ نہروان سے فارغ ہونے کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے شام کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا، لیکن اشعث بن قیس نے کہا:۔

"امیر المومنینؑ ہمارے تیر ترکش سے خالی ہو گئے۔ تلواروں کی دھاریں مڑ گئی ہیں اور نیزوں کے پھل خراب ہو گئے ہیں اس لیے ہمیں دشمن پر فوج کشی کرنے سے پہلے اسباب و سامان درست کر لینا چاہیئے۔ جنابِ امیرؑ نے اشعث کی رائے کے مطابق نخیلہ میں پڑاؤ کر کے لوگوں کو تیاری کا حکم دیا لیکن لوگ تیار ہونے کی بجائے، آہستہ آہستہ دس دس بیس بیس کر کے کوفہ کی طرف کھسکنے لگے یہاں تک کہ آخر میں کل ایک ہزار کی جمعیت رہ گئی۔ حضرت علیؑ نے یہ رنگ دیکھا تو سرِ دست شام پر فوج کشی کا ارادہ ترک کر دیا اور کوفہ واپس آکر اقامت اختیار کی۔"[۱]

یہاں پر اشعث کا مختصر تعارف ضروری ہے:۔

اشعث بن قیس کندی۔ اس کا اصلی نام معدیکرب ہے اور کنیت ابو محمد ہے۔ اپنے بالوں کی پراگندگی کی وجہ سے اشعث (پراگندہ مو) کے لقب سے مشہور ہے۔ شیخ محمد عبدہ اپنے حاشیہ نہج البلاغہ میں لکھتے ہیں:۔

"جس طرح عبداللہ ابن ابی ابن سلول اصحاب رسولؐ میں تھا

---

[۱] خلفائے راشدین ص ۲۱۵

ویسا ہی اشعث علی ابن ابی طالب کی جماعت میں تھا اور یہ دونوں
اپنے عہد میں چوٹی کے منافق تھے۔"

اشعث واقعہ تحکیم میں جناب امیر علیہ السلام کی مخالفت کرنے والا شخص تھا جس نے جناب امیر کی نافرمانی کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ کہا کہ ہم تحکیم اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کو حکم بنانے پر راضی ہیں اور جناب امیر علیہ السلام کے منع کرنے کے باوجود اسی ضد پر اڑا رہا اور وجہ اس کی یہ تھی کہ معاویہ سے ایک بہت بڑی رقم بطور رشوت حاصل کر چکا تھا[1] یہ قتل جناب امیرؑ میں شریک تھا[2]

معاویہ کا مصر پر حملہ

سنہ ۳۸ھ کے شروع ہونے پر معاویہ نے عمرو عاص کو مصر پر یورش کے لیے لشکر دیکر بھیجا جہاں کے عامل حضرت علیؑ کی جانب سے محمد بن ابی بکر تھے۔

جب محمد بن ابی بکر کو عمرو عاص کی لشکر کشی کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے حضرت علیؑ کو اطلاع دی اور ان سے مدد مانگی۔ حضرت علیؑ نے اُشتر کو محمد بن ابی بکر کی مدد کے لیے روانہ کیا

اُشتر کی شہادت

اشتر قلزم تک پہنچنے پائے تھے کہ کسی نے شہد میں زہر ملا کر پلا دیا اسی مقام پر اشتر نے وفات پائی یعنی شہید ہوئے[3]

---

[1] روضۃ الصفا جلد ۲ صفحہ ۲۰۷ ۔ [2] شرح ابن ابی الحدید ج ۶ صفحہ ۱۳۳

[3] تاریخ ابو الفدا، تاریخ احمدی صفحہ ۲۱۱ و صفحہ ۲۱۲

زہر دلانیوالے حضرت معاویہ تھے

حضرت علیؑ کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے معرکہ صفین کے بعد اشتر نخعی کو مصر روانہ کیا کہ وہ محمد بن ابی بکر کو سبکدوش کر کے ملک کے حالات درست کریں لیکن امیر معاویہ نے راستے میں زہر دلوا کر اشتر نخعی کا کام تمام کر دیا[1]

معاویہ کا خطبہ

جس شخص نے اشتر کو زہر دیا تھا اس نے معاویہ کو اشتر کے انتقال کی خبر دی تو معاویہ نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا اور کہا کہ علی ابن ابی طالب کے دو داہنے ہاتھ تھے ایک بروز صفین کٹ گیا یعنی حضرت عمار دوسرا آج قطع ہوا یعنی اشتر[2]

محمد بن ابی بکر کی شہادت

جب عمرو عاص نے مصر پہنچ کر محمد بن ابی بکر سے جنگ کی تو محمد بن ابی بکر کا لشکر شکست کھا کر منتشر ہو گیا۔ محمد بن ابی بکر گرتے پڑتے ایک خرابے تک پہنچے تھے کہ لوگ انہیں پکڑ کر معاویہ بن خدیج کے پاس لے گئے معاویہ بن خدیج نے ان کو قتل کر ڈالا[3] جب معاویہ کو محمد بن ابی بکر کے مارے جانے کا حال معلوم ہوا تو وہ بہت خوش اور مسرور ہوئے[4]

---

[1] خلفائے راشدین صفحہ ۳۱۷

[2] تاریخ ابن جریر طبری و تاریخ احمدی صفحہ ۲۱۲

[3] تاریخ ابن الوردی، تاریخ احمدی صفحہ ۲۱۲ [4] تاریخ مروج الذہب، تاریخ احمدی صفحہ ۲۱۲

حضرت عائشہ پر بھائی کے قتل کا اثر

جب حضرت عائشہ کو حضرت محمد بن ابی بکر کے قتل کی خبر پہنچی تو وہ نہایت رنجیدہ ہوئیں اور ہر نماز کے بعد معاویہ و عمرو عاص کو بد دعا اور نفرین کرتی تھیں[1]۔

جناب امیرؑ پر اثر

جب حضرت علیؑ کو محمد بن ابی بکر کے مظلومانہ قتل کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت ہی غمگین ہوئے[2]۔

معاویہ نے ۳۹ھ میں فوج کے چھوٹے چھوٹے دستے حجاز، عراق اور جزیرہ میں پھیلا دیئے تاکہ وہ بدامنی پھیلا کر جناب مرتضیٰؑ کی پریشانیوں میں اضافہ کریں۔ چنانچہ نعمان بن بشیر نے دو ہزار کی جمعیت سے، عین التمر پر سفیان بن عوف نے چھ ہزار کی فوج سے انبار اور مدائن وغیرہ پر عبداللہ بن مسعدہ فزاری نے ایک ہزار سات سو آدمیوں سے تیما پر، ضحاک بن قیس نے واقصہ کے نشیبی علاقہ پر اور خود امیر معاویہ نے دجلہ کے ساحلی علاقوں پر حملہ کر کے بیت المال لوٹ لیا اور شیعانِ علیؑ کو تہ تیغ کر کے لوگوں کو اپنی حکومت کے سامنے گردنِ اطاعت خم کرنے پر مجبور کر دیا[3]۔

بُسر بن ارطاۃ کے حجاز میں مظالم

امیر معاویہ نے ۴۰ھ میں پھر از سرِ نو چھیڑ چھاڑ شروع

---

[1] تاریخ ابو الفدا، تاریخ احمدی ص ۲۱۲، [2] تاریخ مروج الذہب، تاریخ احمدی ص ۲۱۲، [3] خلفائے راشدین ص ۲۲

کردی اور بسر بن ارطاۃ کو تین ہزار کی جمعیت کے ساتھ حجاز روانہ کیا اس نے بغیر کسی مزاحمت و جنگ کے مکہ و مدینہ پر قبضہ کر کے یہاں کے باشندوں سے زبردستی امیر معاویہ کے لیے بیعت لی پھر وہاں سے یمن کی طرف بڑھا حضرت ابو موسیٰ اشعری نے پہلے سے پوشیدہ طور پر یمن کے عامل عبید اللہ ابن عباس کو بسر بن ارطاۃ کے حملہ کی اطلاع کردی اور یہ بھی لکھ دیا کہ جو لوگ معویہ کی حکومت تسلیم کرنے میں لیت و لعل کرتے ہیں ان کو بیدردی کے ساتھ تہ تیغ کر دیتا ہے۔ عبید اللہ ابن عباسؓ اپنے آپ کو اُس کے مقابلہ سے عاجز دیکھکر عبداللہ بن عبد المدان کو اپنا قائم مقام بنایا اور خود دربارِ خلافت سے مدد طلب کرنے کے لیے کوفہ کی راہ لی۔ بُسر بن ارطاۃ نے یمن پہنچ کر نہایت بیدردی کے ساتھ عبید اللہ بن عباس کے دو صغیر سن بچوں اور شیعان علیؑ کی ایک بڑی جماعت کو قتل کر دیا [1]

کرمان و فارس کی بغاوتوں کو فرو کرنا

حیدرِ کرار کی ہمتِ مردانہ نے گو بہت جلد امیر معاویہ کے حملہ آور دستوں کو ممالک مقبوضہ سے نکال دیا۔ تاہم اس سے ایک عام بدامنی اور بے رعبی پیدا ہو گئی کرمان اور فارس کے عجمیوں نے بغاوت کر کے خراج ادا کرنے سے انکار کردیا، اکثر صوبوں نے اپنے یہاں سے علوی عمال نکال دیئے، اور ذمیوں نے خودسری اختیار کر لی، حضرت علیؑ نے اس عام بغاوت کو فرو کرنے کے متعلق مشورہ طلب کیا

[1] خلفائے راشدین ص ۲۷۱

لوگوں نے عرض کی کہ زیاد بن ابیہ سے زیادہ اس کام کے لیے کوئی شخص موزوں نہیں ہو سکتا، اس لیے زیاد اس مہم پر مامور ہوئے۔ انہوں نے بہت جلد کرمان، فارس اور تمام ایران میں بغاوت کی آگ فرو کرکے امن و سکون پیدا کر دیا۔

بغاوت فرو ہونے کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے ایرانی باغیوں کے ساتھ اس لطف و مدارات کا سلوک کیا کہ ایران کا بچہ بچہ منت پذیری کے جذبات سے لبریز ہو گیا، ایرانیوں کا خیال تھا کہ امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کے طریقِ جہانبانی نے نوشیروانی طرزِ حکومت کی یاد بھلا دی[1]

فتوحات

گذشتہ حالات سے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ حضرت علیؑ کو اندرونی شورشوں اور خانہ جنگیوں کے دبانے سے اتنی فرصت نہ مل سکی کہ وہ اسلام کی فتوحات کے دائرہ کو بڑھا سکتے تاہم آپ بیرونی امور سے غافل نہیں رہے چنانچہ سیستان اور کابل میں بعض عرب خود مختار ہو گئے تھے اور ان کو قابو میں کر کے آگے قدم بڑھایا[2]

سنہ ۳۸ھ میں بعض مسلمانوں کو بحری راستہ سے ہندوستان پر حملہ کرنے کی اجازت دی۔ اس وقت کوکن بمبئی کا علاقہ سندھ میں شامل تھا، مسلمان رضا کار سپاہیوں نے سب سے پہلے اس عہد میں کوکن پر حملہ کیا[3]

عبیداللہ صاحب امرتسری نے لکھا ہے۔

---

[1] خلفائے راشدین صفحہ ۳۲۰ [2] فتوح البلدان بلاذری باب سیستان و کابل
[3] فتوح البلدان بلاذری ذکر فتوح السندھ

"اس فرصتِ قلیل میں خانہ جنگیوں سے آپ کو دم بھر کی مہلت نہیں ملی۔ ابھی بیعت کی تکمیل بھی نہیں ہوئی تھی کہ واقعۂ جمل پیش آیا اور ابھی اس واقعہ کا خاتمہ نہیں ہو چکا تھا کہ صفین کا معرکہ شروع ہو گیا جس میں آپ کی خلافت کا بڑا بھاری حصہ صرف ہوا۔"

علامہ ابن عبدالبر استیعاب میں لکھتے ہیں۔

"جناب علیؑ سے امیر معاویہ پانچ برس لڑتے رہے، اور ابو عمر کہتے ہیں ٹھیک بات یہ ہے کہ چار برس لڑے، غرض ابھی اس معرکہ سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ آپ کو خارجیوں سے لڑنا پڑا۔ پس یہ ایسے واقعات تھے جن کے سدِراہ ہونے سے نہ آپ ممالکِ غیر پر فوج کشی کر سکتے تھے اور نہ فتح بلاد کی طرف متوجہ ہو سکتے تھے، اگر صحابہ کا وہی اتفاق جو شیخین میں تھا جنابِ امیر علیہ السلام کے خلافت کے زمانے میں بھی قائم رہتا تو البتہ دونوں زمانوں کی فتوحات کا موازنہ کیا جاتا، تاہم کتب کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ باوجود اِن خانہ جنگی کی مزاحمت کے آپ نے اشاعتِ اسلام اور بلاد کے فتح کرنے میں اپنی ہمت کو مبذول رکھا ہے اور اس جہاد میں بھی آپ دیگر صحابۂ کرام سے کم نہیں رہے۔"

چنانچہ علامہ ابن اثیر کامل التواریخ میں لکھتے ہیں،

جناب امیر علیہ السلام کے حکم سے حرث بن مرہ العبدی نے ملک سندھ کا قصد کیا، اور جہاد کر کے بہت غنیمت حاصل کی اور کفار کو گرفتار کر لیا۔ چنانچہ ایک دن میں ایک ہزار لونڈی اور غلام غنیمت کے مال میں تقسیم کیے گئے اور ایک مدت تک حرث بن مرہ وہاں پر مصروفِ جہاد رہے۔ یہاں تک کہ وہ اور اُن کے تمام ہمراہی ارضِ قیقان میں شہید ہو گئے۔[1]

ایک فلاسفر اہل قلم فرانسیسی السنر (OELSNER) لکھتا ہے۔

"اگر علیؑ کو اطمینان سے حکومت کی جانے دی گئی ہوتی تو اُن کے صفاتِ حمیدہ، اُن کا استقلال اور اُن کے کردار کی بلندی قدیم جمہوریت اور اس کے سادہ طریقوں کو لافانی زندگی دے دیتیں۔"[2]

سرحدِ عراق پر ترکتاز

شامی سرداروں نے سرحد عراق پر ترکتاز شروع کر دی اور یہاں کی محافظ سپاہ کو شکست دے کر انبار پر قبضہ کر لیا۔ حضرت علیؑ کو بسر ابن ارطاۃ کے مظالم کا حال معلوم ہوا تو آپ نے جاریہ بن قدامہ اور وہب بن

---

[1] تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۳ صـ۱۵۲، ارجح المطالب صـ۱۷۵

[2] شہیدِ انسانیت صـ۱۵۳ DES EFFETS DE LA RELIGION DE MOHOMET

مسعود کو چار ہزار کی جمعیت کے ساتھ اس کی سرکوبی کے لیے یمن و حجاز کی مہم پر مامور فرمایا اور کوفہ کی جامع مسجد میں پُرجوش خطبہ دیکر لوگوں کو حدودِ عراق سے شامی فوج نکال دینے پر اُبھارا اور یہ تقریریں ایسی مؤثر تھیں کہ اہلِ کوفہ کے مردہ قلوب میں بھی فوری طور پر روح پیدا ہوگئی اور ہر گوشہ سے صدائے لبیک بلند ہوئی لیکن جب کوچ کا وقت آیا تو صرف تین سو آدمی رہ گئے جنابِ مرتضیٰؑ کو اہلِ کوفہ کی اس بے حسی پر نہایت صدمہ ہوا۔

حجر بن عدی اور سعید بن قیس ہمدانی نے عرض کی :-

"امیرالمومنین! بغیر تشدد کے یہ لوگ راہ پر نہ آئیں گے عام منادی کرا دیجیے کہ بلا استثناء ہر شخص کو میدانِ جنگ کی طرف چلنا پڑے گا اور جو شخص اس میں تساہل یا اعراض سے کام لے گا اس کو سخت سزا دی جائے گی۔"

اب صورت حال ایسی تھی کہ مشورہ پر عمل کرنے کے سوا چارہ نہ تھا، اس لیے حضرت علیؑ نے اس کا اعلان عام کردیا اور معقل بن قیس کو ساتیق بھیجا کہ وہاں سے جس قدر سپاہی بھی مل سکیں جمع کرکے لے آئیں، لیکن یہ تیاریاں ابھی حدِ تکمیل کو نہیں پہنچی تھیں کہ ابنِ ملجم کی زہرآلود تلوار نے جامِ شہادت پلا دیا۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا اِلیہِ راجعون[1]

---

[1] خلفائے راشدین صـ ۲۲۲

شہادت جناب امیرالمومنین علیٔ مرتضیٰ

ابداحنالہُ العدا

سر امیر علی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

After this the war against Moawiyah proceded in a desultary manner. The caliph was hampered by difficulties on the eastern frontier and was unable to direct a large force against him. He thus found himself able not only to secure Syria and proclaim himself Caliph but also to conquer Egypt. Poison and the dagger helped to remove the most notable followers of the Caliph, who himself was struck down by the hand of assasion on the 27th January 661 A.C;

whilst offering his devotion at the public mosque at Kufa.[ل]

"اس کے بعد معاویہ سے بے ترتیب جنگ جاری رہی' خلیفۂ وقت حضرت علی علیہ السلام مشرقی سرحد پر مشکلات میں مبتلا تھے اس لیے ایک کثیر فوج اس کے مقابلے کے لیے کوفہ بھیج سکتے تھے ان حالات میں اس نے نہ صرف حکومتِ شام پر استحکام اور خلافت کا اعلان کیا بلکہ مصر کو بھی فتح کر لیا۔ اس کی کامیابی کا راز زہر اور خنجر میں مضمر تھا جن کی امداد سے اس نے خلیفۂ وقت حضرت علیؑ کے مشہور متبعین کو اپنی سیاست کی راہ سے ہٹا دیا بلکہ خود حضرت علیؑ بھی ۲۷ جنوری ۶۶۱ء کو ایک قاتل کے ہاتھ سے شہید ہوئے جب کہ وہ کوفہ کی جامع مسجد میں مصروفِ عبادت تھے"۔

دورِ حاضر کے مشہور مورخ' مصر کے سابق وزیرِ تعلیم اور ایک متعصب اہلِ سنت اپنی مشہور تالیف الفتنۃ الکبریٰ میں لکھتے ہیں۔

(حضرت علی علیہ السلام عنانِ حکومت ہاتھ میں لیے ہوئے تھے) اس وقت عرب اپنی قدیم جاہلیت کی زندگی اور گمراہی کی تاریکیوں کی طرف پلٹ چکے تھے۔ انہوں نے دینِ اسلام کو بالکل بھلا دیا تھا یا قریب قریب بھول گئے تھے۔[۲]

ل History of the Saracens P.51 ۲ الفتنۃ الکبریٰ جلد ۲ ص ۵۶

ان حالات میں بنی امیہ کا شام کے صوبہ پر تسلط ہوا اور معاویہ کے ساتھ عمرو عاص سا شاطر بھی مل گیا جو سیاسی چالبازیوں میں معاویہ سے کم نہ تھا چنانچہ طہٰ حسین موصوف نے لکھا ہے [1]

"چنانچہ اس عمرو عاص کی جنگ صفین میں ایک چال سے فتنۂ خوارج پیدا ہوا۔ جنابِ امیر علیہ السلام نے جنگ نہروان میں خوارج کو شکست دی، نہروان کے شکست خوردہ افراد میں سے ایک شخص عبدالرحمٰن ابن ملجم نے امیر المومنینؑ کے دشمنوں سے مل کر آپ کے قتل کی سازش ترتیب دی چنانچہ ابن ملجم اس غرض کے لیے کوفہ میں وارد ہوا وہاں ایک حسین و جمیل عورت قطامہ کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ قطامہ کا باپ اور اس کا بھائی افواجِ جنابِ امیرؑ کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، عبدالرحمٰن ابن ملجم نے جب اس سے شادی کی درخواست کی تو وہ اس شرط پر رضامند ہوئی کہ ابن ملجم جنابِ امیر علیہ السلام کو قتل کرے ابن ملجم نے اسے منظور کیا اور وہ اپنے ارادہ میں اور بھی پختہ ہو گیا اور اس کے ساتھ وردان، شبیب اور دوسرے شر پسند بھی شریک ہو گئے۔ ۱۹ ماہ مبارک رمضان کی صبح کو جنابِ امیر علیہ السلام مسجد میں تشریف لائے، اذان دی جب نماز میں مشغول ہوئے تو سجدہ کی حالت میں ابن ملجم نے سر پر تلوار ماری جس سے سر

[1] الفتنۃ الکبریٰ جلد ۲ صفحہ ۶۷

مبارک مغز تک شگافتہ ہوگیا۔ آپ نے فرمایا
کعبہ کے رب کی قسم میں اپنے مطلب میں کامیاب ہوگیا۔ اس
کے بعد لوگ آپکو گھر میں لائے ابن ملجم بھی گرفتار ہو کر آیا۔ حضرت
نے حکم دیا کہ اس کی حفاظت کرو۔ اچھا کھانے کو دینا اور نرم بچھونا
سونے کو دینا اگر میں بچ گیا تو اپنے خون کا ولی ہوں، خواہ معاف
کردوں خواہ قصاص لے لوں، اگر مر گیا تو اسے بھی مار دینا مگر حد
سے نہ گزرنا۔" [1]

جناب امیر علیہ السلام کے اس قتل کی سازش میں اشعث بن قیس بھی
شریک تھا چنانچہ کافی میں حضرت صادق آل محمد علیہ السلام نے اس کے خاندان
کی خاندانِ رسالت کے خلاف جدوجہد کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

"اشعث بن قیس خونِ جناب امیرؑ میں شریک تھا اس
کی بیٹی جعدہ نے امام حسن علیہ السلام کو زہر دیا۔ اس کے بیٹے
محمد نے خونِ امام حسین علیہ السلام میں شرکت کی۔" [2]

اشعث کی شرکت کے واقعہ کی تفصیل اس طرح پر ہے:۔

"جس شب علی الصباح بدبخت ازلی عبدالرحمٰن ابن ملجم نے
جناب امیر علیہ السلام کے سرِ اقدس پر ضرب لگائی ابن ملجم کی مدد
کے لیے اشعث بھی کوفہ میں موجود تھا اور ابن ملجم اور شبیب
وغیرہ کے ساتھ جناب امیر علیہ السلام کی سازش قتل میں شریک و

---

[1] تاریخ طبری جلد ۵ صـ۸۶ ، [2] منہاج البراعۃ شرح نہج البلاغۃ جلد ۱ صـ۲۷۳

سہیم و حصہ دار تھا، حضرت حجر بن عدی بھی اس شب کو مسجدِ کوفہ میں عبادت کر رہے تھے انہوں نے سنا کہ اشعث ابن ملجم کو کہہ رہا تھا۔

"اپنی حاجت کو جلدی پورا کر جلدی۔ صبح ہونے پر تجھے رسوا کر دیا جائے گا۔"

حضرت حجر اشعث کے مطلب کو سمجھ گئے اور اشعث سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اے اعور (یک چشم) تو نے انھیں خود قتل کر دیا۔"

حضرت حجر جناب امیرؑ کو اطلاع دینے کے لیے جلدی سے آگے بڑھے مگر اس وقت ابن ملجم اپنا کام تمام کر چکا تھا [۱]

اشعث بنو امیہ کا آدمی تھا چنانچہ تحکیم کے معاملہ میں جناب امیرؑ کی سب سے زیادہ مخالفت کرنے والا یہی تھا جس کے لیے وہ معاویہ سے ایک بڑی رقم بطور رشوت حاصل کر چکا تھا [۲]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جناب امیرؑ کے قتل میں کون کون سی طاقتیں کام کر رہی تھیں۔

۲۱ رمضان کی صبح ہوتے اولاد کو وصیتیں کرنے کے بعد جناب امیر علیہ السلام راہئ ملکِ بقا ہوئے۔ چراغِ ہدایت و امامت خاموش ہو گیا،

---

[۱] منہاج البراعہ شرح نہج البلاغہ جلد ۱ ص ۲۷۲، الدمعۃ الساکبہ ص ۲۷۲، مناقب شہر آشوب جلد ۵ ص ۱۸، کشف الغمہ ص ۱۳۱، [۲] روضۃ الصفا جلد ۲ ص ۲۰

حسنین اور عبداللہ ابن جعفر علیہم السلام نے غسل دیا' تجہیز و تکفین کے بعد امام حسن علیہ السلام نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ کوفہ سے دور نجفِ اشرف کے مقام پر نعش مطہر دفن کر دی گئی۔ حضرت کی وصیت کے مطابق نشان قبر چھپا دیا گیا۔

اور یہ اس لیے تھا تاکہ بنو امیہ اپنے اقتدار کے زمانے میں نبش قبر کر کے کسی بے حرمتی کا ارتکاب نہ کر سکیں۔

اُن کی شہادت پر کرنل آسبورن کے یہ الفاظ ہیں۔

Thus died in the prince of his life the best hearted muslim that ever lived.[1]

"اس طرح پر بہترین دردِ دل رکھنے والے مسلم کا انتقال اس کی عمر کے بہترین حصہ میں ہوا۔"

پھر یہی مؤرخ لکھتا ہے۔

With him perished the truest hearted and best muslim of whom Muhammedan history has preserved The rememberence Abid.

"علیؑ کی موت ان تمام لوگوں میں جن کا ذکر اسلامی تاریخ

---

[1] History of saracens P.52

میں باقی ہے بہترین اور سب سے زیادہ سچا دل رکھنے والے مسلمان کی تھی۔"

یہی مورخ بارگاہ مرتضویؑ میں اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔

Ali, however, with that tender-hearted repugnance to shed the blood of his own creed, which marked his career through life forbore to attack them.[1]

"مگر علیؑ نے جن کے دل میں زندگی بھر مسلمانوں کا خون بہانے سے رحمدلانہ نفرت رہی ان خارجیوں پر حملہ کرنے سے اجتناب کیا"

پروفیسر ایم۔ جی۔ رنالڈز (M. G. Reynold) لکھتے ہیں

"جو مرتبہ دنیا میں علیؑ کو ملا ہے وہ آج تک کسی کو بھی حاصل نہیں ہوا۔ حضرت علیؑ نے روحانیت کے ساتھ دنیا پر حکومت کی اور اہل دنیا کو امن و سلامتی کے ساتھ حکومت کرنے کا طریقہ سکھلایا۔ ان کی شہادت کے روز جہاں کوفہ کے کلمہ گو روئے وہاں سب سے زیادہ عیسائیوں نے بکا کی۔ علیؑ کے مرنے پر ہزاروں یہودی اور عیسائی عورتیں اور بچے جو بے وارثی کے عالم میں محض

---

[1] Islam under the Arabs chapter 4. P. 120

اُن کے دستِ فیض سے پرورش پاتے تھے محروم ہو گئے اور بھوکے پیاسے مارے مارے پھرنے لگے ' جب بیت المقدس میں بطریقِ اعظم کو شہادتِ علیؑ کی خبر پہنچی ' تو دو دن تک اس مبارک شہر کے گلی کوچوں میں افسوس و حسرت چھائی رہی ۔ بطریقِ اعظم کی آنکھوں سے اس سانحہ سے آنسو نہ تھمے "[1]

۱۹۱۰ء میں ریورینڈ میجر ان۔ ہال (Rev Major. N. Hall) نے حضرت علیؑ کی شہادت پر تقریر کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے۔

" حضرت علیؑ کے اٹھ جانے سے دنیائے روحانیت حکومت سے خالی ہو گئی۔ حضرت علی علیہ السلام تمام عالم کے لیے مشعلِ ہدایت تھے۔ ان کا وجود دوسری اقوام کے لیے بھی امن و سلامتی اور رحمت کا باعث تھا ' افسوس ایک باغی کی تلوار نے دنیا کی امن و سلامتی کو آغوشِ لحد میں سُلا دیا ' دنیا میں حضرت علیؑ سے بڑھ کر ہر دلعزیز کوئی دوسرا نہ ہو سکا۔ اگرچہ ان کا جنازہ رات کو اٹھا مگر اس وقت بھی کوفہ کے تمام گلی کوچے ' عیسائی ' یہودی اور آتش پرست سوگ نشینوں سے بھرے پڑے تھے اور وہ ہمیشہ اس طرح روتے رہے جیسے کوئی باپ کو روتا ہے "[2]

مخالفین کا یہ اعتراف ایسا ہی ہے جیسا کہ ہینی بال کی شجاعت اور فنونِ جنگ کے متعلق اس کے مخالفین رومی مورخین کرنے پر مجبور ہوئے ہیں

---

[1] روحانیت و اسلام مؤلفہ ایم جی آرنلڈ آخر باب ۲ نیز ناموسِ اسلام

[2] شہیدِ انسانیت صـ۱۵

اولاد و ازواج

اولادِ ذکور :-

اولاد	از
۱۔ حضرت امام حسن مجتبیٰؑ	سیدہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا
۲۔ حضرت امام حسینؑ سید الشہداء	سیدہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا
۳۔ حضرت محسن سقط شدہ	سیدہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا
۴۔ محمد حنیفہ	حضرت خولہ
۵۔ ابوالفضل عباس اکبر علمدار	حضرت ام البنین
۶۔ عبداللہ اکبر سقائے اہلبیت	حضرت ام البنین
۷۔ جعفر اکبر	حضرت ام البنین
۸۔ عثمان اکبر	حضرت ام البنین
۹۔ عباس اصغر شہید کربلا	حضرت ام ولد
۱۰۔ محمد اصغر	نامعلوم
۱۱۔ ابوبکر	نامعلوم
۱۲۔ یحییٰ	حضرت اسماء بنت عمیس
۱۳۔ عون	حضرت اسماء بنت عمیس
۱۴۔ عبیداللہ	حضرت ام ولد
۱۵۔ محمد اوسط	حضرت امامہ
۱۶۔ عمر اطرف یا اکبر	حضرت صہبا

۱۷۔ عبداللہ اصغر مکنی بابوبکر	حضرت لیلیٰ بنت مسعود
۱۸۔ عثمان اصغر	نامعلوم
۱۹۔ عمر اصغر	حضرت امِ حبیبہ

اولاد اناث :۔

۱۔ زینبِ کبریٰ	زوجہ عبداللہ بن جعفر
۲۔ ام کلثوم	زوجہ محمد بن جعفر
۳۔ زینبِ صغریٰ	زوجہ محمد بن عقیل
۴۔ رقیہ کبریٰ	زوجہ مسلم بن عقیل
۵۔ نفیسہ	زوجہ عبداللہ بن عقیل
۶۔ امامہ	زوجہ عقیل ابن عبداللہ
۷۔ میمونہ	زوجہ عبداللہ اکبر بن عقیل
۸۔ رملہ	
۹۔ ام ایمن	
۱۰۔ فاطمہ	
۱۱۔ میمونہ صغریٰ	
۱۲۔ خدیجہ صغریٰ	
۱۳۔ رقیہ صغریٰ	
۱۴۔ ام ہانی	

۱۵۔ رملہ صغریٰ
۱۶۔ حمامہ ام جعفر
۱۷۔ ام کرام
۱۸۔ ام سلمہ [1]

---

[1] کفایۃ الطالبین، مقاتل الطالبین، بحر الانساب، سر الانساب، ناسخ ص۶۰۸، ج ۲، ارشادِ مفید ص۱۶۶؛

سیرتِ عابدہ علویہ

۱- اللہ سے ربط

اللہ سے عشق و محبت زینب بنت کعب "ابوسعید خدری" کے ہاں تھیں (الخولانی ابوسعید سے روایت کی ہے کہ کچھ لوگوں نے رسولِ خدا سے حضرت علیؑ کی شکایت کی اسوقت حضرت نے اپنی تقریر میں فرمایا۔ یاایھا الناس لاتشکوا علیاً فواللہ انہ لاخشن فی ذات اللہ۔[۱]

"اے لوگو! علیؑ کی شکایت نہ کرو، وہ ذاتِ الٰہی کے بارے میں بہت سخت ہیں۔"

نیز فرمایا۔ لاتسبوا علیاً فانہ ممسوس فی ذات۔[۲]

"علیؑ کو برا نہ کہو یہ عشقِ الٰہی میں سرگشتہ ہیں"

علامہ ابونعیم اصفہانی احمد بن عبداللہ بن احمد متوفی ۴۳۰ھ لکھتے ہیں۔

"معاملاتِ دینی میں علیؑ سخت تھے۔ عشقِ الٰہی میں سرگشتہ و وارفتہ تھے۔"[۳]

علیؑ ایسے موحد و مسلم باسلام بلاواسطہ تھے کہ علمائے تاریخ یک زبان ہوکر کہتے ہیں:-

"علیؑ جاہلیت کی کثافتوں سے آلودہ نہ ہوئے، نہ بت پرستی کی اور نہ کسی اور اخلاقی و معاشرتی و دینی کمزوریوں میں،

---

[۱] حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۶۸، [۲] حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۶۸، [۳] حلیۃ الاولیاء جلد ۱ ص ۶۲

مبتلا ہوئے [1]

اسی لیے آپ کو کرم اللہ وجہٗ کہتے ہیں، یعنی خدا نے آپ کے چہرہ کو عبادت ماسوا اللہ سے محفوظ رکھا [2]

لذت معرفتِ الٰہی

حضرت علیؑ فرماتے ہیں مجھے اس میں کوئی مسرت نہ ہوتی اگر میں بچپن میں ہی مرجاتا اور مجھے جنت میں داخل کر دیا جاتا، اور میں سن شعور کو نہ پہنچتا جس میں مجھے اپنے بزرگ و برتر رب کی معرفت حاصل ہوئی [3]

معرفت و یقین

جنابِ امیر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"ماشککتُ فی الحق مذ رایتہ۔" [4]

"جب سے مجھے حق دکھایا گیا ہے میں نے کبھی اس میں شک و شبہ نہیں کیا۔"

"وانی لعلی یقینٍ من ربی غیر ستبهةٍ من دینی" [5]

"اور میں اپنے پروردگار کی طرف سے یقین کے ایسے درجہ پر فائز ہوں کہ اپنے دین کی حقانیت میں مجھے کوئی شک نہیں"

معرفت و عرفان

ذعلب یمانی نے حضرت امیر المومنینؑ سے سوال کیا۔ یا امیر المومنینؑ کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا

---

[1] اتمام الوفا بسیرۃ المصطفےٰ محمد خضری مصری مطبوعہ مصر ص ۱۹۷، [2] اسعاف الراغبین علامہ صبان مصری ص ۱۴۹، [3] حلیۃ الاولیاء جلد ا ص ۶۷، [4] نہج البلاغہ ص ۱۲۱ طبع مصر خطبہ ۴، [5] نہج البلاغہ ص ۵۶ خطبہ ۲۱ طبع مصر۔

ہے۔ فرمایا کیا میں اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں جسے میں نے دیکھا ہی نہیں؟ اس نے عرض کیا آپ نے کس طرح دیکھا ہے ارشاد فرمایا:۔

"لاتدرکہ العیون بمشاھدۃ الاعیان ولاکن تدرکہ القلوب بحقائق الایمان" [۱]

"آنکھیں اس کو جسمانی بصارت سے نہیں دیکھتی لیکن دل اس کو حقائق ایمان سے پا لیتے ہیں۔"

۲۔ عبادت

مخلصانہ عبادت

جنابِ امیر علیہ السلام اپنی ایک دعا میں فرماتے ہیں:۔

"میرے معبود میں نے کبھی تیری عبادت جہنم کے خوف سے نہیں کی۔ کیونکہ ایسی عبادت میں غلامانہ ذہنیت ہے اور نہ میں نے تیری عبادت جنّت کی طمع میں کی ہے کیونکہ یہ اجیرانہ عبادت ہے یعنی اس عبادت میں مزدورانہ ذہنیت ہے۔ میں نے تجھے عبادت کے لائق پایا۔ پس تیری عبادت وجدانِ محبت سے کی ہے۔ میرے معبود میں نے تجھے ایسا ہی معبود پایا۔ جیسا میں چاہتا تھا کہ میرا معبود ہو تو مجھے ایسا بندہ بنالے جیسا تو چاہتا ہے کہ تیرا بندہ ہو" [۲]

لذتِ عبادت

جنابِ امیر علیہ السلام نے اپنی لذتِ عبادت کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔

---

[۱] نہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۲۰ خطبہ ۱۸۴ طبع مصر

[۲] امیر المومنین لعماد زادہ ص ۳۲۸ الارشاد العزا ص ۲۹

"استلذذت استلذاذاً ظننت ان اللّٰہ لا یوجرنی علیہ" [1]

"مجھے عبادت میں ایسی لذّت حاصل ہوئی جو لذّت کا حق ہے جس پر میں نے گمان کیا کہ اب اللہ تعالےٰ مجھے اس پر کوئی اجر نہیں دیگا"

شجاعت و عبادت امیر المومنین ایسے انسان تھے کہ رزم گاہ میں اپنی شمشیر آبدار سے دشمن کو تہ تیغ کرتے پھر مسجد میں آکر نماز پڑھتے اور عشقِ الٰہی میں گریہ و بکا فرماتے رہے، العجب حیرت کا مقام ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں ایسی قوّتِ قلب کا مظاہرہ اور دوست (اللہ) کے سامنے ایسی خوف و خشیت و ہیبت [2]

عبادت ربانی خود علیؑ کی زبانی حضرت علی علیہ السلام خود فرماتے ہیں :-

"علی پر ایسا دن کبھی نہ آیا کہ آفتاب نے طلوع کیا ہو اور علیؑ سویا ہوا ہو۔ علیؑ پر ایسی رات کبھی نہ آئی جس میں علیؑ نے نماز شب (تہجد) ترک کی ہو۔ یہاں تک کہ لیلۃ الھریر کی رات جس رات کے صفین میں شدید ترین جنگ ہو رہی تھی۔ علیؑ عین میدانِ جنگ میں صفوفِ جنگ کے درمیان کھڑے نماز پڑھ رہے تھے اور اُن کے سامنے تیر زمین پر گر رہے تھے، اس رات صفین کی لڑائی میں افقِ آسمان کی طرف غور سے دیکھتے اور اس شدید جنگ کی حالت میں پوچھتے کہ افق کے اس طرف کی کیا خبر ہے (یعنی سپیدۂ صبح نمودار

---

[1] زہر الربیع لسید نعمت اللہ جزائری الارشاد والعزا صفحہ ۵۷۔ [2] امیر المومنین لعماد زادہ صفحہ ۳۲۹

ہوا ہے یا نہیں) میں چاہتا ہوں کہ میں دیکھوں کہ ظہر طالع ہوئی ہے تو نماز پڑھوں یا ابھی نہیں۔ ابن عباس نے کہا ایسے اہم لڑائی اور ایسی شدید جنگ میں یہ نماز پڑھنے کا کونسا موقعہ ہے۔ فرمایا اے عباس ہم بقائے نماز کے لیے ہی ان لوگوں سے جنگ کر رہے ہیں۔[۱]

ہر شب ہزار رکعت امیر المومنین ہر رات ایک ہزار رکعت نماز پڑھتے تھے۔ آپ کے ہاں پانچ سو کھجور کا درخت تھا ہر درخت کے نیچے دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ ان کی کنیز ام سعید سے لوگوں نے پوچھا کہ نماز کے لحاظ سے رمضان اور شوال کے مہینوں میں کیا فرق تھا اس نے کہا کہ علیؑ تمام رات بیدار رہتے تھے اور نماز میں مشغول رہتے تھے۔[۲]

شغفِ مسجد علی علیہ السلام مکتب ربوبی کو بہت تقویت دیتے تھے اور فرماتے تھے مسجد میں زندگی بسر کرنا مجھے بہشت میں زندگی بسر کرنے سے زیادہ محبوب ہے کیونکہ بہشت میں ہونا میری خوشنودی کا باعث ہے اور مسجد میں ہونا میرے معبود کی خوشنودی کا باعث ہے۔[۳]

مقامِ عبادت گزاری اگر ہم صفوفِ بشری میں نظر کریں تو سرکارِ رسالت محمد مصطفےٰ کے بعد عبادت و تقدیس و تمجید میں علی علیہ السلام سے بالاتر کسی کا مقام نہیں ہے۔ کسی شخص میں یہ قدرت و استطاعت نہ تھی کہ ان کی مانند عبادت کریں۔ ان کے بعد حسینؑ اور علی ابن الحسین سجادؑ نے

---

[۱] ارشاد دیلمی ج ۲ ص ۱۸ ، [۲] کفایت الطالب گنجی ص ۲۵۸

[۳] ارشاد القلوب ج ۲ ص ۱۸

عبادت میں درجاتِ رفیعہ حاصل کیے تھے[1]

خانۂ خدا، خانۂ علیؑ

سعد ابن ابی وقاص کہتے ہیں کہ علیؑ کے لیے مسجد گھر کی طرح تھی جس میں وہ اس طرح عبادت کرتے تھے جس طرح رسول اللہؐ کیا کرتے تھے[2]

درجۂ عبادت

جناب سید سجادؑ سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کی عبادت زیادہ ہے یا آپ کے جدِّ امجد علی علیہ السلام کی فرمایا کہ میرے جد کے مقابلے میں میری عبادت کو وہ درجہ حاصل ہے جو میرے جد کی عبادت کو رسول اللہؐ کی عبادت سے تھا[3]

خشیت و خضوع و خشوع

علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے جناب علی مرتضیٰؑ کی عبادت کے متعلق ایک روایت نقل کی ہے جسے سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ علی علیہ السلام شب کے آخری حصہ میں تھوڑی سی استراحت فرما کر اٹھتے آسمان کی طرف دیکھتے اور پھر اس آیۂ مبارکہ کی تلاوت کرتے۔

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیَاتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آلِ عمران)

"تحقیق آسمانوں اور زمینوں کی خلقت میں اور دن اور رات کے اختلاف میں ایسے صاحبانِ عقل کے لیے نشانیاں ہیں جو اللہ کا

---

[1] مناقب ج ۲ ص ۱۲۵ ؍ [2] ذخائر العقبیٰ ص ۱۰۲ ؍ [3] کفایت الطالب گنجی ص ۲۵۸

ذکر کھڑے ہوئے بھی کرتے ہیں اور بیٹھے ہوئے بھی اور پہلو پر لیٹے
ہوئے بھی اور آسمان اور زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں اور
کہتے ہیں اے ہمارے پالنے والے تو نے انہیں بے کار پیدا نہیں
کیا تو پاک ہے ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے"

اس آیت کی تلاوت کر کے نماز میں معروف ہو جاتے اور جو لوگ نخلستانوں میں سوئے ہوئے ہوتے۔ اُن کو جگاتے پھر مسجد میں تشریف لیجاتے۔ اہلِ مسجد کو بیدار کرتے اور نماز میں سر سجدہ میں رکھ دیتے اور اس قدر روتے کہ سر کے نیچے کی کچی اینٹ گیلی مٹی ہو جاتی۔ خوفِ خدا میں روتے تھے اور خضوع و خشوع کا یہ عالم تھا کہ نماز کی حالت میں تیر اُن کے پاؤں سے نکال لیا گیا اور انہیں خبر بھی نہ ہوئی[۱]

۳- اخلاص

شب ہجرت کا واقعہ ان کے اخلاص کی روشن دلیل ہے، علی علیہ السلام کی یہ فداکاری اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ سے ان کے علاقہ و اخلاق کی شاہد صادق ہے۔

نمونہ از اخلاصِ علیؑ مولانا روم اسی اخلاص کو نظم کرتے ہوئے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔

از علی آموز اخلاصِ عمل — شیرِ حق را داں منزہ از دغل

"علی علیہ السلام سے اخلاصِ عمل کی تعلیم لو اور شیرِ حق کو آمیزش سے پاک و پاکیزہ سمجھو"

---

[۱] بحارالانوار ج ۹ ص ۱۳

در غزا بر پہلوانے دست یافت زود شمشیرے بر آورد و شتافت

"وہ ایک جنگ میں ایک پہلوان پر انھوں نے غلبہ پایا، جلد ہی تلوار نکالی اور اُس کی طرف دوڑے۔"

او خدو انداخت بر روئے علیؓ افتخارِ ہر نبی و ہر ولی

"اُس نے حضرت علیؓ کے روئے انور پہ تھوک دیا۔ وہ علیؑ جو ہر نبی اور ہر ولی کا افتخار ہیں۔"

در زماں انداخت شمشیر آں علیؓ کرد او اندر غزائش کاہلی

"اسی وقت حضرت علیؓ نے تلوار پھینک دی اور لڑائی میں کاہلی اختیار کی۔"

گفت برمن تیغِ تیز افراشتی از چہ افگندی مرا بگذاشتی

"اس پہلوان نے پوچھا کہ مجھ پر تیز تلوار کو بلند کر کے تُو نے کیوں پھینک دیا اور مجھے کیوں چھوڑ دیا۔"

گفت من تیغ از پئے حق میزنم بندۂ حقم نہ مامورِ تنم!

"میں حق کے لیے تلوار چلاتا ہوں، میں حق کا بندہ ہوں جسم کا غلام نہیں ہوں۔"

شیرِ حقم نیستم شیرِ ہوا فعلِ من بر دینِ من باشد گوا

"میں حق کا شیر ہوں۔ خواہشاتِ نفسانی کا شیر نہیں ہوں، میرا یہ فعل میرے دین کی صداقت پہ گواہ ہے۔"[1]

حلم وعفو

حکایتِ کنیز وخرما فروش امیر المومنین کے حلم کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک دن ایک خرما فروش کے پاس سے

---

[1] مثنوی مولانا روم

گزر رہے تھے، آپ نے دیکھا کہ ایک کنیز رو رہی ہے۔ آپ نے اس کی گریہ و زاری کا سبب پوچھا۔ اس نے عرض کیا میرے آقا نے ایک درہم دیا تھا کہ میں کھجوریں خرید لاؤں۔ میں نے اس خرما فروش سے خریدیں میرے آقا نے انہیں پسند نہ کیا اور مجھے واپس کرنے کے لیے لوٹا دیا۔ اب یہ خرما فروش کھجوریں واپس نہیں لیتا۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے خرما فروش سے کہا: "یہ کنیز ہے، بے اختیار بیچارہ ہے کھجوریں واپس لے لو اور اس کا درہم اسے دیدو"۔ خرما فروش اٹھا جناب امیرالمومنینؑ کے ایک مُکا مارا اور کہا "تجھے اس امر سے کیا واسطہ" اس پر لوگ متوجہ ہوئے اور کہا اے بیوقوف تُو نے نہیں سمجھا کہ تُو نے کیا کیا ہے، ارے احمق یہ امیرالمومنینؑ ہیں۔ اس نوجوان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، کھجوریں اٹھالیں اور درہم واپس کر دیا، اور عرض کی مولا! مجھ سے راضی ہو جیے۔ فرمایا اگر تو اپنے امور کی اصلاح کرلے تو میں تجھ سے خوش ہوں۔[1]

ایک غلام اور علوی عفو

ایک غلام کو امیرالمومنینؑ نے کئی مرتبہ پکارا اس نے جواب نہ دیا جب آپ باہر آئے تو وہ گھر کے دروازہ پر کھڑا تھا۔ آپ نے فرمایا تو نے جواب کیوں نہ دیا۔ اس نے عرض کیا "میں سزا سے مامون و مصئون تھا" آپ نے فرمایا "خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسا انسان بنایا ہے۔ جس سے لوگ امن و سلامتی میں ہیں، پھر فرمایا جاؤ میں نے تجھے آزاد کیا۔ جہاں تیرا جی چاہے چلا جا، اس واقعہ پر اشجع شاعر نے یہ شعر کہا:[2]

ولست بخائف لابی حسین ۔۔۔ ومن خاف الالٰہ فلن یخافا

---

[1] مناقب جلد ۱ ص ۳۱۶ ، [2] مہرتاباں ص ۱۱۵

"میں ابوالحسین یعنی حضرت علیؑ سے اس لیے نہیں ڈرتا ہوں کہ جو خدا سے ڈرتا ہو اس سے ڈرا نہیں جاتا"

حضرت علیؑ کے اسی حکیمانہ شکوہ کی بدولت ان کے مکتب کے شاگرد بھی اسی روش پر گامزن تھے۔ چنانچہ ایاس بن معویہ بازار میں سے گزر رہے تھے۔ ایک سبزی فروش نے سبزی کے ساتھ ان پر پھینک دیئے۔ ایاس چپکے سے چلے گئے۔ نیز مسجد میں جا کر اس کے لیے نماز پڑھی اور استغفار کی۔[1]

امیرالمومنین علیہ السلام کا حلم و بردباری حق کمال پر تھا وہ ہمیشہ صبر و بردباری سے کام لیتے تھے مگر جہاں اجرائے احکام حق کا معاملہ ہوتا وہ اجرائے حق میں کسی چیز کو رکاوٹ بننے نہیں دیتے تھے۔

فرید وجدی کہتا ہے:-

"حلم کے متعلق علیؑ اور معاویہ میں یہ فرق تھا کہ معاویہ حلم و سیاست میں حدود شرع سے تجاوز کر جاتا تھا اور اپنی حکومت کی بقا کے لیے حلم اختیار کرتا تھا لیکن حضرت علی مرتضیٰ حق کی بات درمیان میں آتی تھی تو حدود شرع سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ اور راہ حق میں کسی شخص کی ملامت سے نہیں ڈرتے تھے اور معاویہ ہر جگہ بردباری اختیار کرتا تھا اگرچہ اس میں امور مقدسہ کی توہین ہو رہی ہوتی۔"[2]

معاویہ اپنی بردباری اور حلم کے باوجود حضرت علی علیہ السلام کے دوستوں اور خیرخواہوں سے نہایت تشدد اور سختی سے سلوک کرتا تھا۔ علی علیہ السلام شخصی فائدہ کے لیے کسی شخص سے خشونت و غضب کو روا نہیں رکھتے تھے۔

---

[1] امیرالمومنین لعماد زادہ ص ۳۳۲، [2] دائرۃ المعارف فرید وجدی ص ۶۶۰

معاویہ حلم کو اپنے سیاسی مقاصد کی دستاویز قرار دیتا تھا اور علی علیہ السلام حلم کو اجرائے احکامِ دینی کے لیے استعمال کرتے تھے، جمل، صفین اور نہروان کی لڑائیوں میں بہت سے ایسے اشخاص تھے جو علی علیہ السلام سے شماتت کرتے اور دشنام دیتے تھے یہ کوہِ وقار، حلم و بردباری کا دریا کسی سے ترش نہیں ہوتا تھا اور کسی کا کینہ اپنے دل میں نہیں رکھتا تھا مگر اس صورت میں کہ جب لوگ دین کی مخالفت کرتے تھے تو تلوار کھینچ کر کیفرِ کردار کو پہنچاتے، مروان حکم، عبداللہ زبیر، معاویہ و عمرو عاص ایسے تھے مگر علیؑ نے مکتبِ نبوت میں پرورش پائی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے مخالفین سے کہا "لا تثریب علیکم الیوم" "آپ سے کوئی باز پرس نہیں ہے۔"

علی علیہ السلام اکثر فرمایا کرتے کہ مجھے اس سے شرم محسوس ہوتی ہے کہ کوئی گناہ میرے عفو سے بڑا ہو اور کوئی جہالت میرے علم سے زیادہ ہو۔ اس کے باوجود میں عیوب کی پردہ پوشی نہ کروں اور میری گرسنگی فقیر کو سیر نہ کر سکے۔[1]

کسرِ نفس، نجدت، علوہمت، شجاعت، ثبات، حلم، سکون، شہادت، تحمل، تواضع، حمیت، غیرت، ایسے الفاظ ہیں جن کے مفہومِ حقیقی، جن کے اصل معنی اور ترجمہ کو حضرت علیؑ نے دنیا کے لوگوں کو سکھلایا۔

دُنیا کے بہادر تہرمان، علیؑ کی قدرت، طاقت اور نیروئے جسمانی کے سامنے خاشع اور متواضع ہیں، اسلامی جنگوں میں علی علیہ السلام کی خدمات اسلام میں اُن کی زندگی کی برجستہ ترین سطور ہیں۔ یہ آسمانی شجاع اپنی مختصر اور بے آلائش زندگی، اپنی محدود اور نامطلوب خوراک کے باوجود ایسی قوتِ بازو رکھتے تھے کہ خیبر کے دروازہ کو جو اُس دور میں بزرگ ترین د

---

[1] تاریخِ بغداد ص ۲۱۸

خطرناک ترین دروازہ تھا اکھاڑا تھا اور خندق عبور کرنے کے لیے اسے پل بنایا اور جس وقت وہ کسی کے بازو کو پکڑ لیتے تھے اُس کی آنکھیں خون سے رنگین ہوجاتی تھیں

ایک شخص نے علی علیہ السلام سے پوچھا یا علیؑ اس جو کی خشک روٹی نمک یا دودھ یا خرما کی خوراک سے آپ میں یہ طاقت و توانائی کس طرح آگئی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ ندی کے کنارے سرسبز درخت جو نعمتِ آب سے ہر وقت بہرہ اندوز ہیں ہوا کے ایک تند جھونکے سے اکھڑ جاتے ہیں لیکن وہ درخت جو خشک کوہستان کی پتھریلی زمین میں اُگتا ہے اور آسمانی بارش کے ترشح کے سوائے اس کے پانی نہیں دیکھا سخت ترین اور مہیب ترین تند ہواؤں اور تیز جھکڑوں میں پائدار و برقرار ہے[1]

علی علیہ السلام کی شجاعت کا سرچشمہ ان کی قوتِ ایمان و عقیدہ تھی اگر اس شخصیت میں یہ طاقت نہ ہوتی تو وہ ہزارہا دشمنوں پر ایک ہی دفعہ حملہ نہ کر سکتے تھے وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے اور جنگ سے کبھی منہ نہ پھیرتے تھے۔ ہر جنگ میں سب سے پہلے مبارز طلب کرتے تھے کیونکہ انہیں اپنے نفس پر اعتماد تھا اور اللہ کے لیے تلوار چلاتے تھے۔

امیر شام معاویہ نے ایک خط میں حضرت علی علیہ السلام کو لکھا کہ میرا ایک لشکرِ جرار آمادۂ جنگ ہے وہ یہ سمجھتا تھا کہ لشکر کی زیادتی علیؑ کو ہراساں کردے گی۔ اس پر طراح نے معاویہ سے کہا کہ تیرا حضرت علیؑ کو کثرتِ لشکر سے ڈرانا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی مرغابی کو پانی کے کنارے سے ڈرائے۔ علی علیہ السلام شجاعت کے بہترین معلم معروف تھے۔ ۲۳ سال تک تلوار کھینچے ہوئے سایہ کی طرح رسول اللہؐ کے ساتھ رہے

---

[1] امیر المومنین عماد زادہ ص ۲۲۵

حضور علیہ السلام کے زمانے میں ۸۰ معرکوں میں برسرپیکار رہ کر عمرو ابن عبدود اور مرحب خیبری جیسے نامور جنگجوؤں کو تہ تیغ کیا۔ معرکہ صفین کے دن جو شخص بھی میدان میں جاتا تھا مارا جاتا تھا، اکابر عرب اپنے بیٹوں اور اپنے خاندان کے نوجوانوں کے ساتھ موت کے گھاٹ اتر گئے! اس وقت عمرو عاص نے معاویہ سے پوچھا یہ غالب جنگجو کون ہے جو ایسی شجاعت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ معاویہ نے کہا ہو سکتا ہے کہ علی ہوں عمرو عاص نے کہا مالک اشتر ہیں۔ شناخت کے لیے معاویہ نے حکم دیا کہ سارا لشکر حملہ کرے اگر میدان کو چھوڑ گیا تو مالک ہے ورنہ علیؑ ہیں۔ سارے لشکر نے مل کر حملہ کیا، لشکر درہم برہم ہوگیا مگر علیؑ لوہے کے پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ پھر ایک ہی دفعہ دشمن کی فوج پر ایسا حملہ کیا کہ دشمن کا ہجوم منتشر ہوگیا۔ اس وقت لوگ سمجھے کہ علیؑ جنگ کر رہے ہیں[1]

امیرالمومنین نے شجاعت کو سرحدِ کمال تک پہنچا دیا، اسلام کا نفوذ محض علی علیہ السلام کی شجاعت کے بل بوتے پر ہوا۔ انھوں نے عرب کے سرکشوں کو تہ خاک سلا دیا۔ انھوں نے مکار۔ مشرک درندوں کو چیر کر رکھ دیا[2] جب کبھی علی میدانِ جنگ میں آتے، دلیروں کے دلوں کو اختلاج کا دورہ پڑ جاتا، بہادروں کے قلب کانپنے لگتے اور نامور جنگجوؤں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ دشمن کی فوج کی نظروں میں موت مہیب و ہولناک صورت میں پھر جاتی، اس طرح علیؑ نے شجاعت کے نام کو بلند کیا اور رزم گاہ کے نشیب و فراز کا اپنی ذوالفقار سے جائزہ لیا اور اثنائے جنگ میں بلند ترین اخلاق فاضلہ کا مظاہرہ کیا۔[3]

---

[1] امیرالمومنین لعماد زادہ ص ۳۳۶، [2] امیرالمومنین ص ۳۳۶، [3] امیرالمومنین ص ۳۳۶

علامہ ابن ابی الحدید کہتے ہیں کہ علی علیہ السلام نے گذشتہ بہادروں کے نام کو محو کردیا اور مستقبل میں آنے والوں کے لیے کوئی مقام نہیں چھوڑا۔ علی علیہ السلام نے لڑائیوں میں اس قدر شجاعت، مہارتِ جنگ کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ ان کا گفتار و کردار تاریخ کا ضرب المثل ہو گیا۔ انھوں نے کبھی دشمن کے سامنے پیٹھ نہیں پھیری اور جنگ سے فرار اختیار نہیں کیا۔ وہ نامی جنگجوؤں اور مشہور دلاوروں سے کبھی نہ ڈرے نہ ہراساں ہوئے جو کوئی بھی ان سے دوچار ہوا۔ اسے موت کی نیند سلادیا۔ انھوں نے تلوار کی ایسی ضرب نہیں لگائی کہ دشمن کو ختم کرنے کے لیے دوسری ضرب کی ضرورت ہوئی ہو۔ اور یہ مشہور ضرب المثل ہے کہ علی علیہ السلام کی ضربیں طاق ہوتی تھیں[۱]

اگر ہم اُن کی اس شجاعت کو اُن کی خوراک، ان کے زہد، ان کے عمل اور ان کی ندامتی و فلاحتی جدوجہد سے وزن کریں تو اس سے اُن کی بے نظیر عظمت نمایاں ہو جاتی ہے۔

سفیان ثوری کہتے ہیں کہ علی علیہ السلام مسلمانوں میں ایک استوار پہاڑ اور مشرکوں کے لیے ایک زبردست حریف تھے۔ اللہ نے مسلمانوں کو علیؑ عطا کیا تھا اور مسلمانوں کو علیؑ کے ذریعہ عزیز و ارجمند کیا تھا اور مشرکوں کو علیؑ کے ذریعہ ذلیل و خوار کیا تھا۔[۲]

علیؑ مجاہدینِ اسلام کے سالار تھے وہ سخت اور دشوار ایام میں اُن کے نگہبان و پشت پناہ تھے۔ جب مشرک مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے علیؑ ہی اُن کو پریشان و منتشر کرتے تھے اور جہاں بھی لڑائی کی آگ مشتعل ہوتی تھی علیؑ ہی اسے اپنی تلوار کی آب سے بجھاتے تھے۔ علیؑ کا رجز و نعرۂ شجاعانہ فتح و

---

[۱] مناقب ابن شہر آشوب ج ۱ ص ۲۸۵ ، [۲] شرح نہج البلاغہ ج ۱ ص ۶

فیروزی کا نقارہ تھا۔ جب علیؑ ذوالفقار کے قبضہ پہ ہاتھ رکھتے تھے تو مسلمانوں کے دل سے اندوہ و رنج دُور ہو جاتا تھا۔ اس لیے آپ کا پُر افتخار لقب کاشف الکرب ہے یعنی غم و الم کو زائل کرنے والا۔

حضرت علی علیہ السلام کی رفیقۂ حیات و شریکۂ زیست حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا ان کی شجاعت و جلالت کے متعلق ارشاد فرماتی ہیں۔

اس کے بعد کہ سرکارِ رسالت محمدِ مصطفےٰ عرب بہادروں اور اہل کتاب سرکشوں کے مصائب جنگ و جدل میں مبتلا ہو گئے اور جس قدر بھی وہ جنگ کی آگ روشن کرتے تھے اللہ تو اسکو بجھا دیتا تھا۔ جہاں کہیں شیطان اپنا سینگ نکالتا تھا اور دشمنوں میں سے کوئی درندہ اسلام کو نگلنے کیلئے منہ کھولتا تھا سرورِ کائنات اپنے بھائی علیؑ کو اس درندہ کے منہ میں ڈال دیتے تھے اور علی علیہ السلام اس وقت تک واپس نہیں آتے تھے جب تک اس درندے کے سر کو اپنے قدموں تلے نہیں لے آتے تھے اور اُس کی مشتعل آگ کو اپنی تلوار سے بجھا نہیں دیتے تھے۔[1]

علی علیہ السلام جس طرح کسی جنگجو سے منہ نہیں پھیرتے تھے اسی طرح کسی بھاگتے والے کا تعاقب نہیں کرتے تھے اور کسی زخمی کو نہیں مارتے تھے،

اصحاب جناب امیر علیہ السلام میں کسی نے عرض کیا کہ آپ اپنے لیے اصیل و نجیب گھوڑا کیوں مہیا نہیں کرتے۔ فرمایا کہ میں کسی کے حملے سے منہ پھیر کر نہیں بھاگتا، اور کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہیں کرتا۔ پھر مجھے ایسے گھوڑے کی کیا ضرورت ہے،

کسی نے خلف بن احمد سے پوچھا کہ کیا مشاہیر عرب میں سے عنترہ اور بسطام بہادر تھے یا علی ابن ابی طالب، اس نے کہا تم ان مشاہیر کو اپنے جیسے انسانوں پہ

---

[1] امیر المومنین ص ۳۳۷

قیاس کرد۔ علیؑ ان سے مافوق و بالاتر تھے جس وقت علی علیہ السلام کی شہادت کی
خبر شام پہنچی عمرو عاص نے کہا وہ شیر جو عراق کے نیستان میں تھا دنیا سے رخصت
ہوا اس پر معاویہ نے کہا ؎

قل للارانب ترتع حیث ماملکت — وللظباء بلاخوف ولاحذر

خرگوشوں اور ہرنوں کو کہہ دو کہ اب بے خوف ہوکر جدھر چاہو کھاؤ پیو اور چرو۔ جاحظ
اموی مخالفِ علیؑ ہونے کے باوجود علیؑ کی فضیلت شجاعت کے متعلق کہتا ہے کہ
اگر جنگ احد میں علیؑ نہ ہوتے تو مسلمان ختم ہو جاتے یہ علیؑ تھے جو صرف سات آدمیوں
کو ہمراہ لے کر سرورِ کائنات کے روبرو اس طرح نبرد آزما ہوئے کہ مشرکوں کو خاک میں ملا
دیا اور وہ منتشر ہو گئے[1]

سخاوت و بخشش

ذرائع آمدنی

سخاوت کا اتم و اکمل مصداق وجود ذیجود سرورِ اولیاء
علی ابن طالب تھے۔ ظاہر و پوشیدہ، سفر و حضر، نماز و
جنگ و صلح میں ان کی بخشش کا ابر موسلادھار برستا تھا، دنیا کا مال و منال، زر و
سیم علیؑ کی نظر میں بکری کی مینگنیوں سے بھی کم قیمت تھا۔ علیؑ آغازِ جوانی میں مردِ
بے بضاعت تھے۔ چونکہ باپ جو بین الاقوامی تاجر تھے ملکِ خارجہ میں درآمد و برآمد
کا کاروبار کرتے ان کی تمام دولت اغراض و مقاصد اسلام پر صرف ہو چکی تھی حتیٰ کہ عقدِ
سیدہ کے وقت اپنی سپر فروخت کرکے ولیمہ کی دعوت کی تھی مگر اس زمانہ میں بھی

---

[1] امیر المومنین ص ۲۳

سخاوت و بخشش سے دریغ نہ تھا۔ ہجرت کے بعد علی علیہ السلام مدینہ میں جنگ و جہاد اور تعلیم و تربیتِ اسلام سے جب فارغ ہوتے۔ قنوات کے کھودتے، کھجور کے درخت لگانے اور غیر آباد اور بنجر زمینوں کو آباد کرنے میں مصروف رہتے تھے اس وقت اپنے قوتِ بازو کی کمائی کو زیادہ بخشش و سخاوت سے صرف فرماتے انہوں نے بنجر زمینوں کو اپنی محنت و مشقت سے آباد کیا تھا۔ یہاں تک کوفہ میں اس آباد کردہ زرعی اراضی کی سالانہ آمدنی چالیس ہزار دینار تھی وہ اس ساری آمدنی کو فقراء، یتامیٰ، مساکین، بیوہ عورتوں اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام بنفس نفیس زمین میں ہل چلاتے تھے۔ بیج بوتے، آبیاری فرماتے تھے۔ آپ درختوں کی نرسری کا کام بھی کرتے تھے۔ زراعت و فلاحت میں خاص شغف تھا۔ نرسری کے پودوں کو کاندھے پر اٹھا کر شہر بھی لاتے اور وہاں سے نخلستانوں میں لے جاتے، آپ اپنی نرسری کے پودوں کو پانی دے کر ان کی پوری نگرانی کرتے تھے۔ مدینہ طیبہ میں رسولِ اکرمؐ نے مالِ غنیمت کی زرعی زمینوں کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ جو زرعی زمین حضرت علی کے حصہ میں آئی اسے آپ نے محنت و مشقت سے آباد کیا۔ اس میں ایک ایسی قنات احداث فرمائی جس سے پانی اونٹ کی گردن کی مانند پھوٹ کر نکلتا تھا۔ لوگ اسے منبعِ چشمہ کہتے تھے۔ اس کے زیرِ کاشت جو زمین تھی وہ زرخیز و حاصل خیز تھی۔ آپ اس کی آمدنی کو فقراء و مساکین، یتامیٰ و غرباء پر صرف فرماتے تھے۔[۱]

سیدہ طاہرہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے عقد کے بعد حضرت علیؑ کی آمدنی اس قدر

---

[۱] وسائل الشیعہ جلد ۲ ص ۱۰۹

بڑھ گئی تھی کہ آپ فرمایا کرتے کہ جب میرا عقد سیدہ طاہرہ سے ہوا تو گھر میں بستر بھی نہیں تھا۔ اب ان کے قدم میمنت لزوم کی برکت سے میں نے بنجر زمینوں کو اس قدر مزروعہ کر لیا ہے اور اس قدر نخلستان بنا لیے ہیں کہ اگر علیؑ کے صدقات کو تمام بنی ہاشم میں تقسیم کر دیا جائے تو وہ ان کی معیشت کے کفیل ہو سکتے ہیں[1]

سنت وقف املاک

امام علیہ السلام نے ۲۰ جمادی الاولیٰ ۳۷ھ میں اپنی تمام املاک کو وقفِ عام قرار دیا تھا اور ان املاک کو صدقۂ جاریہ قرار دیا تھا۔ آپ اس وقف نامہ کو اپنے دستِ مبارک میں لیے ہوئے اعلانِ وقف فرما رہے تھے[2]

امیر المومنین علیہ السلام کے صدقات کی رقم سالانہ جیسا کہ مناقب شہر آشوب و کتاب بلاذری میں ہے چالیس ہزار دینار تھی۔ اس قدر بڑی رقم کو اللہ کی راہ میں صرف کر کے حالت یہ تھی کہ ایک رات گھر میں شام کے کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اپنی تلوار بیچ دی اور فرمایا کہ اگر رات کے کھانے جتنی رقم میرے پاس ہوتی تو میں اس تلوار کو نہ بیچتا۔

ایک روز ایک سائل آیا۔ اس نے اپنی حاجت بیان کی آپ نے اپنے وکیل سے فرمایا اسے ایک ہزار دینار دے دو۔ وکیل نے پوچھا۔ سونے کے سکوں میں ادا کروں یا چاندی کے سکوں میں، فرمایا جو صورت بھی اسکے لیے نفع بخش ہو وہی اختیار کرو۔

معاویہ کا خراج تحسین

امیر معاویہ علی علیہ السلام سے عداوت کے باوجود حضرت علی علیہ السلام کی بخشش و سخاوت

---

[1] الکشف الحجہ ص ۱۳۲ ۔ [2] اس وقف نامہ کی نقل ثقۃ الاسلام محمد یعقوب کلینی کی کتاب کافی میں موجود ہے۔ امیر المومنین ص ۳۴۰

کی تعریف کیا کرتا تھا، دُنیا طلب خوشامدی لوگوں میں سے ایک شخص محفن بن ابی محفن جنبی معاویہ کے پاس آیا اور کہا کہ میں بخیل ترین آدمی کے پاس سے تمہارے پاس آیا ہوں، معاویہ نے کہا افسوس ارے کیا علیؑ بخیل ترین آدمی ہیں؟ تم علیؑ کو بخیل کیوں کہتے ہو اگر علیؑ کے پاس ایک گھر سونے سے بھرا ہوا ہو اور ایک خشک گھاس سے تو وہ خانۂ طلا کو پہلے بخش دیگا اور بعد میں خانۂ کاہ کو بخشے گا۔[1]

محدث شعبی محدث شعبی کہا کرتے تھے علیؑ سخت ترین مردم تھے جوانمردی اور داد و دہش میں ایسی بلند شخصیت رکھتے تھے کہ خالق و خلق ان سے محبت کرتے تھے، یہ رہنمائے حق ایسے آدمی تھے کہ وہ سائل کی حاجت کو رد نہیں کرتے تھے اور کوئی اُن کے گھر سے محروم نہیں لوٹتا تھا۔[2]

حضرت علیؑ اس قدر سخی الطبع اور فیاض تھے کہ سفر و حضر میں، نماز اور روزہ میں، حرکت و سکون میں ہر جگہ اُن کا دریائے سخاوت موجزن تھا اور فرمایا کرتے تھے کہ محتاجوں کو اپنی حاجت مجھے لکھکر دینا چاہیئے تاکہ اُن کے رخساروں سے ذلت کے نشانات ظاہر نہ ہوں۔[3]

ایثار و مواسات

شعارِ آلِ محمدؐ احادیث میں وارد ہوا ہے کہ جناب امیرالمومنین علیہ السلام ایک جماعت کے پاس سے گزرے۔ فرمایا کہو کیسے زندگی بسر کر رہے ہو۔ انھوں نے عرض کیا۔ ہمارا شیوہ توکل ہے، فرمایا تم توکل کے

---

[1] شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۔ [2] امیرالمومنین ص ۳۲۹ ، [3] امیرالمومنین ص ۳۳۱

کس درجہ میں ہو، انہوں نے عرض کیا۔

"اذا وجدنا اکلنا واذا فقدنا صبرنا"

"جب ہمیں مل جائے ہم کھا لیتے ہیں اور جب نہ ملے تو صبر کرتے ہیں"

فرمایا یہ تو کتوں کی سیرت ہے کہ جب مل گیا تو کھا لیتے ہیں اور جب نہ ملے تو صبر کرتے ہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ پھر آلِ محمدؐ کا شعار کیا ہے فرمایا۔

"اذا وجدنا اثرنا واذا فقدنا شکرنا"

"جب ہمیں مل جائے تو ایثار کرتے ہیں جب نہ ملے تو شکر کرتے ہیں"

سورۃ ھل اتیٰ ایثار و مواساتِ امیر المومنین علیہ السلام اور ان کے افرادِ خانہ کا قصیدہ مدحیہ ہے۔ خاندانِ رسالت نے تین روزے رکھے۔ جنابِ امیرؑ، حسنینؑ سیدہ طاہرہؑ اور حضرت فضہ سب روزے سے تھے۔ جنابِ امیر علیہ السلام نے یہودی کے باغ میں کام کیا، سیدہؑ نے اُجرت پر اُون کاتی، شام کے وقت جو جَو اُجرت میں ملے سیدہؑ نے پیسا اور روٹیاں پکا کر افطار کے وقت دسترخوان پر چُن دیں باہر سے مسکین کی آواز آئی۔ خاندانِ رسالت نے ایثار کیا اور اپنے حصہ کا کھانا اُٹھا کر مسکین کو دے دیا، دوسرے دن بغیر کچھ کھائے روزہ رکھا، حسبِ معمول یہ دن بھی گذر گیا اور دوسرے دن افطار کے لیے کھانا دسترخوان پر چُنا گیا، دو دن کے گرسنہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا رہے تھے کہ باہر سے آواز آئی "میں ایک یتیم ہوں مجھے کھانا کھلائیے"۔ اس پُر درد آواز پر خاندانِ رسالت نے ایثار فرمایا اور اپنا اپنا کھانا اُٹھا کر یتیم کو دے دیا، ان سب نے آج پھر پانی سے روزہ افطار کیا اور بغیر کچھ کھائے تیسرا روزہ رکھا۔ تیسرے روز بھی جب دسترخوان پر کھانا چنا گیا تو دروازہ پر ایک اسیر

آ کھڑا ہوا۔ آواز دی میں قیدیوں میں سے ایک قیدی ہوں۔ مجھے کھانا کھلاؤ۔ یہ سن کر خاندانِ رسالت نے تین دن تک فاقوں کے باوجود اپنا اپنا کھانا اٹھا کر اس قیدی کو دے دیا۔ قرآنِ مجید نے اس ایثار کی واقعہ نگاری ان الفاظ میں فرمائی۔

"ویطعمون الطعام علیٰ حبّہ مسکیناً ویتیماً واسیراً"

"وہ اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔"

اور اپنے اخلاص کا ان الفاظ میں اعلان کرتے ہیں۔

انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاءً ولا شکوراً۔

"ہم تم کو محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کھلاتے ہیں۔ نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ ہی کوئی شکریہ چاہتے ہیں۔"

زبانِ احدیت نے اس سراپا خلوصِ عمل کو سراہا اور فرمایا کہ تم مخلوقِ خدا سے طالبِ جزا نہیں ہو تو تمہاری جزا ہمارے ذمہ ہے۔ سنو۔

"وجزاھم بما صبروا جنۃً وحریراً"

"جس چیز سے انہوں نے صبر کیا اس کا بدلہ جنت ہے اور ریشمی لباس"

یہودی کے باغ میں کام کرنے والے کیلئے باغِ جنت اور اُون کاتنے والی کے لیے ریشمی لباس۔ یہ ہے جزا اور باقی رہا شکر:۔

انّ ھٰذا کان لکم جزاءً وکان سعیکم مشکوراً۔

"یہ ہے تمہارے لیے جزا، اور تحقیق تمہاری یہ کوشش اللہ کے نزدیک مقبول و مشکور ہے۔"

سورہ ہل اتیٰ "ہل اتیٰ" کے شاہی خاندان کا قصیدۂ مدحیہ ہے۔ شاعرِ قصیدہ گو

ان کا اپنا معبود ہے۔ اس قصیدہ کا آخری بند ہے۔

"وما تشاؤن الا ما یشاء اللہ"

"اے سراپا ایثار ہل اتیٰ کے شاہی خاندان! تم کچھ نہیں چاہتے مگر وہی چاہتے ہو جو اللہ چاہتا ہے"

یہ ہے عصمت خاندان رسالت کی روشن دلیل۔ جو کچھ نہ چاہے مگر وہی چاہے جو اللہ چاہے۔ اس کے افعال پر اعتراض کرنے والوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اس خلیفہ رسول کے افعال پر اعتراض نہیں کر رہے بلکہ اللہ پر اعتراض کر رہے ہیں۔

علم و فضل حضرت علیؑ آسمان علم و فضل کے خورشید نصف النہار تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ آپ عمر بھر اس عرشِ کمالات انسانی کے فرش نشین رہے جس کا ذرہ ذرہ صد آفتاب درِ آغوش تھا درس گاہِ نبوت کے بحرِ بے پایاں میں غوطہ زن ہو کر آپ نے کائنات پیما فکر و نظر کے ایسے ایسے لدنی آبدار سے دامن بھرا جن کی چکا چوند پیدا کرنے والی تیز روشنی سے متاثر ہو کر حضرت عبداللہ بن عباس جیسے حکیم امت بے ساختہ یوں لب کشا ہوئے کہ "علام الغیوب نے علیؑ کو علم کے دس حصوں میں سے نو حصہ عطا فرمائے تھے اور دسویں میں بھی آپ شریک تھے" جامع نبوت سے آپ کو "انا مدینۃ العلم وعلیٌ بابہا" کا خطاب ملا۔ قرآن کریم کے بہت بڑے حافظ اور اس کے بہت بڑے عالم تھے۔ خود فرمایا کرتے تھے مجھے قرآن کریم کی ہر آیت کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں اور کس کے متعلق اور کس باب میں نازل ہوئی۔ قرآن مجید کے سمجھنے اور اس سے احکام و مسائل کے اخذ کی غیر معمولی قابلیت آپ کی فطرت میں ودیعت کی گئی تھی، وصال نبوی کے بعد انہوں

نے آیتوں اور سورتوں کی ترتیب نزول پر قرآن عزیز کا ایک نسخہ مرتب کیا تھا[1]

روحانی حلیہ

امیر معاویہ نے ضرار ابن ضمرہ صدائی سے کہا " اے ضرار مجھ سے علی علیہ السلام کے اوصاف بیان کرو۔ ضرار نے کہا۔ اے امیر! مجھے اس سے معاف رکھو' معاویہ نے کہا تجھے ضرور اُن کے اوصاف بیان کرنا ہوں گے۔ ضرار نے کہا جبکہ مجھے اُن کے اوصاف بیان کرنے پر مجبور ہی کیا جاتا ہے تو واللہ! وہ دور کے کام والے! اور بڑی قوتوں والے تھے' بزرگی سے بات کرتے تھے اور عدل سے حکم دیتے تھے، علم کا دریا ان کے دل میں موجزن تھا' حکمت ان کی زبان سے بولتی تھی' وہ دنیا اور دنیا کی خوبیوں سے گریز کرتے تھے' وہ اندھیری رات اور اس کی وحشت سے مانوس تھے' وہ رونے کو پسند کرتے تھے اور دور و دراز فکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان کو کپڑا چھوٹا اچھا معلوم ہوتا تھا اور ان کو کھانے میں کرخت چیز بھلی معلوم ہوتی تھی' وہ ہم میں ہمارے جیسے تھے۔ وہ ہم کو جواب دیتے تھے جب کہ ہم اُن سے پوچھتے تھے' وہ ہمارے پاس آتے تھے جب کہ ہم بلاتے تھے۔ خدا کی قسم باوجود اُن کے قرب کے ہیبت کی وجہ سے ہم اُن سے کلام نہیں کر سکتے تھے وہ اہلِ دین کی تعظیم کرتے تھے مسکینوں کو اپنے پاس بٹھاتے تھے' اُن کے خوف سے کوئی زبردست اپنی بیہودگی کی خواہش دل میں نہیں لا سکتا تھا' ضعیف اُن کے عدل سے ناامیدی کا منہ نہیں دیکھتا تھا' میں نے اُن کو بعض مقامات پر دیکھا جب کہ رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ستارے سیاہی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ اپنی ریش مبارک کو

---

[1] تاریخ اسلام نشتر جالندھری ص ۲۵۷

پکڑے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے اور نرم آواز سے رو رہے تھے اور فرماتے تھے اے دُنیا میرے سوا کسی اور کو فریب دے، میرے سامنے کیوں آئی ہے یا مجھ سے شوق رکھتی ہے۔ افسوس افسوس میں نے تجھے تین طلاقیں دی ہیں جن میں ہرگز رجعت کی گنجائش نہیں، تیری عمر بہت تھوڑی ہے اور تیرے دُکھ بہت بڑے ہیں۔ آہ! آہ! تھوڑا زاد ہے اور دُور کا سفر ہے، امیر معویہ یہ سن کر رونے لگے۔ اور کہنے لگے خدا ابوالحسن پر رحم کرے واللہ وہ ایسے ہی تھے۔ اے ضرار! اُن کے مرنے سے تجھے کیسا رنج ہوا ہے۔ ضرار کہنے لگے، ایسا رنج ہے کہ جس طرح سے کسی عورت کی گود میں اس کا بیٹا ذبح کیا جائے۔[1]

جناب امیرؑ کے صدقات جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر تو مجھے جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ دیکھتا کہ میں نے پتھر اپنے شکم پر بھوک کی وجہ سے باندھا ہوا تھا حالانکہ اس دن میری زکوٰۃ چالیس ہزار تھی اور ایک روایت میں ہے کہ میرے مال کی زکوٰۃ چالیس ہزار دینار تک پہنچ گئی تھی۔[2]

جناب امیرؑ کی مہمان نوازی ایک روز جناب امیر علیہ السلام رونے لگے۔ لوگوں نے رونے کا سبب پوچھا۔ آپ نے فرمایا۔ سات روز ہو گئے ہیں کہ کوئی مہمان میرے پاس نہیں آیا۔ مجھے خوف ہے کہ خدا نے مجھے حقیر نہ کر دیا ہو۔[3]

تفقد حال رعایا ۔ عامر شعبی ناقل ہیں کہ سودہ بنت عمارہ بن الاشتر الھمدانیہ

---

[1] استیعاب، کنز العمال، صواعق محرقہ، ارجح المطالب ص۹۹، ۱۰۰، [2] ارجح المطالب ص۱۷۸، [3] اسنیٰ المطالب فی صلۃ الاقارب لابن حجر مکی، ارجح المطالب ص۱۷۰

ایک دفعہ بطریق سفارت معاویہ بن ابی سفیان کے دربار میں حاضر ہوئیں اور اذن مانگا، معاویہ نے اپنے سامنے بلالیا۔ جب وہ سامنے گئیں۔ معاویہ نے ان سے کہا اے اشتر کی بیٹی تیرا کیا حال ہے۔ سودہ نے کہا اچھا حال ہے، معاویہ نے کہا تو نے ہی صفین کے روز اپنے بھائی کے واسطے یہ اشعار کہے تھے۔

"اے ابن عمارہ! نیزہ مارنے اور بہادروں کے ملنے کے روز تو بھی اپنے باپ کی مانند دامن اٹھالے اور علیؑ اور حسینؑ اور ان کے گروہ کی امداد کر اور ہند اور اس کے بیٹے کو خوار کر کیونکہ علیؑ نبی علیہ السلام کا بھائی ہے اِلٰم ہے اور وہ ہدایت کا علم ہے اور ایمان کا نشان ہے۔"

سودہ نے جواب دیا۔ "اے امیر سر کٹ گیا' دم اکھڑ گئے جو بات بھول گئی اس کا ذکر چھوڑ۔ معاویہ کہنے لگا افسوس ہے تیرے بھائی کا وہ مرتبہ نہیں تھا کہ اس کا ذکر بھول جائے۔ سودہ نے کہا آپ نے سچ کہا ہے لیکن جو کچھ کہ مجھ سے ہو چکا ہے خدا کے لیے آپ معاف فرمائیں۔ معاویہ نے کہا میں نے معاف کیا تو اپنی حاجت بیان کر۔ سودہ نے کہا۔ اے امیر اب آپ لوگوں کے سردار رہ گئے ہیں اور اُن کے تمام امور آپ کے گلے پڑے ہیں۔ خدا نے جو امر تم پر ہمارے حقوق سے فرض کیا ہے ضرور اس کی نسبت تم سے پوچھنے والا ہے آپ ہمیشہ ہم پر اپنا عامل بھیجتے ہیں جو آپ کی عزت کی وجہ سے ہم پر حکومت کرتا ہے اور ہم کو کھیتی کی طرح سے کاٹتا ہے اور گائے کی طرح دوہتا ہے۔ ابن ارطاۃ ہمارے شہر پر حاکم بنا کر بھیجا گیا۔ جس نے ہمارے مردوں کو مار ڈالا اور ہمارا مال چھین لیا' اگر اطاعت ہمیں مانع نہ ہوتی تو ہم بھی عزت رکھتے تھے

اور دفع کر سکتے تھے، اگر تو نے اس کو معزول کر دیا تو ہم تیرا شکریہ ادا کریں گے ورنہ ہم جان جائیں گے، معاویہ کہنے لگا کیا تو مجھے اپنی قوم سے ڈراتی ہے واللہ میں چاہتا ہوں کہ تجھے اسی کے پاس بھیج دوں تاکہ وہ اپنا حکم تجھ پر جاری کرے۔ سودہ نے خاموش ہو کر اشعار پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے۔

"خدا کی رحمت ہو اُس روح پر کہ اُس کو قبر نے بغلگیر کر لیا ہے کہ وہ عدل کرتا ہُوا اس میں دفن ہُوا"۔

معاویہ کہنے لگا یہ کون شخص ہے۔ سودہ نے کہا حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام۔ معاویہ نے کہا میں اس کی مہربانی کا کوئی اثر تجھ پر نہیں پاتا، سودہ بولی، ایک روز میں اُن کی خدمت میں ایک شخص کی نسبت شکایت لے کر گئی جس کو انہوں نے ہم سے زکوٰۃ حاصل کرنے کیلئے ہم پر عامل مقرر کیا تھا، میں نے ان کو نماز پڑھتے ہوئے پایا، نماز سے منہ پھیر کر نہایت نرمی اور مہربانی سے مجھے ارشاد فرمایا کیا تجھے کوئی ضرورت ہے۔ میں نے اس شخص کا پورا حال عرض کیا۔ آپ سُن کر رونے لگے، پھر آسمان کی طرف منہ پھیر کر کہنے لگے۔

"اے پروردگار تو جانتا ہے کہ میں نے اپنے عاملوں کو تیری خلقت پر ظلم کرنے کا حکم نہیں دیا اور تیرا حق چھوڑ دینے کو نہیں کہا"

پھر اپنی جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر اس پر لکھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

"بیشک تمہارے رب سے تمہارے پاس کھُلا نشان آیا ہے۔ پس تم پیمانے اور ترازو کو پورا کرو۔ پس زمین میں اس کے سنور

جانے کے بعد خرابی مت ڈالو اگر تم مومن ہو الخ۔ جب میرا خط
تجھے ملے تو جو کچھ کہ تیرے پاس ہو اس پر خوب نگاہ رکھو۔ جب تک
اُس کا لینے والا تیرے پاس پہنچ جاوے۔ والسلام

پھر جناب امیر علیہ السلام نے اُس کو معزول کر دیا" معاویہ اپنے کلرکوں سے
کہنے لگا "تم بھی اُس عورت کے لیے عدل اور انصاف کرنے کی نسبت لکھ دو"
سودہ کہنے لگیں خاص میرے لیے یا کہ میری تمام قوم کیلئے۔ معاویہ نے کہا تمہیں
دوسروں سے کیا سروکار۔ سودہ کہنے لگیں کہ یہ امر تو نہایت ملامت لیے ہوئے
ہے۔ اگر عدل شاملِ حال ہے تو بہتر ورنہ جو میری قوم کا حال ہوگا وہی میرا ہوگا"
معاویہ کہنے لگا۔ علی ابن ابی طالبؑ نے تم لوگوں کو بادشاہوں کے سامنے
گستاخی کرنے کی جرأت دلا دی ہے[۱]

قیدیوں سے مراعات

جناب امیرؑ کے جیل خانے کی کنجیاں تھیں جن سے
نماز کے وقت وہ قید خانے کھولے جاتے تھے
اور جناب امیر بیت المال سے ان کو خوراک عطا فرماتے اور فرمایا کرتے تھے
ہمارا کام اُن کو قید رکھنا ہے اور اُن کا کام بھاگنا ہے[۲]

پرہیزگاری

پرہیزگاری آپ کے آئینہ کردار کا روشن ترین جوہر تھا۔ زندگی
کا ہر لمحہ زہد و تقویٰ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آپ کا یہ مقولہ زبان
زدِ خلائق ہے کہ دُنیا مردار ہے جو اِسے حاصل کرنا چاہے اُسے کتوں

---

[۱] عقد الفرید، ارجح المطالب ص ۱۵۵، [۲] مناقب الاصحاب نجم الدین
فخر الاسلام ابوبکر بن محمد بن الحسین السیلانی المرندی۔

کی صحبت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ آپ کی زندگی مختلف دوروں میں گذری، مفلسی اور امیری دونوں چیزوں سے ذوق آشنا ہوئی، لیکن زہد کا دامن کسی حال میں بھی ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ ایک دفعہ امیری کی لہر بہر میں آمدنی اس قدر بڑھ گئی کہ چالیس ہزار سالانہ زکواۃ ادا کرنی پڑتی۔ لیکن فاقوں کی چاشنی نے اس حال میں بھی پیچھا نہ چھوڑا ساری عمر معمولی سے مکان میں گذار دی، گھر میں کوئی قابلِ ذکر اثاثہ نہ تھا، ایک مینڈھے کی کھال سے فرشِ خواب کا کام لیا جاتا تھا، اوڑھنے کی چھوٹی سی چادر سر اور پاؤں کے ڈھانکنے کو بھی کافی نہ تھی۔ گھر کا کام کاج کرنے کے لیے کوئی خادم نہ تھا۔ آپ کی زوجہ محترمہ فاطمہ زہراؓ سارا کام خود کرتی تھیں، چکی پیستے پیستے ہاتھوں پر نشان پڑ گئے تھے۔ کبھی کبھی متواتر فاقے گذر جاتے تھے۔ ایک دفعہ اسی حالت میں مزدوری کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور کسی بڑھیا کے کھیت کو پانی دے کر کچھ کھجوریں حاصل کیں۔ ایک دفعہ گھر میں صرف خدا کا نام تھا اس لیے اپنی تلوار فروخت کر کے فاقہ شکنی کی[1]

---

[1] تاریخِ اسلام نشتر جالندھری

نظامِ حکومت

نظامِ سلطنت کی اصلاح

حضرت علیؑ کو عنانِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی جن اہم پیچیدہ، ناگوار اور مخالفانہ حالات سے دوچار ہونا پڑا اُن سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا آپ ہی کا حصّہ ہے۔ اس ہنگامہ خیز زمانے میں کبھی آپ کو آشوبِ بغاوت کے استیصال میں مصروف ہونا پڑتا تھا اور کبھی ملک گیری پر توجہ کرنا پڑتی تھی لیکن حق یہ ہے کہ آپ کا عظیم ترین زریں کارنامہ نظامِ خلافت کی اصلاح ہے۔[1]

جنابِ امیر علیہ السلام نے اصلاحِ مملکت کے دو طریقے اختیار فرمائے (۱) موجودہ خلفشار کی حالتوں میں رعایا کی پوری محافظت اور خبر گیری اور اُن کے حقوق کی رعایت اور اُن کی کافی دلجوئی اور تسکین تھی، دوسرا طریقہ اس اصلاح کا ان بڑے بڑے سرکش مخالفوں کا مقابلہ تھا جو عام طور سے ملک میں فساد قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ مغربی مورخوں نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ جنابِ امیرؑ کے زمانے میں خانہ جنگی کے باوجود اناج اور ضروریاتِ زندگی کی قلت نہیں ہوئی اور گرانی رونما نہیں ہوئی، چور بازاری اور سمگلنگ نہیں ہوئی۔

عدلیہ اور انتظامیہ

عدلیہ کا انتظامیہ کے اثرات اور غلبہ سے آزاد ہونا عدل و انصاف کا تقاضا ہے اور نظامِ حکومت کے بہترین ہونے کا ثبوت ہے۔ جنابِ امیرؑ کے زمانے میں عدلیہ انتظامیہ کے غلبہ

---

[1] تاریخ اسلام نشتر جالندھری صہ ۲۵۲

سے بالکل آزاد تھی - چنانچہ مصر کے مشہور عیسائی مورخ علامہ جرجی زیدان نے لکھا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام کے واقعات میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کے ظاہری خلافت کے زمانے میں آپ نے اپنی زرہ کسی کے پاس دیکھی تو اس کو اس سے نہیں لیا بلکہ آپ اور وہ شخص قاضی شریح کے پاس اس کا فیصلہ کرانے کیلئے گئے اور وہاں صرف آپ اصول انصاف کی پابندی اور مساوات کو ملحوظ رکھنے کے لیے اس عدالت میں اس شخص کے مقابل کھڑے رہے اور بہ حیثیت خلیفہ بیٹھنے کی خواہش نہیں کی، حالانکہ عصرِ حاضر میں جو تہذیب وتمدن کی ترقی کا زمانہ کہلاتا ہے۔ اگر کوئی معزز شخص عدالت میں جاتا ہے تو اُسے کرسی ملتی ہے جس پر وہ بیٹھتا ہے مگر حضرت علیؑ وہاں بیٹھے نہیں اور اس طرح اپنے ہر فعل سے عدل ومساوات کی تعلیم دیتے رہے۔ اِس مقدمہ میں قاضی نے اس شخص سے ثبوت طلب کیا، اس نے کہا زرہ میرے قبضہ میں ہے اور قبضہ ملکیت کی دلیل ہے۔ قاضی نے جنابِ امیرؑ سے ثبوت میں گواہیاں طلب کیں۔ آپ نے فرمایا اس کے متعلق میرے پاس کوئی گواہ موجود نہیں۔ قاضی شریح نے حضرت علی علیہ السلام کے خلاف اُس شخص کے حق میں فیصلہ کر دیا، حضرت علی علیہ السلام فیصلہ سُن کر خاموشی سے باہر تشریف لائے۔ اُن کا فریقِ مخالف نصرانی تھا مگر انتظامیہ کے رئیس اعلیٰ کے اس انصاف ومساوات کو دیکھکر مسلمان ہوگیا۔ زرہ حضرت کے حوالے کی اور معافی کا طلبگار ہوا۔

جناب امیر علیہ السلام نے اسی سلطنت کے زمانے میں ملکی رعایا کو دو بڑے حصوں میں تقسیم فرمایا تھا۔ (۱) پہلا حصہ سرکاری ملازم تھے جن میں فوج، کلرک

قاضی اور عمال شامل تھے۔ دوسرا حصہ ایسی رعایا تھی جو حکومت کی ملازم نہیں تھی اور
ان میں اہلِ اسلام، اہل جزیہ، اہل صنعت، تجار، فقراء اور محتاج لوگ شامل تھے۔

امیرالمومنینؑ نے اُن میں سے ہر فرقے کی بابت اُن کے حقوق و فرائض اور
ان سے سلوک کرنے کے طریقے نہایت توضیح سے علیحدہ علیحدہ بیان فرما دیئے ہیں
اور اُن کے ساتھ ہمیشہ دلجوئی سے پیش آنے اور پیش آنے کا حکم دیا۔ عمال خلافت کو
سخت تاکید فرمائی۔ ملکی رعایا کے متعلق ارشاد فرمایا۔ " ملکی رعایا مختلف قسم کی ہوتی ہے
ایک کی اصلاح دوسرے کی اصلاح سے متعلق ہے اور ایک کو دوسرے کی احتیاج ہے
ان ہی میں (۱) فوج (۲) دفتر کے عمال جو سلطنت کی طرف سے حاکم ہوتے ہیں (۳)
قاضی (Judge) (۴) جو رقم جزیہ ادا کر کے اسلامی سلطنت کی حفاظت میں آتے
ہیں (۵) تجار۔ تجارت پیشہ (۶) اہلِ صنعت ملک کے دستکار (۷) فقراء اور محتاج جو
دوسروں کی مدد پر زندگی گذارتے ہیں۔ اس سے رعایا کے اقسام معلوم ہو گئے خلافت
جناب امیرؑ کو ہزار سے زیادہ برس ہو چکے ہیں۔ ان اقسام کے علاوہ رعایا کی اور کوئی
قسم متعین نہیں ہوئی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کی تقسیم کس قدر کامل تھی۔

لشکر کے حقوق

لشکر رعایا کے قلعے ہیں۔ رعایا ان ہی کی حفاظت میں رہتی
ہے۔ یہ حکمرانوں کی زیب و زینت ہیں، دین کی عزت ہیں
ملت کے پاسبان ہیں، امن و امان کے ذمہ دار ہیں، رعایا بغیر فوج کے سلامت
نہیں رہ سکتی، اے حکمرانو! فوج کے ساتھ تم ایسا سلوک کرو جیسا تم اپنے بچوں
کے ساتھ کرتے ہو۔ ان کو ہمیشہ خوش رکھو۔ ایسی روش اختیار کرو کہ ان کی قوت
اور ہمت میں اضافہ ہوتا رہے۔

اہلِ دفتر کے حقوق

دفتر کے لوگوں کے احوال پر ہمیشہ نظر رکھنی چاہیئے جو اُن میں صفت ہو اُسے اختیار کرو۔

قاضی اور اسکی تعریف

جنابِ امیرؑ نے فرمایا کہ سلطنتِ اسلامی کے تمام انتظامی افسروں میں جیساکہ اس منصب اور صیغہ کا حاکم ہو جواب دہ ہے اور ذمہ دار ہے اتنا کسی دوسرے صیغہ اور محکمہ کا نہیں۔

قاضی کی خدمات اور اسکا اعتراف

قضا کا عہدہ رعایا میں سے اس شخص کے سپرد کرو جو اُن میں سب سے افضل ہو اور معاملات کی یورش سے نہ گھبراتا ہو اور لوگوں کی کثرت سے پریشان نہ ہوتا ہو فضول ضد نہ کرے۔ جب اصلیت ظاہر ہو جائے تو اُس کے تسلیم کرنے میں توقف نہ کرتا ہو، طمع کا اس کے نفس میں گزر نہ ہو۔ جب تک معاملہ کی تہ تک نہ پہنچے اپنے فہم و فراست پر اعتبار نہ کرے۔ شک و شبہ کے اوقات میں معمول سے زیادہ غور و فکر کرے۔ ترش رو نہ ہو اور ہر معاملے کا سراغ نکالنے میں نہایت استقلال سے کام لے، بے غرض فیصلہ کرے، بڑی سے بڑی سفارش پر بھی حق کو فراموش نہ کرے لیکن ایسے لوگ جن میں یہ سب صفات موجود ہوں بہت کم ہاتھ آتے ہیں لہذا اس مقام کے گورنر یا عامل کا فرض ہے کہ ان معاملات کی جو دارالقضا میں پیش ہوں پوری دیکھ بھال کرے۔ بیت المال سے قاضی کو اتنا روپیہ ملے کہ اس کو رشوت کی ضرورت نہ رہے۔ دربارِ حکومت میں اسے صدر کی جگہ دی جائے تاکہ ارکینِ سلطنت میں اُس کا احترام ہو، لوگ اُسے بُرا نہ کہیں، تاکہ اُس کے امور درہم برہم نہ ہوں۔ قبل اس کے کہ ذلیل اور سبک ہو اندیشوں سے محفوظ ہو جائے۔

عمّالِ مُلکی

حکمِ قضا کے بعد اس طبقہ کے جلیل القدر اور عظیم الشان عہدہ داروں کا اس طرح ذکر فرمایا ہے جو باعتبار اپنے اعلٰے مناصب کے خلافت کی طرف سے ممالک بیرونی میں نیابت کے فرائض ادا کرتے ہیں۔ ان کی ذمہ داریاں، فرائض اور خدمات اور اخلاق کے متعلق جیسی جیسی ہدایتیں فرمائی گئیں اب ہم انہیں بیان کرتے ہیں۔

عامل یا والی کی حیثیت

تمہاری امارت یعنی تمہارا موجودہ منصب تمہاری ملکیت نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی امانت ہے جو تمہاری گردنوں میں بندھی ہے اور تم بھی اپنے بادشاہ کے مقابلہ میں ایک رعیت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے ہرگز اس کا مجاز نہیں ہو سکتے کہ بغیر اجازت سلطانی کے رعایا کے امور میں کوئی تصرف کرو۔

اقربا پروری و عزیز نوازی

تمہارے ہاتھ میں خدا کا مال ہے اور تم میری طرف سے اس کے خزانہ دار ہو جب تک کہ اُسے میری سپرد نہ کردو اس ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتے یقیناً میں ان احکام کے نافذ کرنے میں تمہارے نزدیک برا امیر نہ ٹھہروں گا۔

قرابت ملک و ملت کیلئے مضر ہے

بیرونی ممالک اور علاقوں میں عمّال ایسے مقرر کیے جائیں جن کا پورا حال پہلے سے معلوم ہو۔ جو لوگ والیانِ ملک سے قربت کا تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سرکشی کا مادہ ہوتا ہے ان کی طبیعت بے انصافی کی طرف مائل ہوتی ہے لہذا اپنے عزیزوں میں سے کسی کو حکومت کا اختیار نہیں دینا چاہیئے ورنہ وہ غریبوں کو آزار پہنچائیں گے۔

رعایا کے حقوق جس کا حق ثابت ہو جائے اس کے دلانے میں ذرا سا بھی توقف نہیں کرنا چاہیئے۔ اپنوں اور دوسروں سب کو ایک نظر سے دیکھو۔ رضائے خدا طلب کرنے کی خواہشوں پر مستعد رہو چاہے عوام خوش ہوں یا نہ ہوں۔ عاقبت اور انجام پر نظر رکھو۔

دشمن سے صلح جب دشمن تم سے صلح کرنے کی خود درخواست کرے تو اگر وہ صلح تمہارے لیے مفید ہے تو اس کی استدعا کو مسترد نہ کرو اس طرح تمہارے عساکر کو آرام ملے گا صلح تو کر لو لیکن دشمن سے غافل نہ رہو اکثر دشمن موقعہ پاکر فوراً معاہدہ کو توڑ دیتے ہیں۔

معاہدوں پر قیام وعدہ وفائی سے بڑھ کر انسان میں کوئی دوسری خوبی نہیں لہٰذا دوسرے ممالک سے کیے ہوئے معاہدوں پر نہایت مستعدی سے قائم رہو تا وقتیکہ ان کو توڑنے کے علاوہ تمہارے پاس چارہ نہ ہو۔

ناحق خونریزی حضرت علیؑ نے فرمایا کہ کوئی چیز عتاب الٰہی کا باعث اتنا جلد نہیں ہوتی جتنا ناحق خونریزی اور کسی گناہ کی اتنی سخت سزا نہیں رکھی گئی جتنی خون کی۔ عمال ناحق خونریزی کے لیے نہ میرے آگے کوئی عذر پیش کر سکتے ہیں اور نہ خدا کے روبرو اگر یہ امر تم سے سہواً ہو گیا ہے۔ مثلاً تم نے کسی کو طمانچہ مارا اور وہ مر گیا تو خون بہا دو۔

اہل جزیہ یہ غیر مسلم لوگ ہیں جو جزیہ کی رقم ادا کرتے ہیں اور حکومت ہر طرح ان کے جان و مال کی ذمہ دار ہے۔ یہ لوگ اسی وجہ سے ذمی کہلاتے ہیں، حکومت پر انکی پوری نگہداشت فرض ہے۔

تجارت پیشہ

اہل تجارت کے ساتھ تم اپنا حسن معاملت اور لین دین درست رکھو، خاص طور پر اپنے شہریوں اور پردیسیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں کوئی رد رعایت یا فرق نہ کرو۔

اہل صنعت

ان سے تمہارے ملک کی رعایا کو ان کے اسباب زندگی میں بہت نفع پہنچتا ہے، تمہارے شہر کے علاوہ پہاڑ، جنگل اور دریا میں رہنے والوں کے لیے یہی لوگ ضروریاتِ زندگی کی چیزیں مہیا کرتے ہیں۔ یہ تمہارے لشکر کے افسر ہیں جو بغاوت کریں گے۔ ایسی حالت میں تم اہل صنعت و حرفت کا خود خیال رکھو

لین دین کے طریقے

لین دین یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اس میں فریقین کی رضامندی اور خوشنودی ضروری ہے، ترازو اور باٹ ہمیشہ پورے اور درست رہنے چاہیئے اور نرخ بھی ایسا قائم ہو کہ جس سے خریدار اور بیچنے والے کو نقصان نہ ہو اور تم گراں کرنے کی نیت سے غلہ جمع کرنے کی نیت کو توڑ دو اگر اس حکم کے بعد بھی کوئی اس حرکت کا مرتکب ہو تو سزا دو۔

فقراء و مساکین

تجار اور اہل حرفہ حضرات کے بعد رعایا کے طبقات میں آخری درجہ فقراء مساکین اور اہلِ احتیاج کا ہے جن کے لیے ذیل کی ہدایتیں نافذ فرمائیں۔

اب ہم رعایا کے سب سے نیچے درجہ والوں کی طرف توجہ منعطف کراتے ہیں جو کوئی ہنر نہیں جانتے اور اپنی گزر اوقات کی کوئی صورت نکال نہیں سکتے۔ وہ تمہارے ملک و مملکت کے فقراء و مساکین و اہلِ احتیاج ہیں جو اپنی جگہ سے اُٹھ نہیں سکتے اکثر تو طلب بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی خبر گیری لازم ہے۔ ان کے حقوق کا جیسا کہ

جناب باری تعالٰے نے فرمایا ہے ہمیشہ خیال رکھو، بیت المال اسلامی میں سے کچھ اُن کی گزر کے لیے معین کر دینا چاہیئے۔ ان کے ساتھ تکبّر سے پیش نہ آیئے۔ بہت ایسے ہیں جو ذلت و خواری کی وجہ سے مانگ نہیں سکتے تم اُن کی ضروریات کا خود خیال رکھو۔

ان احکام کو پڑھ کر ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ خلافت مرتضویؓ نے نظامِ ملکی کے جزوی اور کلی تمام ضروریات کی طرف پوری توجہ سے کام لیا ہے اور اِن تمام امور کے متعلق ایسی ضروری اور مفید ہدایتیں ارشاد فرمائیں، جو آپ سے پہلی خلافتوں میں کسی نے بھی نافذ نہیں کیں [۱]

فوجی نظام

حضرت علیؓ فطرتاً سپاہ گری کے دلدادہ اور جنگ آزمائی کا والہانہ جوش رکھنے والے مردِ میدان تھے، اس لیے فوج کی ترقی اور تنظیم خاص طور پر انکا مرکز توجہ رہی چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے چھاؤنیاں قائم کیں اور قلعے تعمیر کرائے۔ [۲]

فوج کو ہدایات

حضرت علی علیہ السلام کا معمول یہ تھا کہ جب اپنی فوج کو کسی لڑائی میں بھیجتے تھے تو ہر شخص کو وصیت فرماتے کہ بھائی! دیکھو فریق مخالف سے نرمی اور نیکی کا برتاؤ کرنا، عورتوں کی پوری حفاظت کرنا، اور اُن کو اذیت و پریشانی سے بچانا [۳]

ریونیو کلکٹر کو ہدایات

بزرگ سابور جسے عرب "بزرج سابور" کہتے تھے ایک ضلع تھا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ

---

[۱] اسلامی سیاست کا ابتدائی مطالعہ، [۲] تاریخ اسلام اکبر شاہ جالندھری ص ۲۵۲، [۳] تاریخ الائمہ ص ۲۴۳

نے ایک صاحب کو وہاں کی مالگزاری وصول کرنے پر مقرر فرمایا۔ وقتِ رخصت حضرت علیؑ نے ان کو فرمایا۔ دیکھنا ایک درہم وصول کرنے پر کسی کو کوڑے سے نہ مارنا اور ہرگز ہرگز ذمی رعایا کی ان چیزوں کو بقایا میں نیلام نہ کرنا جو اُن کی روز کی روزی کا ذریعہ ہوں گرما اور سرما کے لباس اور اُن کے مویشی جن سے وہ کاشت اور باربرداری کا کام لیتے ہوں اُن کو بھی ہاتھ نہ لگانا۔

اس شخص نے حضرت علیؑ کی خدمت میں عرض کیا، امیرالمومنین پھر تو میں اسی طرح واپس آجاؤں گا جیسے جارہا ہوں یعنی کچھ وصول نہ ہوگا۔ مرتضیٰ علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا خواہ تم اسی طرح واپس کیوں نہ ہو، پھر فرمایا تم پر افسوس ہے مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں کی اصلی ضرورتوں سے جو بچ جائے اس سے مطالبہ جائز وصول کیا جائے (العفو) [1]

خراج کے متعلق جانچ پڑتال خراج کے بارے میں حاکموں سے شدید احتساب کرتے تھے، اگر وقت معین سے ذرا بھی دیر ہو جاتی تو نہایت سخت احکام صادر فرماتے، یزید بن قیس ارجبی نے خراج میں تاخیر سے کام لیا تو آپ نے لکھا:

"تم نے خراج دیر سے بھیجا اس کی وجہ کیا ہے، بہرحال میں تمہیں خدا سے ڈرنے کی تلقین کرتا ہوں اور تمہیں خوفِ خدا دلاتا ہوں کہ اجر برباد اور جہاد باطل کر دینے والا کام نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اپنے نفس کو حرام مال سے دور رکھو اور مجھے موقعہ نہ دو کہ تم سے باز پرس کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔ مسلمانوں کو معزز کرو مگر معاہدین پر زیادتی نہ ہونے پائے" [2]

---

[1] سنن بیہقی جلد ۹ صفحہ ۲۰۵

دو عالم نے جو کچھ دیا ہے اسے حصولِ عقبیٰ کا ذریعہ بناؤ اور دُنیا کا حصّہ بھی نہ بھولو۔

نعمان بن عجلان عامل بحرین خراج وصول کرکے کہیں چل دیئے تھے آپ نے انہیں تحریر فرمایا۔

" جو شخص امانت میں خیانت کا مرتکب ہوا' اور اپنے نفس و دین کو نہ بچا سکا' وہ دُنیا میں بھی موردِ خسران ہوا اور آخرت میں جو کچھ ظاہر ہونے والا ہے وہ اس سے زیادہ تلخ' زیادہ مصیبت خیز اور زیادہ دیرپا ہے' خدا سے ڈرو تم نیک گھرانے سے تعلق رکھتے ہو اس لیے حُسنِ ظن کا موقعہ دو' مجھے جو اطلاع موصول ہوئی ہے اگر وہ درست ہے تو اُس سے تائب ہو جاؤ اور اپنے باب میں تبدیلِ رائے پر مجبور نہ کرو" [۱]

خراج کے مال کی تقسیم

ایک دفعہ اصفہان سے خراج کا کچھ مال آیا آپ نے اس کو سات حصّوں پر تقسیم کردیا پھر اس میں ایک روٹی لی تو اُس کے بھی سات ٹکڑے کیے اور خراج کے ہر حصّہ پر اس روٹی کا ایک ٹکڑا بھی رکھ دیا۔ [۲]

ذمیوں کے حقوق کا لحاظ

ذمیّوں کا خاص خیال رکھتے تھے اور حاکموں کو بھی ان کے حقوق کے تحفّظ کے متعلق تلقین فرماتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ ذمیّوں کی طرف سے عمرو بن مسلمہ ارحبی کی سخت گیری

---

[۱] تاریخ اسلام اکبر شاہ نجیب آبادی [illegible] ص ۱۵۳' [۲] تاریخ الائمہ ص ۲۱۳

کے باب میں شکایت موصول ہوئی آپ نے انہیں لکھا۔

"مجھے خبر ملی ہے کہ تمہارے علاقے کے ذمی دہقان تمہاری سخت گیری سے نالاں ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، نرمی کے وقت نرمی کرو اور سختی کے وقت سختی لیکن نہ سختی ظلم بن جائے اور نہ نرمی نقصان کا موجب۔ مطالبہ بیشک وصول کرو لیکن کسی بے گناہ کے خون سے دامن آلود نہ کرو۔"

آب پاشی کی ایک نہر کے پٹ جانے پر ایک حاکم قرظہ بن کعب انصاری کو تحریر فرمایا۔

"تمہارے علاقے کے ذمیوں کی طرف سے شکایت موصول ہوئی ہے کہ ان کی ایک آبپاشی کی نہر پٹ کر بے نشان ہو گئی ہے جسے دوبارہ جاری کرنا مسلمانوں کا فرض ہے، تم معائنہ کے بعد یہ کام کر دو، اپنی عمر کی قسم میں اس کا آباد رہنا زیادہ پسند کرتا ہوں بہ نسبت اس کے کہ یہ لوگ ملک سے نکل جائیں یا خستہ حال ہو جائیں یا ملک کی فلاح و بہبود میں حصہ نہ لے سکیں۔[۱]

عمال کی نگرانی اور احتساب

ملکی نظم و نسق کے سلسلہ میں سب سے اہم کام عمال کی نگرانی ہے۔ حضرت علیؓ نے اس کا خاص اہتمام بدِ نظر رکھا، وہ جب کسی عامل کو مقرر کرتے تھے تو اُسے نہایت مفید اور گراں بہا نصائح کرتے تھے[۲] وقتاً فوقتاً عمال و حکام کے طرزِ عمل کی تحقیقات

---

[۱] تاریخ اسلام نشر جالندھری ص ۲۵۵ ، [۲] کتاب الخراج ص ۶۲

کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت کعب بن مالک کو اس خدمت پر مامور کیا تو یہ ہدایت فرمائی۔

"تم اپنے ساتھیوں کا ایک گروہ لے کر روانہ ہو جاؤ اور عراق کے ہر ضلع میں پھر کر عمال کی تحقیقات کرو اور اُن کی روش پر غائر نظر ڈالو"

عمال کے اصراف اور مالیات میں ان کی بے عنوانیوں کی سختی سے بازپرس فرماتے تھے ایک دفعہ اردشیر کے عامل مصقلہ نے بیت المال سے قرض لے کر پانچ سو لونڈی اور غلام خرید کر آزاد کیے، کچھ دنوں بعد حضرت علیؓ نے سختی سے اس رقم کا مطالبہ کیا مصقلہ نے کہا خدا کی قسم عثمان کے نزدیک اتنی رقم کا چھوڑ دینا کوئی بات نہ تھی لیکن یہ تو ایک ایک حبہ کا تقاضا کرتے ہیں۔ وہ ناداری کے باعث مجبور ہو کر امیر معاویہ کی پناہ میں چلے گئے۔ جناب امیرؓ کو معلوم ہوا تو فرمایا:۔

"خدا اس کا بُرا کرے اس نے کام تو سیّد کا کیا لیکن غلام کی طرح بھاگا اور فاجر کی طرح خیانت کی خدا کی قسم اگر وہ مقیم رہتا تو قید سے زیادہ اس کو سزا نہ دیتا اور اگر اس کے پاس کچھ ہوتا تو لے لیتا"[۱]

منذر بن جارود حاکم اصطخر کو یہ انتباہ نامہ تحریر فرمایا:۔

"مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم اپنے فرائض منصبی کی پرواہ نہ کر کے سیر و شکار کو نکل جاتے ہو اور سگ بازی کرتے ہو اگر یہ خبر درست ہے تو میں تم کو اس کی سزا دوں گا۔ تمہارے گھر کا جاہل بھی تم

---

[۱] خلفائے راشدین ص۲۳۲ و ص۲۳۳

سے اچھا ہے۔
چنانچہ اس جرم کی پاداش میں وہ معزول کر دیئے گئے۔ [1]
اشعث بن قیس کو جو حضرت عثمان کی طرف سے آذربائیجان کے حاکم تھے لکھا:۔

"تمہارا یہ عہدہ کوئی خوانِ نعمت نہیں ہے بلکہ تمہارے گلے میں امانت ہے اور تم بالا دست حاکم کے سامنے جوابدہ ہو تمہارے ہاتھ میں جو مال ہے خدا کا ہے تم اس کے خزانچی ہو۔ یہاں تک کہ اُسے میرے پاس پہنچا دو۔ امید ہے کہ میں تمہارے حق میں بُرا حاکم ثابت نہ ہوں گا۔" [2]

زیاد بن ابیہ کی فضول خرچی پر لکھا:۔

"اعتدال کی راہ سے اسراف کو چھوڑ دے، آج کے دن کل کو یاد کر اتنا ہی مال رکھ، جو زیادہ ہو اسے اپنی محتاجی کے دنوں کے لیے آگے بڑھاتا جا، کیا تو امید کرتا ہے کہ خدا تجھے متواضعین کا اجر دیگا جب کہ تو اُس کے نزدیک متکبروں میں سے ہے اور کیا تجھے صدقہ کرنیوالوں کا ثواب ملے گا جب کہ تو عیش لوٹ رہا ہے کمزوروں اور بے نواؤں کو محروم کر چکا ہے آدمی کو اسی عمل کا ثواب ملتا ہے جو وہ انجام دے چکا ہے آدمی وہی پاتا ہے جو وہ آگے بھیج چکا ہے" [3]

---

[1] تاریخ اسلام نشتر جالندھری صـ۲۵۳، [2] نہج البلاغہ کا مکمل اردو ترجمہ صـ۱۷
[3] نہج البلاغہ کا مکمل اردو ترجمہ صـ۲۵

اسی طرح ایک اور حاکم کے خلاف متعدد شکایتیں موصول ہوئیں تو اُسے ایک لمبا چوڑا خط لکھا جس کا مضمون یہ ہے۔

"مجھے خبر پہنچی ہے کہ تم عیش و عشرت میں دن گزارتے ہو۔ بخورات اور روغنیات زیادہ تر زیرِ استعمال ہیں، دسترخوان پر قسم قسم کا پرتکلف کھانا چنا جاتا ہے، منبر کے واعظ اور خلوت کے عمل میں تطابق میں اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو تم نے اپنے نفس کو ضرر پہنچایا اور مجھے تادیب پر مجبور کیا تم بیواؤں اور یتیموں کے مال سے عیش و عشرت میں غرق ہو کر اللہ تعالےٰ سے صالحین کے اجر کی امید کیوں رکھتے ہو ...... تائب ہو کر اصلاح نفس کرتے ہوئے خدا کے حقوق ادا کرو[1]

عثمان بن حنیف انصاری گورنر بصرہ کے نام خط کے اقتباسات بصرہ کے ایک رئیس کی دعوت قبول کرنے پر :—

ناجائز دعوت

ابن حنیف مجھے معلوم ہُوا ہے کہ بصرہ کے ایک بے فکرے نے تجھے دعوت دی اور تم دوڑ پڑے قسم قسم کے کھانے تھے۔ تم مزہ لے لے کر کھاتے تھے اور تمہارے آگے قابوں پر قابیں بڑھائی جاتی تھیں، میں نہیں سمجھتا کہ تم ایسے لوگوں کی دعوت قبول کرو گے جن کے دروازے پر محتاج دھتکارے جاتے ہیں اور جن کے دسترخوان پر صرف مالدار بلائے جاتے ہیں۔

حلال و مشتبہ کی جانچ

اب سوچو اس دعوت میں تم نے کیا کھایا ہے جس کھانے کی حلت مشتبہ ہو اُسے قے کر کے نکال

[1] تاریخ اسلام از۔ جالندھری صفحہ ۲۵۱

ڈالو اور جس کی حلت کا اطمینان ہو تو خیر کوئی مضائقہ نہیں۔

اپنے امام کی حالت پر غور کرو اور اسکی مدد کرو

بات یہ ہے کہ ایک امام ہوتا ہے اور لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں اور اس کے نورِ علم سے روشنی حاصل کرتے ہیں تمہارے امام نے اس دُنیا کے سازو سامان میں سے۔ پہننے کو دو گدڑیوں اور کھانے میں دو روٹیوں پر اکتفا کیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے تم ایسا نہیں کر سکتے۔ البتہ اپنی پرہیزگاری ریاضت، عفت نیکی سے میری مدد کر سکتے ہو۔

اپنا اسوہ پیش کر کے رعایا پر شفقت کی ترغیب

اگر میں چاہتا تو آسانی سے اسی شہد مصفیٰ سے عمدہ یا خالص گیہوں کے آٹے سے اس نرم ریشم سے تن آسانیاں مہیا کر سکتا تھا، مگر یہ کہاں ممکن، خواہش مجھے مغلوب نہیں کر سکتی، حرص اچھے کھانوں پر مجھے رجھا نہیں سکتی جب کہ حجاز یا یمامہ میں شاید کوئی ایسا ہو جسے ایک ایک روٹی کی بھی امید نہیں۔ جس نے کبھی شکم سیری جانی ہی نہیں۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں شکم سیر ہوں اور میرے گرد بھوکے پیٹ اور پیاسے جگر بلبلا رہے ہوں کیا میں اس پر خوش ہو جاؤں کہ مجھے امیر المومنین کہا جاتا ہے مگر مومنوں کی مصیبتوں میں ان کا شریکِ حال نہ ہوں اور روکھی سوکھی زندگی میں ان کے لیے نمونہ بنوں نہ[1]

نرخ اور وزن کی دیکھ بھال

بازار میں اشیاء کے نرخ اور وزن کی دیکھ بھال خود کرتے، بازار کا گشت

---

[1] نہج البلاغہ کا مکمل اردو ترجمہ اقتباسات از ص۲۱۲ و ص۲۱۳ و ص۲۱۴

کرنے چلے جاتے اور دکانداروں کو بھاؤ اور ناپ تول کی ایمانداری سے انجام دینے کی تلقین فرماتے [۱]

مالی نظام

صیغۂ مال میں نہایت قابلِ قدر اصلاحات کیں، جس سے آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہوگیا۔ جنگلوں پر محصول لگایا چنانچہ تنہا برس کے جنگل کی آمدنی چار ہزار روپیہ سالانہ تھی علاوہ بریں اور جنگل بھی معقول آمدنی کا ذریعہ تھے [۲]

تقسیم مال

حضرت علیؑ پر اعتراض ہُوا کہ علیؑ سب کو ایک نظر سے کیوں دیکھتے ہیں، تو علیؑ نے ان لفظوں میں جواب دیا جو تاریخِ عالم میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ میرا بھی مال ہوتا تو میں برابر ہی تقسیم کرتا اور یہ تو ہے خدا کا مال، یہ یاد رکھو کہ بغیر استحقاق کے کسی کو مال دے دینا فضول خرچی میں داخل ہے، آج ممکن ہے ایسا کام کرنے والا بڑا بن جائے مگر مستقبل میں وہ پست ہی رہے گا [۳]

عقیلؑ و علیؑ

انتہا یہ کہ اس مساوات پسندی پر حضرت علیؑ سے اُن کے بھائی تک برگشتہ ہو گئے اس بناء پر کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کو تمام مسلمانوں سے زیادہ کچھ دیا جائے اور حضرت علیؑ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنا ذاتی حصّہ آپ کو دینے کے لیے تیار ہوں۔ انہوں نے کہا اس میں میرا کیا بھلا ہو گا، آپ نے کہا مجبوری ہے، ایک دن جب انہوں

---

[۱] تاریخ اسلام نشتر جالندھری صہ ۲۵۶، [۲] تاریخ اسلام نشتر جالندھری صہ ۲۵۲
[۳] کلام مولانا سید ابن حسن جارچوی۔ شہیدِ انسانیت صہ ۱۵۴

اصرار کیا تو فرمایا آج آدھی رات کے بعد آیئے گا۔ ممکن ہے کہ وہ خوش ہوئے ہوں کہ اس وقت آؤں گا تو علیؓ پرائیویٹ طور پر میری کوئی خاص امداد کریں گے۔ آئے تو وہ اس وقت پر حضرت ان کو لیے ہوئے بازار میں آئے۔ دکانیں بند تھیں۔ آدمیوں کی آمدورفت موقوف ہو چکی تھی شہر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ دیکھیے یہ وقت اچھا ہے ان دکانوں میں سے کسی ایک کا قفل توڑ لیجئے اور جو کچھ ملے لے جایئے۔ عقیل نے کہا واہ تم مجھے چوری کی تعلیم دیتے ہو آپ نے فرمایا آپ بھی تو مجھ سے یہی چاہتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے اموال میں سے چرا کر آپ کو دے دوں، ایک روز ایسا ہوا کہ جب عقیل نے بہت پریشان کیا تو آپ نے لوہا گرم کر کے عقیل کے جسم سے ملایا۔ وہ تڑپ گئے کہ تم مجھے جلائے دیتے ہو۔ آپ نے فرمایا یہ تو دُنیا کی آگ ہے آپ تو مجھے آخرت کی آگ میں جلانا چاہتے ہیں۔[1]

بیت المال کی حفاظت

ایک دفعہ آپ کے ابن عم حضرت عبداللہ ابن عباس نے بصرہ کے بیت المال سے دس ہزار کی رقم لے لی۔ اطلاع ملنے پر آپ نے اس کی واپسی کے لیے لکھا۔ انہوں نے انکار کیا اس پر حضرت علیؓ نے فہمائش کر کے واپس کرا لیا اور اس باب میں مفید نصیحتیں فرمائیں

ایک مرتبہ بیت المال کے نگران ابو رافع نے جنہیں رسول اللہ صلعم کی غلامی کا شرف حاصل تھا۔ بیت المال میں سے ایک موتی لے کر اپنی لڑکی کو پہنا دیا۔ حضرت علیؓ نے پہچان کر سوال کیا اے ابو رافع تمہیں یہ موتی کہاں سے ملا، میں اس کے لانے والے کا ہاتھ قلم کر دوں گا۔ ابو رافع نے اعتراف جرم کر لیا۔ فرمایا تم اپنی لڑکی کو موتی

---

[1] شہید انسانیت ص ۱۵۴ و ص ۱۵۵

پہناتے ہو سنو جب فاطمہؑ کے ساتھ میرا عقد ہوا تو میرے پاس مینڈھے کی ایک کھال کے سوا کچھ نہ تھا، میں اسی پر سوتا اور اسی پر مویشی کو چارہ دیتا تھا خادم کی صورت تک نہ دیکھی تھی۔[1]

سیرت و طرزِ حکومت

ضرار بن ضمرہ سے معویہ نے جناب امیر علیہ السلام کے حالات دریافت کیے تو انھوں نے کہا:-

"خدا کی قسم وہ دنوں میں ہمیشہ روزے سے ہوتے تھے اور رات کو ہمیشہ نماز میں کھڑے رہتے تھے موٹا جھوٹا لباس پسند کرتے تھے روکھی سوکھی روٹی کھاتے تھے، ہمارے درمیان آکر بیٹھ جاتے تھے جب ہم خاموش ہوتے تھے تو خود بات کی ابتدا کرتے تھے جب ہم سوال کرتے تھے تو جواب دیتے تھے، مال مساوات سے تقسیم کرتے تھے اور رعیت میں عدل و انصاف کرتے تھے کمزور ان کی سختی سے نہیں ڈرتا تھا اور طاقتور ان کے رجوع سے طمع نہیں کرتا تھا، خدا کی قسم میں نے انہیں راتوں میں سے ایک رات دیکھا جب کہ تاریکی نے اپنے پردے لٹکا دیئے تھے اور ستارے ٹمٹما رہے تھے وہ محرابِ عبادت میں اس طرح تڑپ رہے تھے جس طرح سانپ کا ڈسا تڑپتا ہے غمگین انسان کی طرح رو رہے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا کہ آنسو بہہ رہے تھے اور وہ اپنی ریش اقدس پکڑے کہہ رہے تھے۔ اے دنیا میں نے کب تجھ سے اظہارِ شوق کیا ہے اور میں کب تجھ میں مبتلا ہوا ہوں۔ میں نے تجھے تین طلاق دیئے ہیں جن کے بعد رجعت نہیں ہے۔ تیری زندگی تھوڑی ہے اور تجھ میں

---

[1] تاریخ اسلام نشتر جالندھری صفحہ ۲۵۴ و ۲۵۵

خطرات زیادہ ہیں۔ آخرت کا سفر لمبا ہے، راستہ وحشت ناک ہے اور زادِ راہ تھوڑا ہے۔"

یہ سُن کر معاویہ نے کہا خدا کی قسم ابوالحسن ایسے ہی تھے۔[1]

چند اہم صیغے اور اُن کی اجمالی توضیح

صیغۂ تحصیلِ خراج اس صیغہ میں دو قسم کے لوگ شامل تھے ایک تو وہ جو عموماً رعایا سے ملکی خراج وصول کرتے تھے، دوسرے وہ جو رعایا سے صدقات و زکوٰۃ کی رقوم حاصل کرتے تھے، پہلی رقم کی تحصیل تو زیادہ تر چاندی اور سونے کے رائج الوقت سکوں میں ہوتی تھی مگر دوسری تحصیل یعنی صدقات و زکوٰۃ کی رقوم کے معاوضہ میں غلّہ اور حیوانات سے تبادلہ کیا جاتا تھا لیکن ان معاملات کے ساتھ ہی رعایا کے حقوق پامال نہیں کیے جاتے تھے اُن پر کبھی سختی اور شدت نہیں کی جاتی تھی۔ ان کے آرام و اطمینان کے لیے مؤکدہ احکام اہلِ خراج کو نافذ کیے جاتے تھے جیسا کہ والیانِ ملک کو دیئے جاتے تھے اس صیغہ میں تحقیقات کی بہت ضرورت رہتی تھی، لہٰذا دربارِ خلافت سے ایک معتبر شخص مقرر کیا جاتا تھا وہ تشخیص کا کام بھی کرتا تھا اور محصل افسروں کی بے اعتدالیوں کی بھی پورے طور پر تحقیقات کرتا تھا، چنانچہ مصعب ابن یزید انصاری کو اکثر ایسی خدمات سپرد ہوتی تھیں، ان امور کے علاوہ یہ بزرگ مدائن کے علاقہ میں چار مختصر مقامات پر تفتیش کی ہنگامی ضرورت سے بھیجے گئے تھے، علاقہ بہقباوات

---

[1] فواید المشاہد صـ ۱۲۲

نہر سیز، نہر جوزا اور نہر ملک ان کی بارِ دیگر تشخیص سے ان چار علاقوں کی مجموعی آمدنی ایک کروڑ اُسی ہزار وصول ہوئی۔

ان واقعات کو پڑھ کر ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے ایامِ حکومت میں خراج کا صیغہ باوجود اس کے کہ تمام ملک میں فساد اور بدامنی پھیل رہی تھی کس مپرسی کی حالت میں نہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس امر کا ثبوت حضرت علی علیہ السلام کے ایک خط سے ملتا ہے۔

"خدا سے ڈرنے کا جو راستہ ہے اس پر سرگرم رفتار رہو، وہ خدا جس کا کوئی شریک نہیں، کسی مومن کے مال سے جو اللہ کا حق ہے اس سے زیادہ وصول نہ کرے اگر تو کسی قبیلہ میں جائے تو پہلے اُس کی آبگاہ پر اُتر پھر تعظیماً ان کے سامنے جا اور کہہ کہ تمہارے مال میں کچھ اللہ کا حق ہے، اگر ہے تو اُس کے ولی تک پہنچا دو۔ پھر اس مال کو ہمارے پاس لے آؤ تاکہ ہم کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ کے موافق اسے تقسیم کر دیں بیشک یہ مال خدا کا ہے جو تمہیں جمع کرنا ہے"

صرف زبانی صدور احکام پر ہی اکتفا نہیں کی جاتی تھی بلکہ اس پر غور کیا جاتا تھا کہ ان ہدایات پر کہاں تک عمل کیا جا رہا ہے، نہایت سختی سے حساب لیا جاتا تھا اور آپ کی حکیمانہ جدوجہد سے حتی الامکان تحصیل خراج میں اضافہ ہوا۔ خراج وصول کرنے والے عمال کو خاص ہدایات دی گئی تھیں کہ خراج وصول کرنے میں عوام کے ساتھ نہایت نرمی کا برتاؤ کریں، ہرگز سختی سے کام نہ لیں۔

زکوٰۃ وصدقات کا صیغہ

یہ دونوں قسم کی رقوم ایک طرح کے سالانہ ٹیکس ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں ان کی ہر قسم کی آمدنی اور جائداد از قسم طلا و نقرہ و اونٹ، گائے بکری، بھیڑ اور گھوڑے وغیرہ پر حساب لگا کر برابر وصول کی جاتی تھی۔

صدقات یا زکوٰۃ کی آمدنی فقراء، مساکین و عاملان صدقہ، مؤلفۃ القلوب، غلاموں کی آزادی، قرضوں کی ادائیگی اور مجاہدین و مسافرین اور حجاج کی امداد پر صرف ہوتی تھی۔

جو لوگ صدقہ کی وصولی پر مامور کیے جاتے تھے ان کو بھی افسرانِ خراج اور والیانِ ملک کی طرح دارالحکومت کی طرف سے ایک دستور العمل تیار کر کے دیا جاتا تھا جس کا خلاصہ اس طرح پر ہے۔

"اب تم تقویٰ پر ثابت قدم ہو جاؤ، خدا کا کسی کو شریک نہ بناؤ کسی مسلمان کو خوفزدہ و دہشت میں مبتلا نہ کرو۔ جس وقت وہ تمہارے آنے کو پسند نہ کریں تم ان کے پاس نہ جاؤ ان سے اس سے زیادہ نہ لو جتنا ان کے ذمہ واجب ہے اور ان سے سلام کر کے بات شروع کرو۔ ان کے دلوں کو تقاضا اور غصہ کے ناخنوں سے نہ کراشو، جس چیز کے نہ دینے پر وہ مصر ہوں وہ ان سے ہرگز نہ لو، بلا اجازت ان کے ریوڑ میں نہ گھسو، سختی اور نفرت سے ان کے ساتھ پیش نہ آؤ، بوڑھا اور عیب دار جانور نہ لو، مال ایسے شخص کے سپرد کرو جو معتبر ہو ایسے شخص کے سپرد نہ کرو جو مال کو مسلمانوں کے

والی تک نہ پہنچائے پھر والی اس مال کو شرعی تقسیم کے مطابق تقسیم کر دے گا۔"

جناب امیر علیہ السلام نے صدقات ، زکوٰۃ کی رقوم کی وصولی میں رعایا سے حد درجہ نرمی کا اظہار کیا ہے۔ آپ ان رقوم کو خراجِ ملکی میں شامل کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ فقرا و مساکین میں تقسیم فرماتے تھے افسروں اور عمال کو سخت گیری سے روکتے تھے کیونکہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر کے دورِ سلطنت میں زکوٰۃ کی وصولی کی وجہ سے ملک کے شمالی حصہ میں شورش پیدا ہو گی تھی۔ حضرت خالد بن ولید نے مالک بن نویرہ کو محض زکوٰۃ نہ دینے پر مرتد قرار دے کر قتل کر دیا تھا اور ان کی بیوی کو مالِ غنیمت میں شمار کر کے اپنی کنیز بنا لیا تھا۔

تحصیل جزیہ کا صیغہ یہ رقم غیر مسلموں سے لی جاتی تھی جس کے معاوضہ میں ان کی حفاظتِ جان و مال کی جاتی تھی۔ یہ لوگ ایک مقررہ رقم سالانہ ادا کرتے تھے حکومت کو ان کی جائداد سے خواہ وہ کتنی ہی کثیر المحاصل ہو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا (یعنی ان سے انکم ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا تھا) جزیہ کی رقم تعداد نفوس پر منحصر تھی جزیہ کی رقم فی کس حسب ذیل مقرر تھی۔

۱۔ امرار	فی کس	۴۸ درہم
۲۔ متوسط الحال	فی کس	۲۴ درہم
۳۔ تجار	فی کس	۲۴ درہم
۴۔ عامۃ الناس	فی کس	۱۲ درہم

وصولی کے وقت فقرا و مساکین، ضعیف اور کم استطاعت عموماً ادائیگی سے بُری کر دیئے جاتے تھے اور بعض اشخاص جزیہ کی ادائیگی سے کلیۃً مستثنیٰ تھے وہ یہ تھے۔

(۱) پچاس برس سے زیادہ عمر کا مرد (۲) بیس برس سے کم عمر کا لڑکا (۳) عورتیں (۴) مفلوج الاعضا مرد خواہ کسی عمر کے ہوں (۵) معطل العضو مرد خواہ کسی عمر کے ہوں (۶) نابینا مرد خواہ کسی عمر کے ہوں (۷) مجنون مرد چاہے کسی عمر کے ہوں۔ (۸) مفلس مرد جس کے پاس سو درہم سے کم ہوں۔

جزیہ کی رقم کے مخارج

یہ رقم عام طور پر تعمیری امور میں صرف کی جاتی تھی مثلاً:۔

(۱) لشکر کی آراستگی و درستی (۲) سرحد کی حفاظت (۳) قلعوں کی تعمیر (۴) سڑکوں اور رستوں کی تیاری (۵) پلوں کی تعمیر۔

ان تعمیری کاموں سے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ غیر مسلموں کو بھی فائدہ پہنچتا تھا جزیہ کی وجہ سے ذمیّوں سے فوجی خدمات نہیں لی جاتی تھیں۔

عدالت کا صیغہ

اس صیغہ کا کام قرآن وسنت سے ملک کے اندر نزاعی مسائل کا فیصلہ کرنا تھا۔ یہ صیغہ بہت اہمیت رکھتا تھا اس محکمہ کا افسر اور جوابدہ قاضی ہوتا تھا، جو اور والیانِ ملک کی طرح ہر علاقہ اور ہر صوبہ بلکہ قریب قریب ہر شہر میں مقرر ہوتا تھا۔ جناب امیر علیہ السلام کو اس محکمہ سے خاص دلچسپی تھی، فقہ میں جو علم القضا کا اصل الاصول ہے۔ آپ جس لیاقت و صلاحیت کے مالک تھے ویسے صحابہ میں سے کوئی نہ تھا کیونکہ احکامِ شریعت کا قاضی

کا استحضار اور از بر ہونا ضروری ہے اور قوانینِ شریعت کی بنیاد علم القرآن اور علم الحدیث ہے۔ ان دونوں علوم کا جاننے والا امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے بڑھ کر کوئی دوسرا اسلام میں پیدا نہیں ہوا۔ علم القرآن کی نسبت جناب امیر علیہ السلام کا یہ دعوےٰ نہایت صحیح ہے کہ کلامِ پاک کی ہر آیت کی نسبت میں یہ بتا سکتا ہوں کہ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے یا مکہ میں رات کو اتری ہے یا دن میں پہاڑ پر یا زمین میں۔

اب رہا علم الحدیث اس کی تکمیل "انا مدینۃ العلم وعلی" بابہا سے ظاہر و باہر ہے۔ اس امر کے ثبوت میں اور بھی بہت سی حدیثیں موجود ہیں۔ ۳۳ برس تک آنحضرتؐ کی صحبت میں ہر وقت موجود رہنا سب سے بڑا ثبوت ہے آپ کی صیغۂ عدالت میں امتیاز اس سے بھی عیاں ہے کہ قضا کے متعلق ایسے فقہی مسائل رسول اللہؐ کے بعد پیش آئے جس میں بڑے بڑے قاضی قاصر و معذور تھے۔ آخر ان کا فیصلہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا حضرت عمر نے آپ کے فضل و کمال کا اقرار ان الفاظ میں کیا۔

"میں خدا سے ہر اس امر مشکل کے واسطے پناہ مانگتا ہوں جس کے حل کے لیے ابوالحسن موجود نہ ہوں"

اس کے علاوہ حضرت عمر نے احکامِ شریعت کے فتوے کے متعلق حکم دیا تھا کہ "کوئی شخص مسجد میں فتوے دینے کا مجاز نہیں ہے جب علی علیہ السلام موجود ہوں۔

جناب امیر علیہ السلام مہاجر و انصار میں سے یہ عہدے اور مناصب عموماً

ایسے بزرگوں کو تفویض فرماتے تھے جو اپنے تقدس، تقویٰ، امانت، صداقت اور سچائی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ بعض ایسے قضاۃ کے عہدوں کو برقرار رکھا جو خلفاء کے عہد سے کام کر رہے تھے اور اُن کی گذشتہ زندگی ہر قسم کی شکایت سے مبرا تھی آپ ہمیشہ ہر قاضی کو عدل و انصاف اور امانت و دیانت کے متعلق سخت تاکید فرماتے تھے، اور معمولی شکایت پر بھی انہیں جوابدہ ہونا پڑتا تھا۔ اس کے متعلق ایک مکمل دستور العمل تدوین دیا گیا تھا، جس کے ماتحت قاضی کو کام کرنا پڑتا تھا۔

اس کے علاوہ والیانِ ملک کا یہ واجب فرض تھا کہ جن لوگوں کو قاضی مقرر کیا جائے ان کے معاملات کی پوری خبرگیری کی جائے۔ قاضی کی تنخواہ بیت المال سے اتنی دی جائے کہ وہ رشوت وغیرہ کی ضرورت محسوس نہ کر سکے۔

فوج کا صیغہ۔ فوجی بندوبست و عسکری نظم کے ساتھ جناب امیر علیہ السلام کو خاص دلبستگی تھی کیونکہ عسکری نظم میں جس قدر آپ کا زمانہ گزرا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ عسکری خدمات کا اُن کے اسلامی معاصرین میں سے کسی کو اتنا موقع نہیں ملا حضرت علیؑ نہایت کم سنی میں اسلامی جہاد اور رفاقتِ رسولؐ میں معزز و ممتاز ہو چکے تھے۔ آپ تمام غزوات میں بدر و اُحد سے حنین و طائف تک علمدارِ لشکر تھے اور منصبِ امارت پر فائز المرام رہے۔ آپ نے اپنی عمر کا بیش بہا حصہ فوجی نظم و نسق عسکری بندوبست اور لشکر کی ترتیب اور درستی میں صرف کیا۔ آپ فنونِ جنگ کے بہت بڑے ممتاز ماہر تھے۔ آپ کے عساکر نے جس قدر مشقت و محنت جنابِ امیر علیہ السلام کے زمانے میں برداشت کی اس قدر انہیں آرام بھی ملا۔ لشکر کے لیے جس قدر جنابِ امیر علیہ السلام کے دل میں احساس تھا وہ کسی اور فرمانروا کے دل

میں نہیں ہو سکتا۔ آپ اپنے لشکر اور سرداران لشکر کو برابر ہدایات فرماتے رہے مثلاً قیس بن معقل آرمی کمانڈر کو آپ نے لکھا۔

"جس خدا سے ایک دن ملنا ہے اس سے ڈرتے رہو، سردی کے موسم میں صبح اور سہپر کو سفر کرو، دوپہر کے وقت ماتحتوں کو آرام کرنے دو، ابتدا شب میں سفر نہ کرو، صبح ہو جائے تو خدا پر بھروسہ کر کے آگے بڑھو، ہنگام نبرد فوج کے درمیان رہو، دشمن سے نہ اتنا قریب ٹھہرو کہ میل کھا جانے کا خیال ہو، نہ اتنا دور کہ ڈر جانے کا وہم ہو۔ دیکھو دشمن کو عداوت کے جذبہ میں حق کی طرف دعوت دینے اور حجت تمام کرنے کے فرائض کو نہ بھول جانا۔ ایسا نہ ہو کہ اتمام حجت سے پہلے جنگ شروع کر دو۔"

اور امن عامہ کے متعلق ہدایات فرائیں نقصان نہ کرو، کھیتی نہ جلاؤ وغیرہ وغیرہ

تقسیم بیت المال کا صیغہ

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے جس وقت سے بیت المال کا چارج لیا اس کی تقسیم کو خاص طور پر ملحوظ رکھا اور اس کی ترتیب اور درستی کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی جب خراج کہیں سے آتا تھا، آپ اُسی دن تمام مسلمانوں میں مساوات کو ملحوظ رکھ کر مساوی مساوی تقسیم کر دینا ضروری سمجھتے تھے۔ بیت المال میں صرف وہی مال رکھا جاتا تھا جو اس دن کی تقسیم سے نہ جا تا تھا۔ نماز پڑھتے اور فرماتے تھے" اے بیت المال! قیامت کے دن خدا کے سامنے اس امر کی شہادت دینا کہ علیؑ نے مال کو مسلمانوں سے روک کر اس بیت المال میں جمع نہیں کیا"، مال کی تقسیم میں اس قدر

محتاط تھے کہ ایک دفعہ اصفہان سے کچھ مال آیا، جس میں ایک روٹی بھی تھی، پہلے آپ نے اس کے سات حصّے کیے پھر اس روٹی کے سات ٹکڑے کیے اور ایک ٹکڑا ہر حصّہ میں شامل کرکے مستحقین کے حوالے کر دیا۔

بیت المال کی تقسیم بالکل اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے ہر ہفتہ میں شبِ پنجشنبہ کو مسجد سے بیت المال میں تشریف لاتے اور ہفتہ وار آمدنی کا حساب لیتے تقسیم کرتے وقت مساوات کا بہت خیال رکھتے۔

عقیل بن ابی طالب جو آپ کے حقیقی بھائی تھے وہ بوجہ کثرتِ اولاد تنگدست تھے، انہوں نے وظیفہ کی رقم میں اضافہ چاہا لیکن صاف انکار کر دیا۔ اس طرح اور بہت صیغے تھے جن کا بہترین انتظام کیا۔

صیغہ تعلیم و ارشاد و ہدایت

یہ صیغہ بہت ہی اہم تھا اس میں دو فرائض کی ادائیگی تھی۔

(۱) اہلِ اسلام کی تعلیم (۲) غیر مسلم اقوام کی ہدایت۔

آپ کے ایامِ حکومت میں اور دورِ عزلت و گوشہ نشینی میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے جن میں مذاہب و شرائع مختلفہ پر اعتقاد رکھنے والے مناظرہ یا تحقیقِ حق کی نیت سے دربارِ خلافت میں شرف یاب ہوئے اور اپنے سوالوں کا معقول جواب پاکر مشرف باالاسلام ہوئے۔

یہودیوں کا پہلا وفد

یہودی علماء کی ایک جماعت بہت سے پیچیدہ مسائل لے کر آئی، انہوں نے علیحدہ علیحدہ سوالات کیے اور خاطر خواہ جواب حاصل کرکے مشرف باالاسلام ہوئے۔

شہنشاہِ روما کا فرستادہ وفد نصرانی عالموں کا ایک وفد چند مسائل لے کر مدینہ طیبہ میں آیا، ان کے سوالوں کا جواب کوئی مسلم نہ دے سکا۔ حضرت علیؑ نے سب کے جوابات دیئے اور وہ لوگ مسلمان ہوگئے

یہودیوں کا دوسرا وفد علمائے یہود کا ایک دوسرا وفد مدینہ منورہ میں حاضر ہوا اس وفد میں شامل حضرات نے سوالات کیے اور یہ لوگ مطمئن ہو کر مشرف بہ اسلام ہوگئے۔

المختصر آپ نے ہر شعبۂ زندگی کی اصلاح کی اور مسلمانوں کو ان بہترین اصولوں پر قائم کیا جو آپ کی کامیاب سیاست کے شواہد صدق ہیں۔

جناب امیر علیہ السلام نے جب مالک اشتر کو مصر کا گورنر بنایا تو اسے حکومتِ الٰہیہ کا ایک مکمل دستور العمل دیا جسے ہم یہاں مفصل طور پہ لکھتے ہیں۔ یہ ایسا دستور العمل ہے جو تیرہ صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی عالمی مشکلات کا حل ہے۔ اس زمانہ کے ناشکر گزار انسانوں نے قدر نہیں کی تو اس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام بہ حیثیت حاکمِ وقت، اقربا پروری، عزیز نوازی، رشوت ستانی، فسق و فجور، ظلم اور بے انصافی کے خلاف تھے۔ آپکی چند سالہ حکومت میں امن و عدل و انصاف نے جتقدر رواج پایا اور ظلم و جور کے آثار جس طرح محو ہوگئے وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ آپکی سیاست عدل و انصاف پہ مبنی تھی۔

آپ نے اپنے دورِ حکومت میں مسلمانوں میں مساوات، سادگی، عدل و انصاف کا سچا نمونہ پیش کیا۔ لیکن افسوس ہے کہ آپکو زیادہ دن حکومت کا موقعہ نہ ملا۔

دستورِ حکومتِ علیؑ

مالک اُشتر کے نام یہ نہایت قیمتی دستاویز ہے اور ایسے زمانہ میں جب کہ پولیٹیکل سائنس کی موجودہ صورت میں تدوین نہیں ہوئی تھی نہ کالج تھے نہ یونیورسٹیاں جن میں سیاست مدن پر لیکچر ہوتے ہوں! نہ عربوں کو حکمرانی کا تجربہ تھا اس پر بھی امیر المومنین علی مرتضیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انتہائی اختصار و بلاغت سے حکمرانی اور سیاست مدن کے جو اصول اس بلند دستاویز میں جمع کر دیئے ہیں آج کی بے چین دُنیا جو انتہائی شدید عالمی مشکلات میں مبتلا ہے اس سے مستغنی او بے نیاز نہیں اور آج بھی اگر متمدن دُنیا کے حکمران اس مشکلکشائے عالم کے دستورِ حکومت پر عمل شروع کر دیں تو عالمی مشکلات حل ہو سکتی ہیں اور راعی اور رعایا کے روابط خوشگوار ہو سکتے ہیں اور دنیا کی گتھیاں سلجھ سکتی ہیں۔

"جب محمد بن ابی بکر علیہ الرحمۃ والرضوان کے بعد حضرت مالک اُشتر کو مصر کا گورنر بنایا تو یہ بہترین دستور اُن کو عطا فرما کر رخصت فرمایا۔"

فرمان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ وہ وصیّت ہے جسے اللہ کے بندے علی امیر المومنین نے مالک بن الحارث اُشتر کو جب اُسے مصر کا گورنر بنایا فرمائی۔

اغراض و مقاصد تقرر تاکہ اس ملک کا خراج جمع کرے، ملک و ملّت کے دشمنوں سے لڑے اس کے باشندوں کی فلاح و بہبود کا خیال رکھے اور اس کی زمین کو آباد کرے۔

تقویٰ و عمل بالقرآن مالک کو حکم دیا جاتا ہے کہ الٰہی تقویٰ اور معبود کی اطاعت کو ہر امر میں مقدم رکھے اور کتاب اللہ کے مقرر کیے ہوئے فرائض و سنن کی پیروی کرے، اس لیے کہ انسان کی سعادت ان ہی احکام کی پیروی سے وابستہ ہے اور ان سے انکار کرنے اور انہیں ضائع کرنے میں سراسر بدبختی ہے۔

جد و جہد اور حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت میں اپنے دل سے اپنے ہاتھ سے اپنی زبان سے سرگرمِ عمل رہے کیونکہ خدائے بزرگ و برتر نے ذمہ لیا ہے کہ جو کوئی اس کی نصرت و تائید پر کھڑا ہو گا۔ الٰہی نصرت و تائید اُسے حاصل رہے گی۔

تزکیہ و تطہیرِ نفس اور حکم دیا جاتا ہے کہ خواہشوں کے موقعہ پر اپنے نفس کو شکست دے، سرکشی کے وقت اسے قابو میں رکھے کیونکہ نفس بُرائی کی طرف لے جاتا ہے، اس سے بچنے کی صورت یہی ہے کہ خدا کا رحم آدمی کے شاملِ حال رہے۔

مصر کی اہمیت اس کے بعد اے مالک سُن! میں تجھے ایسے ملک میں بھیج رہا ہوں۔ جس پر تجھ سے پہلے بھی حکومتیں حکومت کر چکی ہیں ان میں عادل بھی تھے اور ظالم بھی، لوگ تیری حکومت کو بھی اسی نظر سے دیکھیں گے جس نظر سے تو اگلے حاکموں کی حکومتوں کو دیکھتا رہا ہے اور تیرے حق میں بھی وہی کہا جائے گا جو تو ان حاکموں کے حق میں کہا کرتا تھا۔

تمہارے اخلاق اور رائے عامہ۔ تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ نیک آدمی

اس آواز سے پہچانا جاتا ہے جو خدا اپنے بندوں کی زبان پر اُس کے لیے جاری کر دیتا ہے۔

عمل صالح اور اسکے حصول کا طریق کار

لہٰذا تیرا دل پسند ذخیرہ عمل صالح کا ذخیرہ ہے۔ یہ ذخیرہ اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ تجھے اپنی خواہشوں پر قابو حاصل ہو۔ جو چیز حلال نہیں ہے اس کے لیے تیرا دل کتنا ہی مچلے اپنے آپ کو اس سے دُور رکھو۔ یہ بھی جان لو کہ پسندیدہ چیزوں اور مکروہات میں نفس کی مخالفت کرنا ہی نفس سے انصاف کرنا ہے۔

رعایا سے شفقت کا سلوک

اپنے دِل میں رعایا کے لیے رحم، محبت، روٗفت پیدا کرنا۔ خبردار رعایا کے حق میں درندہ نہ بن جانا، کہ اسے لقمہ بنا ڈالنے میں ہی تجھے اپنی کامیابی دکھلائی دے۔

مسلم و غیر مسلم رعایا اور عفو

رعایا میں دو قسم کے لوگ ہوں گے۔ (۱) تمہارے دینی بھائی (مسلم) یا (۲) مخلوقِ خدا ہونے کے لحاظ سے تمہارے جیسے انسان (غیر مسلم) لوگوں سے غلطیاں تو ہوتی ہیں۔ جان بوجھ کر یا بھول چوک سے ٹھوکریں کھاتے ہی رہتے ہیں، تم نے اپنے عفو و کرم کا دامن خطا کاروں کے لیے اس طرح پھیلا دینا جس طرح تمہاری آرزو ہے کہ خدا تمہاری خطاؤں کے لیے اپنا دامنِ عفو و کرم پھیلا دے۔

اللہ اور اسکی حکومت کا تصوّر

کبھی نہ بھولنا کہ تم رعایا کے حاکم ہو اور خلیفہ تمہارا حاکم ہے اور احکم الحاکمین خدا خلیفہ پر حاکم ہے، خلیفہ نے تمہیں گورنر بنایا ہے اور مصر کی ترقی و اصلاح

کی ذمہ داری تمہیں سونپ دی ہے۔ خدا سے جنگ نہ مول لینا کیونکہ آدمی کے لیے
خدا سے کوئی بچاؤ نہیں۔ خدا کے عفو و رحمت سے تم کبھی بھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

عفو اور سزا و غضب سے حذر

عفو پر کبھی نادم نہ ہونا' سزا دینے پر کبھی شیخی نہ بگھارنا' غصہ آتے ہی دوڑ نہ پڑنا بلکہ جہاں تک ممکن ہو غصہ سے بچنا اور غصہ کو پی جانا۔

آمرانہ ذہنیت سے پرہیز

خبردار! رعایا سے کبھی نہ کہنا کہ میں تمہارا حاکم بنا دیا گیا ہوں' اور اب میں ہی سب کچھ ہوں' سب کو میری تابعداری کرنا چاہیے اس ذہنیت سے دل میں فساد پیدا ہوتا ہے' دین میں کمزوری آتی ہے اور یہ بربادی کا پیش خیمہ ہے۔

تکبر اور اللہ کا تصور

اور اگر حکومت کی وجہ سے غرور پیدا ہونے لگے تو سب سے بڑے بادشاہ (احکم الحاکمین) خدا کی طرف دیکھنا جو تم پر بھی حاکم ہے اور تم پر وہ قدرت رکھتا ہے جو تم خود بھی اپنے آپ پر نہیں رکھتے' ایسا کرو گے تو نفس کی طغیانی کم ہو جائے گی' بھٹکی ہوئی روح لوٹ آئے گی خبردار! خدا کے ساتھ اس کی عظمت میں بازی نہ لگانا اس کی جبروت تشبہ اختیار نہ کرنا کیونکہ خدا جباروں کو ذلیل کر دیتا ہے اور مغروروں کو نیچا دکھا دیتا ہے۔

اقربا پروری اور دوست نوازی ظلم ہے اس سے پرہیز

اپنی ذات کے معاملے میں اپنے خاص عزیزوں کے معاملہ میں جنہیں تم اپنی رعایا میں سے محبوب رکھتے ہو خدا سے انصاف کرنا اور خدا کے بندوں سے بھی انصاف کرنا یہ نہ کرو گے تو ظلم کرنے لگو گے۔

ظلم اللہ سے جنگ ہے اور اسکے نتائج یاد رکھو کہ جو کوئی خدا کے بندوں پر ظلم کرتا ہے تو خدا خود اپنے مظلوم بندوں کی طرف سے ظالم کا حریف بن جاتا ہے اور معلوم ہے کہ خدا جس کا حریف بن جائے اس کی حجت باطل ہو جاتی ہے وہ خدا سے لڑائی ٹھاننے کا مجرم ہوتا ہے یہاں تک کہ باز آجائے اور توبہ کرے۔ خدا کی نعمت کو اس سے بڑھ کر بدلنے والی اور خدا کی عقوبت کو اس سے زیادہ بلانے والی کوئی چیز نہیں کہ آدمی ظلم کو اختیار کرے، یاد رہے کہ خدا مظلوموں کی سنتا اور ظالموں کی تاک میں رہتا ہے۔

جادۂ پسندیدہ تمہیں سب سے زیادہ پسند وہ راہ ہونا چاہیئے جو حق کے لحاظ سے سب سے زیادہ درمیانی، انصاف کی رو سے سب سے زیادہ عام اور رعایا کو سب سے زیادہ رضامند کرنے والی ہو۔

عوام و خواص کی رضا یہ بھی یاد رکھو کہ عوام کی ناراضگی خواص کی رضامندی کو بہالے جاتی ہے اور خواص کی ناراضگی عوام کی رضامندی کے ہوتے ہوئے گوارا کر لی جاتی ہے۔

خواص و عام کا موازنہ۔ خواص یہ بھی یاد رکھو کہ خوشحالی میں جو لوگ حاکم کے لیے سب سے کم کارآمد، انصاف سے گھبرانے والے، مانگنے میں اصرار کرنے والے، بخشش اور عطا کے مواقع پر کم سے کم شکرگذار ہونے والے، انعام و اکرام سے محرومی پر عذر نہ سننے والے اور زمانے کی گردشوں کے مقابلہ میں سب سے کم ثابت قدم رہنے والے خواص ہی ہوتے ہیں۔

عوام ۔ دین کا اصلی ستون، مسلمانوں کی اصلی جمعیت، دشمن کے مقابلہ میں اصلی طاقت

امت کے عوام ہیں۔ اس لیے عوام کا تمہیں زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا چاہیئے۔

عیب جُو سے پرہیز تمہاری مجلس میں سب سے زیادہ دُور اور تمہاری نگاہ میں سب سے زیادہ مکروہ وہ شخص ہونا چاہیئے جو لوگوں کے عیب ڈھونڈا کرتا ہے۔

عیب پوشی لوگوں میں عیب تو ہوتے ہی ہیں، یہ کام حاکم کا ہے کہ ان کے عیب ڈھکے، خبردار چھپے ہوئے عیبوں کی کرید نہ کرنا تمہارا منصب یہ ہے کہ جو عیب چھپے ہوئے ہیں اُن کا فیصلہ خدا پر چھوڑ دو۔ حتی المقدور لوگوں کے ڈھکے کو ڈھکا ہی رہنے دو، ایسا کروگے تو خدا بھی تمہارے وہ عیب ڈھکے رہنے دیگا، جو تم رعایا سے چھپانا چاہتے ہو۔

بُغض و کینہ وہ سب اسباب دُور کر دینا جو بغض و کینہ پیدا کرتے ہیں، عداوت و غیبت کی ہر رسّی کو کاٹ ڈالنا۔

چغلخور خبردار! چغلخور کی بات ماننے میں جلدی نہ کرنا کیونکہ چغلخور دغاباز ہوتا ہے اگرچہ خیرخواہ کا روپ بھر کے سامنے آتا ہے۔

بُخیل — اپنے مشورہ میں بخیل کو شامل نہ کرنا کیونکہ وہ تمہیں احسان کرنے سے روکے گا اور فقر سے ڈرائیگا۔

حریص — حریص کو بھی شریک نہ کرنا کیونکہ وہ ظلم کی راہ سے دولت سمیٹنے کی ترغیب دے گا۔

یاد رکھو۔ بُخل، بزدلی، حرص اگرچہ الگ الگ خصلتیں ہیں مگر ان کی بنیاد خدا سے سوءِ ظن پر ہے۔

وزراء و مصاحبین بدترین وزیر وہ ہے جو شریروں کی طرف داری کرے اور گناہوں میں انکا ساجھی ہو، ایسے آدمی کو اپنا وزیر نہ بنانا کیونکہ اس قسم

یکے لوگ گنہ گاروں کے مددگار اور ظالموں کے ساتھی ہوتے ہیں، ان کی جگہ تمہیں ایسے آدمی مل جائیں گے جو عقل وتدبیر میں اُن کے برابر ہوں گے مگر گناہوں سے اُن کی طرح نہ ہوں گے' نہ کسی ظالم کی اس کے ظلم میں مدد کی ہوگی اور نہ کسی گنہگار کا اس کے گناہ میں ساتھ دیا ہوگا' یہ لوگ تمہیں کم تکلیف دیں گے، تمہارے بہترین مددگار ثابت ہوں گے، تم سے پوری ہمدردی رکھیں گے اور غیر سے اپنے سب رشتے کاٹ لیں گے ایسے ہی لوگوں کو نجی کی صحبتوں اور عام درباروں میں اپنا مصاحب بنانا

پھر یہ بھی یاد رہے کہ خاص الخاص لوگوں میں وہی تمہاری نگاہ میں سب سے زیادہ مقبول ہوں جو زیادہ سے زیادہ کڑوی بات تم سے کہہ سکتے ہوں اور اُن کاموں میں تمہارا ساتھ دینے سے انکار کر سکتے ہوں جو خدا اپنے بندوں کے لیے ناپسند فرما چکا ہے' اہلِ تقویٰ اور اہلِ صدق کو اپنا مصاحب بنانا' انہیں ایسی تربیت دینا کہ تمہاری جھوٹی تعریف کبھی نہ کریں کیونکہ تعریف کی بھرمار سے آدمی میں غرور پیدا ہوتا ہے۔

نیکوکار اور خطاکار میں فرق

اور تمہارے سامنے نیکوکار اور خطاکار برابر نہ ہوں ایسا کرنے سے نیکوں کی ہمت پست ہو جائے گی اور خطاکار اور بھی شوخ ہو جائیں گے۔ ہر آدمی کو وہ جگہ دینا جس کا وہ اپنے عمل کے لحاظ سے مستحق ہو۔

رعایا کا حُسنِ ظن

اور تمہیں جاننا چاہیئے کہ رعایا میں اپنے حاکم کے ساتھ حسنِ ظن اس طرح سے پیدا ہوتا ہے کہ حاکم رعایا پر رحم وکرم کی بارش کرتا رہے۔ اس کی تکلیفیں دُور کرے اور کوئی ایسا مطالبہ نہ کرے جو اس کے

بس سے باہر ہو ایہ اصول تمہارے لیے کافی ہے اس سے رعایا کا حسن ظن تمہیں بہت سی مشکلوں سے بچائے گا۔

حسن ظن و سوء ظن خود تمہارے حسن ظن کے سب سے زیادہ مستحق وہ ہیں جو تمہارے امتحان میں سب سے اچھے اتریں، اسی طرح تمہارے سوء ظن کے بھی سب سے زیادہ مستحق وہی ہوں جو آزمائش میں سب سے بُرے نکلیں۔

اچھے دستور کو نہ توڑنا کبھی اچھے دستور کو نہ توڑنا جو اس امت کے اگلے لوگ جاری کر گئے ہیں، اور جس سے لوگوں میں اتحاد پیدا ہوتا ہے اور جس سے رعایا کی بھلائی ہوتی ہے اور اگر توڑو گے تو اچھے دستوروں کا ثواب اگلوں کے لیے باقی رہے گا اور عذاب تمہارے حصہ میں آئے گا کہ بھلائی کی راہ تم نے مٹا دی۔ اس بارے میں اہلِ علم و عرفان سے مشورہ کرتے رہنا کہ تعمیر و اصلاح کے وسائل کیا ہیں اور انہیں کس طرح استحکام و دوام بخشا جائے۔

طبقاتِ عوام اب دیکھو، رعایا میں کئی طبقے ہوتے ہیں۔ یہ طبقے ایک دوسرے سے وابستہ رہتے ہیں اور آپس میں کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

۱۔ ایک طبقہ وہ ہے جسے خدا کی فوج کہنا چاہیئے۔

۲۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو عوام و خواص کا تحریری کام کرتے ہیں

۳۔ پھر انصاف کرنے والے قاضی ہیں۔

۴۔ پھر امن و انتظام کے عمال ہیں۔

۵۔ ذمی اور مسلم
۶۔ اہل جزیہ و اہل خراج ہیں۔
۷۔ پھر سوداگر
۸۔ اور اہل حرفہ ہیں۔
۹۔ غریبوں اور مسکینوں کا نچلا طبقہ ہے۔

خدا نے حق میں ہر طبقہ کا حصہ مقرر کر کے اپنی کتاب میں یا اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت میں اسے ضرور ٹھہرا دیا ہے اور اس کی پابندی اور بجا آوری ہمارے ذمہ لازمی کر دی ہے۔

فوج و اہل خراج

خدا کی فوج باذن اللہ رعایا کا قلعہ ہے، حاکم کی زینت ہے دین کی قوت ہے، امن کی ضمانت ہے، رعایا کا قیام فوج ہی سے ہے، لیکن فوج کا قیام خراج سے ہے جو خدا اس کے لیے نکالتا ہے، خراج ہی سے سپاہی جہاد میں تقویت پاتے ہیں، اور اپنی حالت درست کرتے ہیں۔

قضاۃ و عمّال

پھر ان دونوں طبقوں، فوجیوں اور اہلِ خراج کی بقا کے لیے تیسرا طبقہ ضروری ہے یعنی قضاۃ و عمّال۔

کلرکوں کا طبقہ

کہ یہی لوگ ہر قسم کے مالی معاملات انجام دیتے ہیں اور ان چاروں طبقوں کی بقا کے لیے تاجر اور اہلِ حرفہ ضروری ہیں کہ بازار لگاتے اور سب کی ضرورتیں مہیا کرتے ہیں۔

ادنیٰ طبقہ

آخر میں ادنےٰ طبقہ آتا ہے اور اس طبقے کی امداد و اعانت بالکل ضروری ہے۔

توفیقِ الٰہی اور عزمِ مصمم خدا کے یہاں سب کی گنجائش ہے اور حاکم پر سب کو حق قائم ہے۔ الغرض جتنی بھی بھلائی کر سکتا ہے کرنا ہے مگر اس بارے میں اپنے فرض سے وہ عہدہ برآ ہو نہیں سکتا۔ جب تک توفیقِ الٰہی اور دعا کے ساتھ عزمِ مصمم بھی نہ رکھے کہ حق کا ساتھ دے گا، حق ہی پر ثابت قدم رہے گا چاہے حق آسان ہو یا مشکل۔

فوج دیکھو اپنی فوج کے معاملے میں ہوشیاری سے کام لینا۔ ان ہی لوگوں کو افسر بنانا جو تمہارے خیال میں اللہ کے رسول ص کے اور تمہارے امام کے سب سے زیادہ خیر خواہ ہوں، صاف دل ہوں، ہوشمند ہوں، جلد غصے میں نہ آجاتے ہوں، عذر معذرت قبول کر لیتے ہوں، کمزوروں پر ترس کھاتے ہوں، زبردستوں پر سخت ہوں نہ سختی انہیں جوش میں لے آتی ہو نہ کمزوری انہیں بٹھا دیتی ہو۔

فوج کیلئے انتخاب فوج کے لیے ان ہی کو منتخب کرنا جن کا حسب نسب اور خاندان اچھا ہے جن کا ماضی بے داغ ہے جو ہمت و شجاعت اور جود و سخا سے آراستہ ہیں، شرافت اور نیکی ایسے ہی لوگوں میں زیادہ ہوتی ہے

فوج پر خصوصی التفات ان فوجیوں کے معاملات کی ویسی ہی فکر کرنا جیسی فکر والدین کو اولاد کی ہوتی ہے۔ ان کی تقویت اور درستی حال کے لیے جو بھی بن پڑے کرتے رہنا، اور جو کچھ کرنا اُسے بہت نہ سمجھنا اپنے کم سے کم لطف و احسان کو بھی معمولی نہ سمجھنا کیونکہ اس سے ان کی خیر خواہی بڑھے گی اور حسن ظن میں اضافہ ہوگا، ان کی ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورتوں سے بھی اس بھروسہ پر بے پرواہی نہ کرنا کہ بڑی ضرورتوں کا خیال کر رہے ہو کیونکہ تمہاری معمولی رعایت بھی ان کے لیے نعمت ہو گی

اور بڑی ضرورتوں میں تو وہ سراسر تمہارے لطف و کرم کے ہمیشہ محتاج رہیں گے۔

وہی فوجی سردار تمہارے سب سے زیادہ مقرب ہوں جو فوجیوں کی سب سے زیادہ مدد کرتے ہوں، اپنے ہاتھ کی دولت سے سپاہیوں کو اُن کی ضرورتوں اور بال بچوں کی فکروں سے آزاد کرتے ہیں، تاکہ پوری فوج ایک دل ہو جائے۔ اور اس کے سامنے بس ایک ہی خیال رہے "دشمن سے جنگ" فوج کے سرداروں پر تمہاری توجہ فوج کے دلوں کو تمہاری طرف متوجہ کر دے گی۔

حاکم اور رعایا کا رابطہ حاکم کے آنکھ کی ٹھنڈک کس چیز میں ہونا چاہیے اس میں کہ خود انصاف کرے اور رعایا اس سے اپنی محبت ظاہر کرتی رہے، رعایا کی محبت ظاہر نہیں ہوتی جب تک اس کے دل سلیم نہ ہوں اور رعایا کی خیر خواہی صحیح نہیں ہوتی جب تک اسے حاکم سے سچی محبت نہ ہو۔ اس کی حکومت کو بوجھ اور اس کے زوال میں دیر کو وبال نہ سمجھتی ہو۔ لہٰذا رعایا کی امیدوں کے لیے میدان کشادہ رکھنا ضروری ہے، رعایا کی دلجوئی کرتے رہنا، اچھے کاموں کی تعریف سے بہادروں کا جوش بڑھتا ہے اور پیچھے رہ جانے والوں کی ہمتیں اونچی ہوتی ہیں۔

ہر آدمی کے کارنامہ کا اعتراف کرنا، ایک کا کارنامہ دوسرے کی طرف منسوب نہ کرنا، انعام دینے میں کسی کوتاہی نہ کرنا، خاندانی ہونے کی وجہ سے کسی کے معمولی کام کو بڑھا چڑھا نہ دینا، اسی طرح ادنیٰ خاندان ہونے کی وجہ سے کسی کے بڑے کارنامے کی بے قدری نہ کرنے لگنا۔

اللہ، رسولؐ اور اُولوالامر کی طرف رجوع۔ مشتبہ حالات پیش آئیں اور تمہاری

بصیرت وعلم کام نہ دے تو ان حالات کو اللہ کی طرف اور اللہ کے رسولؐ کی طرف لوٹانا کیونکہ خدا مسلمانوں کی ہدایت کے لیے فرما چکا ہے۔ یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم " اے ایمان لانے والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اور اولوالامر کی جو تم میں سے ہے۔ ــــــ اللہ کی طرف معاملہ کا لوٹانا یہ ہے کہ کتاب محکم کی بعض صریح آیات کی طرف لوٹایا جائے اور رسولؐ کی طرف لوٹانا یہ ہے کہ جامع سنتِ نبوی کو لیا جائے نہ کہ اسے جس میں اختلاف پڑ گیا ہے۔

انصاف کیلئے کیسے لوگ چُننے چاہئیں

پھر ملک میں انصاف قائم کرنے کیلئے ایسے لوگوں کو انتخاب کرنا جو تمہاری نظر میں سب سے افضل ہوں ہجوم معاملات سے تنگ دل نہ ہوتے ہوں، اپنی غلطی پر اڑے رہنا ہی ٹھیک نہ سمجھتے ہوں اور حق کے ظاہر ہونے کے بعد باطل سے چمٹے نہ رہتے ہوں، طامع نہ ہوں، اپنے فیصلوں پر غور کرنے کے عادی ہوں، فیصلہ کے وقت شکوک وشبہات پر رکنے والے ہوں۔ صرف دلائل کو اہمیت دیتے ہوں، مدعی اور مدعاعلیہ سے بحث میں اکتا جاتے ہوں، واقعات کی تہ تک پہنچنے سے جی نہ چراتے ہوں، اور حقیقت کھُل جانے پر اپنے فیصلے میں بیباک و بے لاگ ہوں، یہ ایسے لوگ ہوں جنہیں نہ تعریف بے خود کر دیتی ہو، نہ چاپلوسی ہی مائل کر سکتی ہو، مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

قاضیوں کے فیصلوں کی جانچ اور انکی ضرورتوں کا خیال

تمہارا فرض ہے کہ اپنے قاضیوں کے فیصلوں کی جانچ کرتے رہو، کھلے دل سے انہیں معاوضہ دو تاکہ ان کی ضرورتیں پوری ہوتی

رہیں اور کسی کے سامنے انہیں ہاتھ نہ پھیلانا پڑے، اپنے دربار میں انہیں ایسا درجہ دو کہ تمہارے کسی مصاحب یا درباری کو ان پر دباؤ ڈالنے اور انہیں نقصان پہنچانے کی ہمت نہ ہو سکے۔ قاضیوں کو ہر قسم کے خوف سے آزاد ہونا چاہیئے اس بارے میں پوری توجہ سے کام لینا کیونکہ دین اشرار کے ہاتھ میں پڑ گیا تھا۔ جو اپنی خواہشوں پر چلتے اور دین کے نام پر دنیا کمایا کرتے تھے"

(یہ ہے عدلیہ کا انتظامیہ کے دباؤ سے آزاد ہونا)

عمال کے معاملات اور اُن کا انتخاب

عمال حکومت (یعنی افسران انتظامیہ) کے معاملات پر بھی تمہیں نظر رکھنا ہوگی جسے مقرر کرنا امتحاناً مقرر کرنا رو رعایت سے یا صلاح مشورے کے بغیر کسی کو عہدہ نہ دینا، کیونکہ ایسا کرنے سے ظلم و خیانت کے دروازے کھل جاتے ہیں، اچھے گھرانوں اور سابق میں اسلام کے خدمت گذاروں میں تجربہ کار اور باحیا لوگوں کو ہی منتخب کرنا، ان کے اخلاق اچھے ہوتے ہیں، وہ اپنی آبرو کا خیال رکھتے ہیں، طمع کی طرف کم جھکتے ہیں اور انجام پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔

تنخواہ میں وسعت

عہدہ داروں کو بہت اچھی تنخواہیں دینا اس سے یہ لوگ اپنی حالت درست کر سکیں گے اور حکومت کے اس مال سے بے نیاز رہیں گے جو ان کے ہاتھ میں ہوگا اس پر بھی حکم عدولی کریں یا امانت میں خلل ڈالیں تو تمہارے پاس ان پر حجت ہو گی۔

امور کی جانچ پڑتال

مگر ضروری ہے کہ امور کی جانچ پڑتال کرتے رہنا نیک لوگوں کو مخبر بنا کے ان پر چھوڑ دینا، یہ اس لیے کہ جب

انہیں معلوم ہو گا کہ خفیہ نگرانی بھی ہو رہی ہے تو امانت داری اور رعایا سے مہربانی میں زیادہ چست ہو جائیں گے پھر اگر ان میں سے کوئی شخص خیانت کی طرف ہاتھ بڑھائے اور تمہارے جاسوسوں سے تصدیق ہو جائے تو بس یہ شہادت کافی ہے، تم بھی سزا کا ہاتھ بڑھانا' جسمانی اذیت کے ساتھ خیانت کی رقم بھی اگلوا لینا' خائن کو ذلت کی جگہ کھڑا کرنا اور پوری طرح اُسے رسوا کر ڈالنا۔

محکمۂ خراج کی نگرانی دیکھو خراج کی نگرانی میں کوتاہی نہ کرنا' خراج کے ٹھیک رہنے میں ہی سب کی بھلائی اور خوشحالی ہے' سب کے رزق کا مدار خراج پر ہے اور خراج کے تحصیلداروں پہ ہے۔

خراج اور ملک کی آبادی لیکن خراج سے زیادہ ملک کی آبادی پر توجہ رہنا چاہیئے کیونکہ خراج بھی تو خوشحالی سے حاصل ہوتا ہے جو حاکم تعمیر مملکت کے بغیر خراج چاہتا ہے اس کی حکومت چند روزہ ثابت ہو گی۔

خراج گزاروں کی شکایت پر غور اور ان سے رعایات اگر کاشتکار خراج کی زیادتی کسی آسمانی آفت کی آبیاری میں خلل پڑ جانے کی یا رطوبت میں قلت کی، سیلاب یا خشکی کے سبب تقاوی کے خراب ہو جانے کی شکایت کریں تو اُن کی سننا اور خراج کم کر دینا' کیونکہ کاشتکار ہی تمہارا اصل خزانہ ہیں ان سے جو رعایت بھی کرو گے اس سے ملک کی فلاح ہو گی' حکومت کی رونق بڑھے گی' نیز تم رعایا سے مال کے خراج کے ساتھ تعریف کا خراج بھی وصول کرو گے۔

اس وقت ان میں عدل پھیلانے سے تمہیں اور زیادہ خوشی حاصل ہو گی' تمہارا

بھروسہ بڑھ جائے گا اور جو راحت تم نے انہیں پہنچائی ہے اور جس انصاف کا انہیں خوگر بنا دیا ہے اس پر ان کی شکر گزاری تمہارے لیے خزانہ بن جائے گی ۔ ممکن ہے مشکلات نازل ہوں اور ان لوگوں پر بھروسہ کرنے کی مجبوری پیش آجائے ایسی حالت میں وہ بخوشی تمہارا ہر مطالبہ قبول کریں گے ۔

ملک کی آبادی۔ ملک کی آبادی ، سرسبزی ہر بوجھ اٹھا سکتی ہے ۔

ملک کی بربادی اور اسکے اسباب ملک کی بربادی تو باشندوں کی غربت ہی سے ہوتی ہے اور باشندوں کی غربت کا سبب یہ ہوتا ہے کہ حاکم دولت سمیٹنے پر کمر باندھ لیتے ہیں کیونکہ انہیں اپنے تبادلے اور زوال کا دھڑکا لگا رہتا ہے اور وہ عبرتوں سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے ۔

کلرکوں کا عملہ { Clerikal Staff } اپنے منشیوں کے معاملے کو بھی بہت اہمیت دینا ، یہ منصب بہترین آدمیوں کے سپرد کرنا ، راز کی خط وکتابت پر ان ہی لوگوں کو مامور کرنا جو اعلیٰ اخلاق کے مالک ہوں جنہیں نہ اعزاز گستاخ بنا دے کہ بھری مجلس میں تم سے بدتمیزی کرنے لگیں یا معاہدوں میں مصلحتوں ، فائدوں سے چوک جایا کریں یا اگر کسی معاہدے سے تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے تو اس سے مخلصی کی صورت نہ پیدا کر سکیں ، یہ لوگ ایسے ہونے چاہیئے کہ خود اپنی قدر جانتے ہوں ، چونکہ جو شخص اپنی قدر نہیں جانتا وہ دوسروں کی قدر کیا جانے گا ؟

ان لوگوں کا چناؤ ، محض اپنی فراست ، میلان طبع یا حسن ظن کی بنا پر نہ کرنا ، کیونکہ لوگوں کا دستور ہے کہ تصنع اور ظاہر داری سے اپنے آپ کو حاکموں کی فراست

کے مطابق بنا لیتے ہیں مگر خیر خواہی اور امانت سے کورے ہوتے ہیں۔

انتخاب میں یہ بھی دیکھنا کہ اگلے حاکموں کے تحت کیا خدمتیں انجام دی ہیں عوام کو ان سے کیا فائدہ پہنچا ہے اور امانت داری میں انکا شہرہ کیا ہے؟ ان باتوں کا لحاظ رکھو گے تو بے شک سمجھا جائے گا کہ تم اللہ کے اور اپنی رعایا کے سچے خیر خواہ ہو۔

کلرکوں پر سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ ہر محکمہ کا ایک صدر مقرر کرنا جو محکمے کے تمام کاموں کو اپنے ہاتھ میں رکھے اور مشکلات سے بدحواس نہ ہو، یاد رکھو تمہارے منشیوں میں جو عیب ہو گا اور تم اس سے چشم پوشی کرو گے تو وہ عیب خود تمہارا سمجھا جائے گا۔

تاجر اور پیشہ ور تجار اور اہل حرفت کا پورا خیال رکھنا ان کا بھی جو مقیم ہیں اور ان کا بھی جو پھیری کرتے ہیں، کیونکہ یہ لوگ ملک کی دولت بڑھاتے ہیں، دُور دُور سے سامان لاتے ہیں، خشکیوں، تریوں، میدانوں، ریگستانوں، سمندروں، دریاؤں اور پہاڑوں کو پار کر کے ضروریاتِ زندگی مہیا کرتے ہیں۔ ایسی ایسی جگہوں سے مال ڈھو لاتے ہیں جہاں اور لوگ نہیں پہنچتے، بلکہ وہاں جانے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے، تاجر اور اہلِ حرفہ امن پسند لوگ ہوتے ہیں ان سے شورش اور بغاوت کا اندیشہ نہیں ہوتا، اس پر بھی ضروری ہے کہ پایۂ تخت میں بھی اور اطرافِ ملک میں بھی ان پر نگاہ رکھی جائے کیونکہ ان میں سے اکثر بڑے تنگ دل بڑے بخیل ہوتے ہیں، اجارہ داری سے کام لیتے ہیں اور لین دین میں کُھلی ڈال کے لوٹ لینا چاہتے ہیں۔

اجارہ داری۔ اجارہ داری کی قطعی ممانعت کر دینا کیونکہ رسول اللہ ؐ نے اس

سے منع فرمایا ہے، لیکن ہاں خرید و فروخت خوش دلی سے ہو، وزن بٹے ٹھیک ہیں نرخ مقرر ہو، نہ بیچنے والا گھاٹے میں رہے نہ مول لینے والا خسارہ میں رہے اور ممانعت پر بھی اگر کوئی اجارہ داری کا مرتکب ہو تو اعتدال کے ساتھ اسے عبرت انگیز سزا دی جائے۔

ادنیٰ طبقہ کے مفلس لوگ

ادنیٰ طبقہ کے معاملہ میں یہ لوگ وہ ہیں جن کا کوئی سہارا نہیں، فقیر، مسکین، محتاج، قلاش، اپاہج ان میں ایسے بھی ہیں جو ہاتھ پھیلاتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو ہاتھ نہیں پھیلاتے مگر خود سراپا صورت سوال ہیں۔

ان لوگوں کے بارے میں جو فرض خدا نے تمہیں سونپا ہے اس پر نگاہ رکھنا، اسے تلف نہ ہونے دینا، بیت المال میں ایک حصہ ان کے لیے خاص کر دینا اور اسلام کی جہاں بھی جو صافی جائداد موجود ہے اس کی آمدنی میں ان کا حصہ رکھنا، ان میں سے کون نزدیک ہے؟ اور کون دُور ہے؟ یہ نہ دیکھنا، دُور نزدیک سب کا حق برابر ہے اور ہر ایک کے حق کی ذمہ داری تمہارے سر ڈال دی گئی ہے۔

دیکھو! دولت کا نشہ تمہیں ان بیچاروں سے غافل نہ کر دے، اگر تم نے اس بارے میں اہم دا کثر کو پورا کر دیا تو بھی اس وجہ سے تمہاری معمولی غفلت بھی معاف نہ کی جائے گی۔ لہٰذا ان کے ساتھ تکبر سے پیش نہ آنا اور اپنی توجہ سے انہیں محروم نہ کرنا۔

ان میں سے ایسے بھی ہوں گے جو تمہارے پاس پہنچ نہیں سکتے انہیں نگاہیں

ٹھکراتی ہیں اور لوگ ان سے گھن کھاتے ہیں۔ ان کی خبر گیری بھی تمہارا کام ہے، ان کیلئے بھروسے کے آدمیوں کی خدمات خاص کر دینا، مگر یہ آدمی ایسے ہوں جو خوفِ خدا رکھتے ہوں، اور دل کے خاکسار ہوں، یہ لوگ ان لوگوں کے معاملات تمہارے پاس لایا کریں اور تم نے وہ کرنا ہے کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے تمہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ یاد رکھو رعایا میں ان فقرار سے زیادہ انصاف کا مستحق کوئی نہیں، مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کا جو حق ہے پورا پورا ادا کرتے رہنا۔

اور یتیموں کے پالنے والوں کا بھی خیال رکھنا اور ان کا بھی جو بہت بوڑھے ہو چکے ہیں، جن کا کوئی سہارا باقی نہیں، جو بھیک مانگنے کے بھی لائق نہیں ہیں۔

حق گراں ہی ہوتا ہے

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں حاکموں پر بیشک گراں ہوتی ہیں لیکن یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ پورے کا پورا حق گراں ہی ہے، ہاں خدا حق کو کبھی ان کے لیے آسان کر دیتا ہے جو عاقبت کی طلب میں رہتے ہیں اور اس لیے مشکلات و مکروہات میں اپنے دل کو مضبوط بنا لیتے ہیں، یہ لوگ وہ ہیں جن کا یقین اس وعدۂ الٰہی پر پختہ ہے جو وہ پروردگار اپنے نیک بندوں سے کر چکا ہے

عام ملاقات

اور تم اپنے وقت کا ایک حصہ فریادیوں کے لیے خاص کر دینا سب کام چھوڑ کر اُن سے ملا کرنا، ایسے موقعہ پر تمہاری مجلس عام رہے کہ جس کا جی چاہے بے دھڑک چلا آئے، اس مجلس میں تم خدا کے لیے متواضع ہو جانا، فوجیوں، افسروں اور پولیس والوں سے مجلس کو بالکل خالی رکھنا تاکہ آنے والے دل کھول کر اپنی بات کہہ سکیں کیونکہ میں نے رسول اللہ کو بار بار فرماتے سنا ہے۔

"اس اُمت کی بھلائی نہیں ہو سکتی جس میں کمزوروں کو طاقتور سے پورا پورا حق دلایا نہیں جاتا۔"

یہ بھی یاد رہے کہ اس مجلس میں عوام ہی جمع ہوں گے' اب اگر بدتمیزی سے بات کریں' یا اپنا مطلب صاف بیان نہ کر سکیں تو خفا نہ ہونا' برداشت کر لینا' خبردار زجر و توبیخ نہ کرنا' تکبر سے پیش نہ آنا' میری وصیت پر عمل کرو گے تو خداتم پر اپنی رحمت کی چادریں پھیلا دے گا اور اپنی فرمانبرداری کا ثواب تمہارے لیے اٹل کر دیگا۔

جس کو کچھ دینا تو وہ اس طرح دینا کہ وہ خوش ہو جائے۔

دفتری کام۔ پھر ایسے معاملات بھی ہیں جنہیں خود اپنے ہی ہاتھ میں تمہیں رکھنا ہوگا' ایک معاملہ تو یہی ہے کہ عمالِ حکومت کے ان مراسلوں کا جواب خود لکھا کرنا جو تمہارے کلرک نہیں لکھ سکتے'

روپیہ۔ اور ایک معاملہ یہ ہے' جس دن روپیہ آئے اسی دن مستحقوں کو بانٹ دینا' اس سے تمہارے درباریوں کو کوفت تو ضرور ہوگی کیونکہ ان کی مصلحتیں تقسیم میں تاخیر و تعویق چاہیں گی۔

روز کا کام روز کا کام روز ختم کر دینا' کیونکہ ہر دن کے لیے اسی دن کا کام بہت ہوتا ہے۔

اپنے وقت کا افضل حصہ خدا کیلئے وقف کرنا اپنے وقت کا سب سے افضل حصہ اپنے پروردگار کے لیے خاص کر دینا' اگرچہ سب وقت اللہ ہی کے ہیں بشرطیکہ نیت نیک ہو اور رعایا کو اس نیک نیتی سے سلامتی حاصل ہوتی ہو' خدا کے لیے دین کو خاص کر دینے میں سب

سے زیادہ یہ خیال رہے کہ فرائض بغیر کسی کمی بیشی کے کماحقہٗ بجا لائے جائیں، یہ فرائض صرف خدا کے لیے خاص ہیں اور ان میں کسی کا ساجھا نہیں۔

دن اور رات میں اپنا ایک وقت خدا کے لیے خاص کر دینا اور جو عبادت بھی تقرب الٰہی کے لیے انجام دینا، اس طرح انجام دینا کہ ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہو، کسی طرح کا نقص اس میں نہ رہ جائے چاہے اس سے تمہارے جسم کو کتنی ہی تکلیف ہو

امامتِ نماز

اور دیکھو جب امامت کرنا تو ایسی امامت نہیں کہ لوگ نماز ہی سے بیزار ہو جائیں اور ایسی نماز بھی نہیں کہ نماز کا کوئی رکن ضائع ہو جائے، یاد رکھو نمازیوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں تندرست بھی اور بیمار بھی، اور ضرورت مند بھی، رسول اللہؐ جب خود مجھے یمن بھیجنے لگے تو میں نے عرض کیا تھا۔

"یارسول اللہؐ! امامت کس طرح کروں گا؟"

جواب ملا۔ تیری نماز ویسی ہو جیسے سب سے کم طاقتور نمازی کی ہو سکتی ہے اور تو مومنوں کے لیے رحیم ثابت ہونا۔

ترکِ ملاقات

یہ بھی ضروری ہے کہ رعایا سے تمہاری روپوشی کبھی لمبی نہ ہو رعایا سے چھپنا حاکم کی تنگ نظری کا ثبوت ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حاکم رعایا سے بے خبر ہو جاتا ہے جب حاکم رعایا سے ملنا جلنا چھوڑ دیتا ہے تو رعایا بھی ان لوگوں سے ناواقف ہو جاتی ہے۔ جو اس سے پردے میں ہو گئے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑے لوگ ان کی نگاہ میں چھوٹے ہو جاتے ہیں اور چھوٹے لوگ بڑے ہو جاتے ہیں۔ اچھائی برائی بن جاتی ہے اور برائی اچھائی، حق و باطل میں تمیز اٹھ جاتی ہے اور یہ تو کھلی بات ہے کہ حاکم بھی آدمی ہوتا ہے اور ان سب

باتوں کو جان نہیں سکتا جو اس سے چھپا ڈالی جاتی ہیں۔

حق کے سر پر سینگ نہیں ہوتے کہ دیکھتے ہی سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہ دیا جائے۔

سوچو تو تم دو میں سے ایک قسم کے آدمی ہوگے یا تو حق کے مطابق خرچ کرنے میں سخی ہوگے لیسے ہو تو تمہیں چھپنے کی ضرورت ہی کیا ہے ! حق کی طرف سے جو کچھ تمہارے ذمّہ واجب ہو چکا ہے اسے ادا کردو گے یا اور کوئی نیک کام کر گزرو گے یا پھر تم بخل و منع کی آزمائش میں ڈالے گئے ہو تو اس صورت میں بھی چھپنا غیر ضروری ہے کیونکہ اس قماش کے آدمی سے لوگ بڑی جلدی مایوس ہو کر خود ہی کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تم لوگوں کی زیادہ تر ضرورتیں ایسی ہوں گی جن سے تم پر کوئی بوجھ نہ پڑے گا' وہ کسی ظلم کی شکایت لے کر آئیں گے یا کسی معاملے میں انصاف کے طالب ہوں گے۔

تمہیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ حاکم کے درباریوں اور مصاحبوں میں خود غرضی تعلی زیادتی بدمعاملگی ہوا کرتی ہے۔ ان کے شر سے مخلوق کو بچانے کی صورت یہی ہے کہ ان کی برائیوں کے سرچشمے ہی بند کر دیئے جائیں۔

مصاحب یا رشتہ دار کو جاگیر نہ دینا

خبردار کسی مصاحب یا رشتہ دار کو جاگیر نہ دینا' ایسا کرو گے تو یہ لوگ رعایا پر ظلم کریں گے۔ خود فائدہ اٹھائیں گے اور دنیا و آخرت میں مخلوقِ خدا کی بدگوئی تمہارے سر پڑے گی۔

حق کا نفوذ۔ حق خواہ کسی کے خلاف پڑے' اُس پر حق ضرور نافذ کرنا

چاہیئے، چاہے تمہارا عزیز قریب ہو یا غیر، اس بارے میں تمہیں مضبوط اور اجرِ خداوندی کا طالب ہونا چاہیئے۔ حق کا وار خواہ خود تمہارے رشتہ داروں اور عزیز ترین مصاحبوں پر ہی کیوں نہ پڑے، تمہیں خوش دلی سے یہ گوارا کرنا ہوگا، بے شک تم انسان ہو اور تمہیں اس سے کوفت ہو سکتی ہے لیکن تمہاری نگاہ ہمیشہ نتیجہ پر رہنا چاہیئے یقین کرو نتیجہ تمہارے حق میں اچھا ہی ہوگا۔

رعایا کا شبہ دور کرنا

اگر رعایا کو تم پر کبھی ظلم کا شبہ ہو جائے تو بے دھڑک رعایا کے سامنے آجانا اور اس کا شبہ دور کر دینا اس سے تمہارے نفس کی ریاضت ہوگی، دل میں رعایا کے لیے نرمی پیدا ہوگی، اور تمہارے عذر کا بھی اظہار ہو جائے گا، ساتھ ہی ساتھ یہ غرض بھی پوری ہو جائے گی کہ رعایا حق پر استوار ہو جائے گی۔

جنگ و صلح

اور دیکھو جب دشمن ایسی صلح کی طرف بلائے جس میں خدا کی رضامندی ہو تو انکار نہ کرنا، کیونکہ صلح میں تمہاری فوج کے لیے آرام ہے اور خود تمہارے لیے بھی فکروں سے چھٹکارا اور امن کا سامان ہے۔

لیکن صلح کے بعد دشمن سے خوب چوکس، خوب ہوشیار رہنا چاہیئے، کیونکہ ممکن ہے کہ صلح کی راہ سے اس نے تقرب اس لیے حاصل کیا ہو کہ بے خبری میں تم پر ٹوٹ پڑے، لہٰذا بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے، اس معاملہ میں حسنِ ظن سے کام نہیں چل سکتا۔

معاہدہ

اور جب دشمن سے معاہدہ کرنا، یا اپنی زبان سے عہد کر لینا تو اس عہد کی پوری پابندی کرنا، زبان کا پورا پاس کرنا اور عہد کو نبھانے کے

لیے اپنی جان تک کی بازی لگا دینا کیونکہ سب باتوں میں لوگوں کا اختلاف رہا ہے مگر اس بات پر سب متفق ہیں کہ آدمی کو اپنا عہد پورا کرنا چاہیئے، مشرکوں تک نے عہد کی پابندی ضروری سمجھی تھی حالانکہ مسلمانوں سے بہت نیچے تھے یا اس لیے کہ تجربوں نے انہیں بتا دیا تھا کہ عہد شکنی کا نتیجہ تباہ کن ہوتا ہے، لہٰذا اپنے عہد، وعدہ اور زبان کے خلاف کبھی نہ جانا، دشمن سے کبھی دغا بازی نہ کرنا، کیونکہ یہ خدا سے سرکشی ہے اور خدا سے سرکشی بیوقوف اور سرکش ہی کیا کرتے ہیں۔

عہد کیا ہے؟ خدا کی طرف سے امن و امان کا اعلان ہے جو اس نے اپنی رحمت سے بندوں میں عام کر دیا ہے، عہد خدا کا حرم ہے جس میں سب کو پناہ ملتی ہے اور جس کی طرف سبھی دوڑتے ہیں۔

خبردار! عہد و پیمان میں کوئی دھوکا، کوئی کھوٹ نہ رکھنا اور معاہدہ کی عبادت ایسی نہ ہو جو گول مول اور مبہم ہو۔ کئی کئی مطلب اس سے نکلتے ہوں، اگر ایسا ہو جائے تو عہد دے چکنے کے بعد ایسی عبارت سے فائدہ نہ اٹھانا۔

اور یہ بھی یاد رہے کہ معاہدہ ہو چکنے کے بعد اگر اس کی وجہ سے پریشانی لاحق ہو تو ناحق اسے منسوخ نہ کر دینا، پریشانی جھیل لینا بدعہدی کرنے سے کہیں بہتر ہے بدعہدی پر خدا تم سے جواب طلب کرے گا اور دنیا و آخرت میں اس کے مواخذے سے کہیں مفر نہ ہوگا۔

قتل و خونریزی خبردار! ناحق خون نہ بہانا، کیونکہ خونریزی سے بڑھ کر بدانجام نعمت کا ڈھانے والا، مدت کو ختم کرنے والا اور کوئی کام نہیں، قیامت کے دن جب خدا کا دربارِ عدالت لگے گا تو سب سے پہلے

خونِ ناحق بہا کے مقدمے پیش ہوں گے اور خدا فیصلہ کرے گا، یاد رکھو خونریزی سے حکومت طاقت ور نہیں ہوتی بلکہ کمزور پڑ کر ہٹ جاتی ہے۔

اور یہ تو کھلی بات ہے کہ قتل عمد میں تم نہ خدا کے سامنے کوئی عذر پیش کر سکتے ہو نہ میرے سامنے کوئی عذر پیش کر سکتے ہو، لیکن اگر سزا دینے میں تمہارے کوڑے، تلوار، یا ہاتھ سے نادانستہ اسراف ہو جائے تو حکومت کے غرّے میں مقتول کا خون بہا اس کے وارثوں کے حوالے کرنے سے باز نہ رہنا۔

خودپسندی ۔ خبردار! خودپسندی کا شکار نہ ہو جانا، نفس کی جو بات پسند آئے اس پر بھروسہ نہ کرنا، خوشامد پسندی سے بچنا کیونکہ شیطان کے لیے یہ زرّیں موقعہ ہوتا ہے کہ نیکوکاروں کی نیکیوں پر پانی پھیر دے۔

اخلاق خبردار رعایا پر کبھی احسان نہ جتلانا، جو کچھ اُس کے لیے کرنا اسے بڑھا چڑھا کر نہ دکھانا، اور وعدہ خلافی بھی کبھی نہ کرنا احسان جتانے سے احسان مٹ جاتا ہے۔ بھلائی کو بڑھا کر دکھانے سے حق کی روشنی چلی جاتی ہے اور وعدہ خلافی سے خدا بھی ناخوش ہوتا ہے اور حق کے بندے بھی اللہ تعالےٰ فرما چکا ہے۔

"کبرُ مقتاً عند اللّٰہ ان تقولوا ما لا تفعلون"

"خدا کو نہایت ناپسند ہے کہ تم ایسی بات کہو جو تم نہیں کرتے ہو۔"

احتیاط جلد بازی سے کام نہ لینا، ہر معاملہ کو اس کے وقت پر ہاتھ میں لینا اور انجام کو پہنچا دینا، نہ وقت سے پہلے اس کے لیے جلدی کرنا اور نہ وقت آجانے پر تساہل برتنا۔ اگر معاملہ مشتبہ ہو تو اس پر اصرار نہ کرنا، روشن ہو تو اس پر کمزوری نہ دکھانا اصل یہ ہے کہ ہر کام اس کے وقت پر کرنا اور ہر معاملہ کو اس کی جگہ پر رکھنا، کسی ایسی

چیز کو اپنے لیے خاص نہ کر لینا، جس میں سب کا حق برابر ہے اور نہ ایسی باتوں سے انجان بن جانا جو سب کی آنکھوں کے سامنے ہیں، خود غرضی سے جو کچھ حاصل کرو گے، تمہارے ہاتھ سے چھن جائے گا اور دوسروں کو دے دیا جائے گا، جلد ہی تمہاری آنکھوں پر سے پردے اُٹھ جائیں گے اور مظلوم سے جو کچھ لے چکے ہو اس کی دادرسی ہوگی، دیکھو اپنے غصہ کو، طیش کو، ہاتھ کو، زبان کو قابو میں رکھنا، سزا دینے کو ملتوی کر دینا، یہاں تک کہ غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ اس وقت تمہیں اختیار ہوگا کہ جو مناسب سمجھو کرو مگر اپنے آپ پر قابو نہ پاسکو گے۔ جب تک پروردگار کی طرف رجوع کا معاملہ تمہارے خیالات پر غالب نہ آجائے۔

رسم و رواج گزری ہوئی منصف حکومتوں، نیک دستوروں، ہمارے نبی ؐ کے واقعات اور کتاب اللہ کے فرائض ہمیشہ یاد رکھنا، تاکہ اپنی حکومت کے معاملات میں ہمارے عمل کی پیروی کر سکو۔

تمہیں پوری کوشش سے میری ہدایتوں پر عمل کرنا چاہیئے جو اپنی اس وصیت میں میں لکھ چکا ہوں، میرا یہ عہد تم پر حجت ہے اس کے بعد اپنے نفس کی خواہشوں کا ساتھ دینے میں کوئی عذر پیش نہ کر سکو گے۔

دُعا میں اللہ بزرگ و برتر سے دست بدعا ہوں جس کی رحمت وسیع اور قدرت عظیم ہے کہ مجھے اور تمہیں اس راہ کی توفیق بخشے جس میں اس کی رضامندی اور مخلوق کی بھلائی ہے، ساتھ ہی بندوں میں نیک نامی اور ملک کے لیے ہر طرح کی اچھائی ہے اور یہ کہ اس کی نعمت ہم پر پوری ہو اور اس کی عزت افزائی بڑھتی رہے اور یہ کہ میرا اور تمہارا خاتمہ سعادت و شہادت پر ہو، بیشک ہم اللہ کی طرف رغبت

رکھتے ہیں۔

الحمد للہ والسلام علیٰ رسولہ صلی اللہ علیہ وآلہ۔ والسلام

(نہج البلاغہ، مکتوبات)

عثمان بن حنیف انصاری گورنر بصرہ کے نام

یہ دعوتیں اور کھانے

عثمان بن حنیف گورنر بصرہ تھے۔ کسی سرمایہ دار کے ہاں دعوت میں شریک ہوئے۔ یہ خبر سن کر جناب امیرؑ نے انہیں تنبیہ کے طور پر یہ خط لکھا۔

"امّا بعد! ابن حنیف! مجھے معلوم ہوا ہے کہ بصرہ کے ایک بے فکرے نے تمہیں دعوت دی اور تم دوڑ پڑے، قسم قسم کے کھانے تھے، تم مزہ لے کے کھاتے تھے اور تمہارے آگے قابوں پر قابیں بڑھائی جاتی تھیں، میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم ایسے لوگوں کی دعوت قبول کرو گے جن کے دروازے پر محتاج دھتکارے جاتے ہیں اور جن کے دسترخوان پر صرف مالدار بلائے جاتے ہیں۔

اب سوچو اس دعوت میں تم نے کیا کھایا ہے جس کھانے کی حلّت مشتبہ ہو اُسے تھوک کے نکال ڈالو! اور جس کی حلّت کا اطمینان ہو تو خیر کوئی مضائقہ نہیں، بات یہ ہے کہ ایک امام ہوتا ہے لوگ اسی کی پیروی کرتے اور اس کے نورِ علم سے روشنی حاصل کرتے ہیں، تمہارے امام

گے یہ اس دنیا کے سازوسامان میں سے پہننے کو دو گدڑیاں اور کھانے میں دو روٹیاں بہت ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے تم سب ایسا نہیں کر سکتے البتہ اپنی پرہیزگاری، ریاضت، عفت، نیکی سے میری مدد کر سکتے ہو۔

بخدا تمہاری اس دنیا میں سے میں نے نہ چاندی سونا جمع کیا ہے نہ اور کوئی دولت، اپنی اس تن کی گدڑی کے سوا اور گدڑی نہیں رکھی ہے

بے شک اس آسمان کے نیچے ایک فدک ہی ہمارا تھا مگر کچھ لوگوں نے بخل سے کام لیا اور کچھ لوگوں کے منہ پھول گئے، سچ ہے سب سے اچھا حکم اللہ ہی کا ہے۔

اور میں کیا کروں گا فدک کو اور غیر فدک کو جب کہ نفس کی جگہ کل قبر ہے جس کے اندھیرے میں زندگی کے سب آثار مٹ جائیں گے اور ہستی کی تمام خبریں ناپید ہو جائیں گی۔ کھودنے والے اس گڑھے کو کشادہ بھی کر دیں تو کیا ہوتا ہے، پتھر اور مٹی سے وہ پھر تنگ ہو جائے گا اس کی وسعت مٹی کی تہوں سے بند ہو جائے گی۔

یہ میرا نفس ہے جسے تقویٰ الٰہی کے ذریعے مغلوب کر رہا ہوں تاکہ خوفِ اکبر کے دن امن میں رہے اور صراط پر پھسل نہ پڑے۔ اگر میں چاہتا تو آسانی سے اس شہد مصفیٰ سے، گیہوں کے خلاصے سے، اس نرم ریشم سے تن آسانیاں مہیا کر سکتا تھا، مگر یہ کہاں ممکن؟ خواہش مجھے مغلوب نہیں کر سکتی، حرص اچھے کھانوں پر مجھے رجھا نہیں سکتی جبکہ حجاز میں یا یمامہ میں شاید کوئی ایسا ہو جسے ایک روٹی کی بھی امید نہیں

جس نے کبھی شکم سیری جانی ہی نہیں، کیا یہ ہوسکتا ہے کہ میں شکم سیر ہوں اور میرے گرد بھوکے پیٹ اور پیاسے جگر بلبلا رہے ہوں؟ کیا میں ایسا ہو جاؤں جیسا شاعر نے کہا ہے۔

(یہ بیماری کیا کم ہے کہ تمہارا پیٹ کھانوں سے بوجھل
ہو اور لوگ چیچھڑوں تک کو ترس رہے ہوں)

کیا اس پر خوش ہو جاؤں کہ مجھے امیرالمومنین کہا جاتا ہے مگر مومنوں کی مصیبت میں ان کا شریکِ حال نہ ہوں، روکھی سوکھی زندگی میں ان کے لیے نمونہ نہ بنوں؟ اس لیے تو مجھے پیدا نہیں کیا گیا کہ اچھے کھانوں میں میرا دل اس بندھے ہوئے چوپائے کی طرح اٹکا رہے جسے اپنے چارے دانے کے سوا کوئی فکر نہ ہوتی یا کھلے ہوئے جانور کی طرح ہو جاؤں جس کا کام بس چرنا ہے، گھاس سے پیٹ بھر لیتا ہے اور ماسوا سے غافل رہتا ہے کیا میرے لیے مناسب ہے کہ یوں ہی بے مطلب، بے فائدہ عبث زندگی بسر کروں!

بے مقصد اپنے دن پورے کرتا ہوں؟ گمراہی کی رسی کھینچتا پھروں یا حیرانی کا شکار ہو جاؤں؟

اور گویا میں تمہارے کسی کہنے والے کا کہنا سن رہا ہوں کہ ابو طالبؑ کے بیٹے کی خوراک کا یہ حال ہے تو کمزوری نے اسے برابر والوں کی جنگ اور بہادروں کے مقابلے سے ضرور بٹھا دیا ہوگا لیکن نہیں، بات ایسی نہیں ہے کیا تم نہیں جانتے کہ میدانی درخت بہت مضبوط ہوتا ہے اور تروتازہ

پیڑ نازک ہوتے ہیں، بیابانی لکڑی کا ایندھن زیادہ آگ دیتا اور دیر میں بجھتا ہے، میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں ایسے ہیں جیسے ایک ہی جڑ کے دو نخل، جیسے کلائی اور ڈنڈ! بخدا پورا عرب بھی مجھ سے لڑائی میں ایکا کرے تو بھی میں پیٹھ پھیرنے کا نہیں بلکہ موقع پاتے ہی اس کی گردن پر ٹوٹ پڑوں گا، میری کوشش رہے گی کہ زمین کو اس شخص (معاویہ) سے پاک کر دوں، جس کی عقل بھی الٹی ہے اور جسم بھی الٹا ہے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے۔

اے دنیا! دُور ہو مجھ سے جہاں جانا ہو چلی جا! میں تیرے چنگل سے نکل چکا ہوں، تیرے جال سے چھوٹ چکا ہوں وہ لوگ کہاں ہیں، جنہوں نے تیرے چونچلوں سے دھوکا کھایا! وہ قومیں کیا ہوئیں جنہیں تُو نے اپنی آرائشوں میں پھانسا! دیکھ وہ قبروں میں بند ہیں اور زمین کی مٹی بن چکے ہیں۔ واللہ اگر تو کوئی ایسا وجود ہوتی جس کے جسم ہوتا جسے دیکھا جا سکتا، جسے پکڑا جا سکتا تو میں تجھے اس جرم پر خدا کی مقرر کی ہوئی سزا ضرور دیتا، تو نے نہ جانے کتنے انسانوں کو جھوٹی آرزوؤں کے جال میں پھنسایا اور ہلاکتوں کے حوالے کر دیا، کتنے بادشاہوں کو بربادیوں کے سپرد کیا اور تباہیوں کے گھاٹ اتار دیا۔ ہیہات تیرے پھسلوے پر جس نے پاؤں رکھا پھسل گیا، تیری موجوں پر جو سوار ہوا ڈوب گیا لیکن جو تیرے جال سے کترا گیا، بچ گیا، تجھ سے بچ جانے والا پروا نہیں کرتا اگر اس پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے کیونکہ اس کی نظر میں دُنیا محض ایک دن کے

برابر ہے جو ختم ہونے پر آ چکا ہے۔

دُور ہو جا، مجھ سے اے دنیا! بخدا میں تیرے آگے نہیں جھکوں گا کہ تو مجھے ذلیل کرے، تیرے لیے اپنی رسی ڈھیلی نہیں کروں گا کہ مجھے ہانک لے چلے اور قسم کھاتا ہوں خدا کی ایسی قسم جس میں مشیتِ الٰہی کے سوا کوئی استثنار نہیں کہ اپنے نفس کو ایسا ہلکان کر دوں گا کہ ایک روٹی پر بھی خوش ہو جائے گا اگر اس کے ساتھ نمک مل جائے اور اپنی آنکھوں کو ایسا چشمہ بنا دوں گا جن کا سوت سوکھ چکا ہو۔ میری آنکھیں بھی آنسوؤں سے سوکھ جائیں گی اونٹ اور مویشی اپنے چارے دانے کے بعد اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں تو کیا علیؑ بھی اتنا کھایا کرے کہ آسودہ ہو جائے! آنکھیں پتھرا جائیں علیؑ کی اور اس عمر بھر کی ریاضت کے لیے اونٹوں اور بھیڑوں بکریوں کی ریس کرنے لگے۔

مبارک ہے وہ جس نے اپنے رب کا فرض پورا کر دیا، مصیبتوں پر صبر کر لیا، راتوں کو نیند سے کنارہ کیا اور جب نیند کا غلبہ ہُوا تو زمین کو فرش بنایا، ہاتھ کو تکیہ ٹھہرایا اور ان لوگوں کے ساتھ پڑ رہا جن کی آنکھیں خوفِ قیامت سے جاگتی رہتی ہیں جن کے پہلو بچھونوں سے نا آشنا رہتے ہیں اور جن کے گناہ کثرتِ استغفار سے چھٹ گئے ہیں۔ یہی لوگ حزب اللہ ہیں اور حزب اللہ ہی کو فلاح ہے۔

تو اے ابنِ حنیف، خدا سے ڈر، تیرے لیے دو روٹیاں کافی ہیں تاکہ دوزخ سے تیری مخلصی کا پروانہ بن جائیں۔"

(مکتوبات نہج البلاغہ)

ایک عہدہ دار کے نام خط

حساب پیش کرو

"مجھے ایک خبر ملی ہے، اگر سچی ہے تو تم نے اپنے پروردگار کو ناراض کر لیا ہے، اپنے امام کی نافرمانی کی ہے، اپنی امانت گنوادی ہے معلوم ہُوا ہے کہ تم نے ملک اجاڑ دیا ہے، جو کچھ تمہارے پاؤں کے نیچے تھا اُسے ہتھیا لیا ہے، اور جو کچھ تمہارے ہاتھ میں تھا اسے ہڑپ کر گئے ہو، لہٰذا اپنا حساب میرے پاس بھیجو اور یقین کرو خدا کا حساب آدمیوں کے حساب سے کہیں زیادہ خوفناک ہے"[1]

ایک عہدہ دار کے نام خط

"تم اُن لوگوں میں سے ہو جن سے دین کے قیام میں مدد لی جاتی ہے۔ جن کے ذریعہ گنہگاروں کی نخوت توڑی جاتی ہے اور جن کے وجود سے خطرناک سرحدی رخنوں کو بھرا جاتا ہے اپنے ہر اُس کام میں جو فکر پیدا کرنے والا ہے اللہ سے مدد مانگا کرو۔ رعایا سے نرمی و سختی کا ملا جُلا برتاؤ کرو جہاں نرمی مناسب ہو نرمی برتو جہاں سختی کے بغیر کام نہ چلے سختی سے

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوبات مکتوب نمبر ۳۷

کام لو، رعایا کے لیے متواضع بنو، اپنے دل میں اس کے لیے ترس پیدا کرو اور سب افراد کو اپنی نظر اشارے سلام میں برابر رکھو تاکہ بڑے لوگ تم سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی طمع نہ کریں اور کمزور تمہارے انصاف سے مایوس نہ ہو جائیں''۔ والسلام[1]

---

[1] نہج البلاغہ مکتوبات مکتوب نمبر ۴۴

حضرت علیؑ کا نظریہ سیاست

یہ مقالہ جناب پروفیسر ظفر احمد صدیقی بدایونی کا ہے۔ بدایوں کے حنفی مسلمان عرصہ سے اہل بیتِ رسولؐ سے عقیدتِ خاص رکھتے ہیں جس کی ترادش اس مقالہ سے بھی ہوتی ہے۔ پروفیسر ظفر احمد نے یہ مقالہ یادگارِ مرتضوی کے اس عظیم الشان جلسے میں پڑھا تھا جو شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب کاموں پوری مجتہد العصر ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی صدارت میں ہوا تھا۔

پروفیسر ظفر احمد نے ۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی سے فلسفہ میں فسٹ کلاس میں ایم اے کیا۔ آپ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۹ء تک یونیورسٹی میں عارضی لکچرار رہے ۷ سال تک مجیدیہ کالج الٰہ آباد میں لکچرار اور اٹاوہ کالج میں پرنسپل رہے ۱۹۳۶ء سے پھر مسلم یونیورسٹی میں لکچرارشپ پر تقرر ہوا۔ دو سال ہوئے شعبۂ فلسفہ میں ریڈرشپ پر تقرر ہوا۔ فلسفہ آپ کا خاص مضمون ہے۔ اس پر آپ کے بکثرت مضامین اور کئی کتابیں طبع ہوئی ہیں۔ انھوں نے اس مقالہ میں نہایت اختصار و ایجاز سے حضرت علیؑ کی سیاست پر نظر ڈالی ہے شروع میں مختصر تاریخ نظریاتِ سیاست کی بیان کی ہے پھر حضرت علیؑ کے خطبوں خطوط اور فرامین سے حضرت علیؑ کی سیاست کا ڈھانچہ تیار کیا ہے۔

ہم نے ان کے الفاظ میں چند مقامات کی تشریح کی ہے۔

آج کی دنیا میں سیاسی نظریوں نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ یہ نظریے محض ہماری علمی دلچسپی ہی کا سامان فراہم نہیں کرتے بلکہ ان کے دامن میں آویزشِ پیہم کا شکار انسانیت اپنے امن کے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈتی ہے

آج کی صحبت میں ہم ایک ایسی شخصیت کے سیاسی نظریہ اور تعلیمات کو پیش کرنا چاہتے ہیں جو اسلامی اسرار و علوم کا سرچشمہ ہے جس کے متعلق زبانِ نبوت کا ارشاد ہے۔ "انا مدینۃ العلم و علیؑ بابھا" (میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے) سوال یہ ہے وہ علم کون سا تھا جس میں آپ کو یہ امتیاز حاصل ہوا۔ خود آپ ہی کی زبان سے اس اجمال کی تفسیر سنیئے۔ ایک بار کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین کے متعلق آپ کو کوئی خاص پوشیدہ اسرار تعلیم فرمائے ہیں جو اوروں کو نہیں بتائے گئے۔ آپ نے کہا نہیں وہ فہمِ قرآن ہے جو مجھے حضرت سے حاصل ہوئی ہے۔ قرآن چونکہ اسلامی زندگی کا مکمل لائحہ عمل ہے اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آپ کے اعمال و اقوال میں ہم تعلیماتِ قرآنی کی صحیح تفسیر اور اسلامی نظامِ زندگی کی سچی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔

لیکن اصل مقصد پر آنے سے پہلے بعض قدیم و جدید سیاسی نظریوں کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ اس پسِ منظر میں آپ کی تعلیمات کی صحیح قدر و قیمت متعین ہو سکے۔

یونانی حکماء میں سب سے پہلے افلاطون کے یہاں ہمیں ایک مفصل سیاسی

نظریہ کا سراغ ملتا ہے۔ وہ اپنے سیاسی نظریہ کو نظریۂ اعیان سے اخذ کرتا ہے جس طرح اِس عالمِ ظاہر کی مختلف چیزیں ایک حقیقی عالم (عالمِ اعیان یا عالمِ تصورات) کا عکس ہیں۔ اسی طرح اس دُنیا میں مختلف ریاستوں کا قیام عالمِ اعیان کی مثالی ریاست کی نقل کی مسلسل کوشش ہے۔ اپنی تصنیف "ریاست" میں افلاطون اسی مثالی ریاست کی تشریح کرتا ہے۔ اس کے نظریہ کی کمزوری یہ ہے کہ اوّل تو وہ ایک مثالی ریاست کو پیش کرتا ہے جس کا اِس عالمِ ظاہر میں حصول خود اُس کے فلسفہ کی رُو سے ناممکن ہے۔ پھر اس مثالی ریاست کی کچھ جھلک لانے کے لیے افلاطون یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ دنیاوی حکومت کی باگ ڈور فلسفیوں کے ہاتھ میں ہو، مگر دقّت یہ ہے کہ فلسفی جو عالمِ حقیقی (اعیان) میں منہمک ہوگا وہ اس غیر حقیقی دنیا کے معاملات میں گرفتار ہونا کیوں پسند کرے گا اور غیر فلسفی جو عالمِ حقیقی سے بے خبر ہے وہ ریاست کو صحیح اصول پر چلا نہ سکے گا۔

افلاطون کا شاگرد ارسطو اپنے فلسفہ اور نظریۂ سیاست کو افلاطون ہی کے فلسفہ سے اخذ کرتا ہے مگر اس میں اتنی ترمیم کر دیتا ہے کہ وہ اس عالم سے الگ کسی اعیان یا تصورات کی دنیا کو نہیں مانتا بلکہ اس کے نزدیک ہیئت (یا تصورِ شے) اور مادہ دونوں کا وجود اسی عالم کے افراد کے ذریعہ سے متحقق ہوتا ہے۔ اس حد تک ارسطو افلاطون کا متبع ہے کہ اس کے نزدیک بھی ہیئت ایک عقلی عنصر ہے جو مادہ پر مقدم ہے اور دُنیا کے تمام واقعات اور حادثات میں مادہ کی ہیئت کو حاصل کرنے کی ارتقائی کوششیں نظر آتی ہیں۔ وہ ارتقائے کائنات کے ایک منطقی نظریہ کا قائل ہے جس کی رو سے مختلف

مظاہر فطرت ارتقائے ہیئت کی مختلف منزلیں ہیں ، گویا ہیئت ہی اس تغیر و حرکت کا مقصود اور محرک ہے ۔ انسانی افراد میں مادہ ایک خاص ہیئت کو حاصل کر لیتا ہے ۔ پھر ان افراد کے عضویاتی مجموعہ سے خاندانی ہیئت حاصل ہوتی ہے ۔ مختلف خاندان مل کر ایک قبیلہ کو وجود دیتے ہیں مختلف قبیلوں کی تنظیم سے ایک شہری ریاست بنتی ہے ۔ ریاست کی عملی شکلوں کے سلسلہ میں وہ چھ اقسامِ حکومت کا ذکر کرتا ہے ۔ جن میں سے تین مستحسن ہیں اور باقی تین ان ہی کی مسخ شدہ شکلیں ہیں یعنی

حکومت کی مسخ شدہ صورتیں

(TYRANNY)

ایک جابر کی مبنی بہ جبر حکومت

(OLIGARCHY)

کچھ صاحبانِ ثروت اشخاص کی حکومت

(DEMOCRACY)

غیر ترقی یافتہ عوام کی حکومت

حکومت کی مستحسن صورتیں

(MONARCHY)

ایک عقلمند اور خلق دوست بادشاہ کی حکومت

(ARISTOCRACY)

چند عقلمند انسانوں کی حکومت

CONSTITUTIONAL REPUBLIC

برابر ترقی یافتہ صلاحیتوں کے افراد کی حکومت

ارسطو تینوں مستحسن صورتوں میں سے کسی ایک کو کامل اور ہر حال میں قابلِ ترجیح قرار نہیں دیتا بلکہ ماحول اور حالات کے اعتبار سے کسی ایک کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ارسطو افلاطون کی طرح فرد کی آزادی کو اسٹیٹ کی خاطر قربان نہیں کر دیتا بلکہ دونوں کو اپنی اپنی جگہ مقصود مانتا ہے اور اس مقصدیت کی نامیاتی ہیئت ہے جو دونوں میں بہ طرزِ خاص جلوہ گر ہے مگر اسٹیٹ ایک اعلیٰ تر مقصود ہونے کی حیثیت سے فرد کی مقصدیت کو بھی اپنے اندر شامل رکھتی ہے اور اس طرح اسٹیٹ کا مقصد بھی افراد کی نیکی اور مسرت قرار پاتا ہے۔

ارسطو کا نظریہ افلاطون کے مقابلہ میں زیادہ قریبِ فہم اور قابلِ قبول نظر آتا ہے۔ لیکن اس کی گہرائیوں میں عقلیت کی وہی روح کارفرما ہے جو افلاطون کے فلسفہ میں نظر آتی ہے اور ان بہت سے اعتراضوں کو دعوت دیتی ہے جو افلاطون کے فلسفہ پر وارد ہو سکتے ہیں۔ دوسرے ریاست کے تصور میں وہ یونان کی شہری ریاست سے آگے نہیں جاتا اور ریاست کے مفہوم کو کسی وسیع تر پس منظر میں پیش نہیں کرتا۔

عہدِ جدید میں تھامس ہابز نے خاص طور سے فلسفۂ ریاست کی طرف توجہ کی ہے۔ وہ مادیت اور انفرادی لذتیت (EGOISTIC HEDONISM)

کے فلسفہ پر اپنے سیاسی نظریہ کی بنیاد رکھتا ہے وہ اس بات کا قائل ہے کہ ابتدائی دور میں سب انسان اپنی اپنی خواہشوں کے پیرو اور ایک دوسرے سے برسرِپیکار تھے۔ ہر ایک ہر ایک کا دشمن تھا۔ اس نفسی نفسی کے دور میں کوئی بھی اپنے آپ کو مطمئن اور محفوظ نہ پاتا تھا۔ اس لیے سب لوگوں نے مل کر ایک معاہدۂ عمرانی (SOCIAL CONTRACT) کے ذریعہ سے اپنی آزادیوں کو محدود اور اپنی خواہشات کو پابند بنانا منظور کیا۔ اور اسٹیٹ کی نمائندگی ایک حکمران (SOVEREIN) کو سونپی گئی۔ ہر اسٹیٹ اس معاہدۂ عمرانی سے اختیارات حاصل کرتی ہے اور ہر حکمران اس معاہدۂ اول کی بنا پر ہر سفید و سیاہ کا مالک و مختار قرار پاتا ہے۔ حکمران کی مرضی قانون ہے مذہب، اخلاق سب اس کے تابع ہیں۔

ہابز کا یہ نظریہ آج بیسویں صدی میں کتنا ہی عقل سوز اور انسانیت کش نظر آئے۔ لیکن ایک زمانہ تک بادشاہتوں کے غیر محدود اختیارات کے لیے فتوائے جواز کا کام دیتا رہا ہے۔

معاہدۂ عمرانی کے سلسلہ میں انقلابِ فرانس کے علمبردار فلسفی روسو کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ روسو بھی ہابز کی طرح ایک ابتدائی معاہدۂ عمرانی پر نظامِ ریاست کی بنیاد رکھتا ہے لیکن ایک بنیادی فرق کے ساتھ ہابز کے نزدیک آغازِ کار میں انسانی معاملات کی بنیاد خودغرضی اور آویزش پر تھی اور اس خودغرضی کی بنا پر لوگوں نے معاہدۂ عمرانی کو قائم کیا لیکن روسو اس فطری دور میں باہمی محبت کو انسانی زندگی اور اس کے معاملات کی اساس قرار

دیتا ہے اور اس محبت کے تقاضے ہی کو معاہدۂ عمرانی کا محرک ٹھہراتا ہے
بہرحال آغازِ کار محبت سے ہو یا نفرت سے اس قسم کے نظریوں کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنی تائید میں کوئی اطمینان بخش تاریخی ثبوت نہیں پیش کرتے۔ دوسرے اگر یہ مان لیا جائے کہ کسی قبل تاریخی دور میں اس قسم کا معاہدہ واقعی عمل میں آیا تھا تو اس کو ان معاہدہ کرنے والے فریقوں کے ساتھ ختم ہو جانا چاہیے تھا۔

عہدِ جدید کا ایک اور بڑا فلسفی ایمنویل کانٹ اخلاق قوانین پر اپنے نظریۂ سیاست کی بنیاد رکھتا ہے اخلاقی قوانین کے اس کم سے کم حصّہ کو نافذ کرنے کے لیے جس کے بغیر کوئی فرد سکون و اطمینان سے اخلاقی زندگی بسر نہیں کر سکتا اسٹیٹ وجود میں آتی ہے۔ اسٹیٹ کے وجود اور اختیارات کا وہی جواز ہے جو قوانینِ اخلاق کے وجوب کا یعنی عقلِ عملی یا اخلاقی شعور۔

یقیناً کانٹ کا نظریہ جو اخلاقی شعور پر اسٹیٹ کو مبنی قرار دیتا ہے بہت سے ایسے نظریوں پر قابلِ ترجیح ہے جو محض عقل یا مادی تسکین کو اسٹیٹ کی بنیاد ٹھہراتے ہیں پھر بھی کانٹ کا غیر مشروط فرمانِ اخلاق ایک بے جان اور بے رنگ مجرد قانون ہی کی طرح رہتا ہے جس کے ساتھ وہ وفاداری محسوس کرنا مشکل ہے جس کا وہ طالب ہے۔

کانٹ کے بعد ہیگل کے ہمہ گیر فلسفہ میں نظریۂ سیاست کو ایک خاصی حیثیت حاصل ہے۔ ہیگل کے نزدیک کارگاہِ فطرت اور انسانی تاریخ دونوں ایک تصوّرِ مطلق (ABSOLUTE IDEA) کے جدلیاتی ارتقا کی

شکلیں ہیں۔ تصورِ مطلق جدلیاتی طرز پر واقعات وحادثات میں بتدریج اپنی جلوہ گری کر رہا ہے۔ انسانی تہذیب وتمدن کے مختلف دور فلسفۂ مذہب آرٹ سیاست کے مختلف نظریے سب اس کے ارتقاء کی مختلف منزلیں ہیں۔ چونکہ نیچر اور تاریخ کی ارتقا۔ جدلیاتی طرز ہی کی رہین منت ہے۔ اس لیے مختلف قوموں اور حکومتوں کی جنگ دراصل تصورِ مطلق کی مختلف تعبیروں کی آویزش ہے۔ اور اس آویزش میں وہی نظریہ فتحیاب ہوتا ہے جو تصورِ مطلق کی بہتر ترجمانی کرتا ہے۔ اس طرح یکے بعد دیگرے نئے تمدن، نئے فلسفے اور نئے سیاسی نظریے جدلیاتی طرز پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اور پھر مخالف نظریوں سے ٹکرا کر ایک نئے امتزاج کو وجود بخشتے ہیں۔

یہ نظریہ اپنی عظمت وشوکت کے باوجود ایک خیالی طلسم کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اور بعض عقلی مفروضوں پر اس کی بنا ہے۔ پھر اس نظریہ کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ اسے ہر قسم کی جنگ کے جواز میں پیش کیا جا سکتا ہے اور اس کی رُو سے ہر جنگی کامیابی کو اصول اور نظریہ کی فتح کا ہم معنی قرار دیا جا سکتا ہے۔ غرض اس نظریہ کے سہارے انسانیت کو فلاح وامن کی منزلِ مقصود تک پہنچنا دشوار نظر آتا ہے۔

ابھی قریبی زمانہ میں ایک اور سیاسی فلسفہ نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اور وہ ہے کارل مارکس کی جدلی مادیت کا فلسفہ۔ کارل مارکس ہیگل کے جدلیاتی طرز ہی پر اپنے فلسفے کی بنیاد رکھتا ہے لیکن تصورِ مطلق کو خارج کر کے تمام ارتقائی سلسلہ کو مادی جلوہ گری قرار دیتا ہے۔ اور اقتصادی حالات

اور طبقاتی کشمکش کو تاریخی ارتقا کا اصل محرک قرار دیتا ہے۔

اس نظریہ کے اندرونی تضاد سے قطع نظر اس کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس کی بنیاد باہمی نفرت اور طبقاتی کشمکش پر ہے۔ یہ نظریہ انسانوں کو ہمیشہ کے لیے دو گروہوں میں بانٹ کر ایک نہ ختم ہونے والی آویزش کا دروازہ کھولتا ہے اور امن عالم کے کسی خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے نہیں دیتا۔

آیئے اس تمہید کے بعد سیدنا علیؑ ابن ابیطالبؑ کی تعلیمات پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ آج کے سیاسی ماحول میں انسان کے لیے ان میں کوئی درس ہے کہ نہیں۔ آپ کے نظریہ کی بنا، عقیدۂ توحید اور اقرار آخرت پر ہے۔ خدا کی عظمت اور حاکمیت، اپنی عبودیت، آخرت کا استحضار، انسان کا مسئول ہونا، دنیاوی زندگی کی بے ثباتی اور ناقدری ان ہی عقائد سے مل جل کر آپ کا نظریۂ سیاست تشکیل پاتا ہے۔

عقیدۂ توحید اور وجود و صفاتِ باری تعالیٰ کی بحث براہِ راست ہمارے موضوع سے تعلق نہیں رکھتی، لیکن آپ کے خطبات کے چند اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں جن میں آپ کو عارفانہ نظر اور فلسفیانہ ژرف نگاہی کا کمال نظر آئے گا، مثلاً ایک خطبہ میں یوں ارشاد ہوتا ہے:۔

"وہ واحد ہے مگر وحدت عددی کے ساتھ نہیں، وہ دائم ہے اور ہمیشہ ہے مگر زمانہ کی ادامت کے ساتھ نہیں، وہ بغیر کسی چیز پر سہارا اور اعتماد کیے ہوئے قائم ہے۔ عقلیں اس سے ملاقات کرتی ہیں مگر مشاہدہ کے ساتھ نہیں، اوہام و عقول اس کا احاطہ نہیں کر سکتے،

بلکہ وہ ان کے لیے وجود دل کے آئینہ میں ظاہر ہو رہا ہے، وہ خداوند مطلق صاحب طول و عمق نہیں۔ تمام نہایات اس کی طرف کھنچتی ہیں تمام غایات اس کی طرف منتہی ہوتی ہیں۔" (نہج البلاغہ ص ۲۱۷۔ ۲۱۸)

ایک دوسرے خطبہ میں فرماتے ہیں:۔

"جس شخص نے اسے کیفیات سے مکیّف سمجھا اس نے اسے واحد و یگانہ تسلیم نہیں کیا۔ جس نے اسے مثال کے ذریعہ سے پہچانا وہ اس کی حقیقت تک نہیں پہنچا جس نے اس کی طرف حس یا عقل سے اشارہ کیا اس نے اس کی ذات کا ارادہ اور قصد نہیں کیا۔ وہ بغیر کسی قسم کا فائدہ حاصل کیے تونگر اور غنی ہے زمانوں میں سے کوئی زمانہ اس کا مصاحب نہیں، آلات اور قویٰ نے اس کی اعانت نہیں کی۔" (نہج البلاغہ ص ۲۲۰۔ ۲۲۱)

ایک جگہ ان الفاظ میں حقائق و معارف کی ترجمانی فرماتے ہیں:۔

"وہ خداوند بزرگ و برتر جسے ہمتیں، ارادے اور عزم نہیں پا سکتے دانائیوں، زیرکیوں اور عقلوں کی گہرائیاں اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکتیں۔ جس شخص نے اس کے لیے صفات زائدہ قرار دیں تو گویا اسے قرین اور مخلوق کا ہمسر بنا دیا۔ جس نے اس کو تعاون و نزدیک سمجھ لیا تو گویا وہ دو کا قائل ہو گیا۔ اور جو شخص وحدت سے گزر کر دوئی میں آیا وہ اس ذات واحد و یکتا کے لیے جزو اور ٹکڑے قرار دے رہا ہے۔ اور جو شخص اس ذات واحد و برتر کی طرف

اشارہ سے کام لیتا ہے وہ گویا اسے محدود کرتا ہے جس شخص نے اس کے واسطے ایک حد معین کی اس نے گویا اسے شمار کر لیا۔ وہ موجود ہے مگر عالمِ نیستی سے میدانِ ہستی میں نہیں آیا۔ وہ ہر ایک شئے کے ساتھ ہے مگر عارضی طریقہ سے نہیں وہ ہر ایک چیز کے ساتھ مغایرت رکھتا ہے مگر نہ بطریقِ مفارقت و مزائمت وہ فاعل ہے مگر نہ بقصدِ حرکات و آلات۔" (نہج البلاغہ صٓ)

خدا اور صفاتِ خداوندی کے اس مذاقِ جدید سے ہم آہنگ فلسفیانہ تصور کے ساتھ آپ اسکی ذات کو اقتدارِ اعلیٰ اور حقیقی حاکمیت کا حامل سمجھتے ہیں۔ مالک بن اُشتر کو والیٔ مصر بناتے ہوئے اپنی ایک تحریر میں یہ نصیحت کرتے ہیں "کبھی یہ نہ کہنا کہ میں برسرِ اقتدار اور حکمران ہوں، اس لیے جو میں حکم دوں اس کی بہر حال اطاعت ہونا چاہیے۔ اپنے سے بلند اللہ کی سلطنت کے بزرگ ہونے کا تصور اور خود اپنے اوپر اس کے اقتدار کا خیال کرو۔" (نہج البلاغہ) اسی تحریر میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔ "تم ان کے حاکم ہو اور میں تمہارا حاکم ہوں اور میرے اوپر اللہ کی حکومت ہے" (نہج البلاغہ) یہ نظریہ کس قدر انقلابی ہے اور انسانی حریت کا علم کس قدر اونچا کر دیتا ہے، یعنی کوئی انسان کسی انسان سے غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ ہی نہیں کرسکتا۔ نہ کوئی اسٹیٹ جو انسانوں کے ہاتھوں وجود میں آئی ہو اس کی آزادیٔ ضمیر کو سلب کرکے اس سے کامل اور مقدم وفاداری طلب کرنے کا حق رکھتی ہے۔ انسان کا سرصرف احکامِ الٰہی (یعنی قوانینِ عدل و انصاف)

کے آگے جھکتا ہے۔ اگر عدل و انصاف کے خلاف ہو تو ہر اقتدار کی اطاعت کا جوا انسان اپنی گردن سے اتار پھینک سکتا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی ہستی کے علم اور اس کی مرضی کی اطلاع کا ہمارے پاس کیا ذریعہ ہے حضرت کے خطبات اور ملفوظات میں اس کا جواب بھی ہمیں مل جاتا ہے اور وہ یہ کہ پیغمبر صلعم کی امانت، دیانت اور بے مثال سیرت ہمیں آپ کے سچے رسولؐ ہونے پر اور اللہ تعالیٰ کے متعلق آپ کی شہادت پر ایمان لانے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کا پیغام یا آپ کا لایا ہوا قرآن ایسا ہے جس کی اطاعت ہی پر انسان کی فلاح و نیک بختی کا انحصار ہے نیز وجدان اور تجربہ بھی (اگر فطرت مسخ نہ ہو گئی ہو تو) نبیؐ کے دکھائے ہوئے راستہ کی تائید کرتا ہے۔

بہرحال آپ کے سیاسی عقیدہ بلکہ ساری زندگی میں اللہ کی حاکمیت کا یقین جاری و ساری تھا۔ آپ کے ایمان کی یہ کیفیت تھی کہ ایک بار فرمایا کہ میں ایمان کے اس درجہ پر فائز ہوں کہ اگر درمیان سے سارے حجابات اٹھ جائیں تب بھی میرے علم و یقین میں کوئی اضافہ نہ ہو۔

اللہ کی حاکمیت کے عقیدہ کے ساتھ آخرت کے برحق ہونے کا عقیدہ بھی ناگزیر طور پر وابستہ ہے اور ان ہی دونوں عقیدوں پر سیدنا علیؓ کے نظریۂ سیاست کی بنا ہے۔ دوسرے مخالف نظریوں کے مقابلہ میں یہ نظریہ کئی خوبیوں کا حامل ہے۔

اول تو یہ کہ انسان کو کسی دوسرے انسان یا انسانوں کے سامنے اپنی

آزادیٔ ضمیر کو قربان کرنا نہیں پڑتا۔

دوسرے اسٹیٹ کا وجود انسانوں کے لیے قرار پاتا ہے نہ کہ انسانوں کا وجود اسٹیٹ کی خاطر۔

تیسرے کسی دوسرے نظریہ یا نظام میں انسانوں اور خصوصاً اربابِ اختیار کو بے نفسی اور خلق دوستی کا وہ جذبہ نہیں ملتا جو یہ نظریہ عطا کرتا ہے۔

چوتھے مساوات اور عدل کی جو پاسداری اس نظریہ میں ملتی ہے اسکی مثال کہیں اور نہیں ملتی - غرض عالمگیر اخوت، حقیقی مساوات، بے محابا عدل بے پایاں خلق دوستی اور غیر محدود ایثار و بے نفسی کی گنجائش ہے تو اس نظریہ میں لیکن اس نظریہ میں اگر دقت ہے تو صرف یہ کہ اس کو عقل و استدلال کی راہ سے منوایا نہیں جاسکتا - اس کے لیے براہیمی نظر کی ضرورت ہے اور بقول شاعر ؎

براہیمی نظر پیدا ذرا مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

بہرحال اس نظریہ کی تفصیل و تشریح کے لیے حضرت کے خطبات، مکاتیب اور فرامین پر نظر ڈالیے تو آپ کو ایسے روشن نکات اور ایسی درخشاں ہدایات ملیں گی - جو ہر زمانہ اور ہر حکومت کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکیں -

مثال کے طور پر مالک بن اشتر کو والیٔ مصر بناتے ہوئے آپ نے جو ہدایت نامہ ارسال فرمایا ہے وہ جہانبانی کا ایک روشن دستور العمل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے -

اس دستور میں آپ نے بتایا ہے کہ حکومت کا مقصد خلقِ خدا کی خدمت

ہے اور حکومت ایک سخت آزمائش ہے جس کے متعلق انسان کو خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ ظلم کی مذمت میں ارشاد ہوتا ہے کہ جس نے اللہ کے بندوں پر ظلم کیا، تو بندوں کی بجائے اللہ اس کا فریق مخالف بن جاتا ہے۔

رعایا کے ساتھ حسن سلوک کے بارہ میں اپنے دل سے رعیت کے لیے کینہ و عداوت کی ہر گرہ کو کھول دو۔ اور دشمنی کے ہر رشتہ کو توڑ دو۔

غیر مسلم رعایا کے ساتھ برتاؤ:۔ ان سے اکثر لغزشیں بھی ہوں گی۔ معذوریاں بھی درپیش ہوں گی۔ اور ان کے ہاتھوں کبھی جان بوجھ کر اور کبھی غلطی سے بہت سی خطائیں سرزد ہوں گی۔ ایسے موقعوں پر تم کو چاہیئے کہ تم ان کے دامنوں کو درگذر اور معافی کی دولت سے اس طرح بھر دو جس طرح تم چاہتے ہو کہ اللہ تم کو مغفرت اور درگذر کی دولت سے مالا مال کر دے۔

حکومت اور جہانبانی کا سب سے اہم ستون عدل ہے۔ عدل اور مساوات کے متعلق آپ کے کردار اور گفتار میں بہت سی روشن مثالیں ملتی ہیں۔ آپ کے بھائی عقیل ابن ابی طالب نے بیت المال سے کچھ مدد چاہی تو آپ نے نہایت تلخی سے ان کے سوال کو رد کر دیا۔

یہ تو خیر عدل اور انصاف کی مثالیں تھیں۔ عدل و انصاف سے تجاوز آپ کی خدا ترسی کیونکر گوارا کر سکتی تھی لیکن آپ تو اپنے عمال کو مشکوک اور مشتبہ راہوں پر چلنے پر بھی سخت تنبیہہ فرماتے تھے۔ ایک بار عثمان ابن

حنیف انصاری عامل بصرہ نے کسی شخص کے یہاں کھانے کی دعوت قبول کر لی۔ آپ نے انکو لکھا۔ "مجھے خبر ملی ہے کہ گروہِ اہلِ بصرہ میں سے ایک شخص نے تمہاری کھانے کی دعوت کی، تم نہایت سُرعت سے وہاں پہنچے۔ میرا یہ گمان نہیں تھا کہ تم اس گروہ کی دعوت قبول کروگے جن کے مالدار دعوت میں طلب کیے جائیں اور جن کا فردِ محتاج دعوت سے محروم ہو"

ذرا غور فرمائیے۔ غریبوں سے ہمدردی اور انسانی مساوات کی ایسی درخشندہ مثال آج کی دنیا میں کہیں نظر آتی ہے؟

مالک بن اشتر والے دستور میں عدل کی تاکید ان الفاظ میں کی گئی ہے:-

"دیکھو ان چیزوں میں جن میں تمام لوگوں کے حقوق برابر ہیں خود اپنے کو دوسروں پر ترجیح نہ دو۔" اس خط میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ "اپنے حاشیہ نشینوں میں کسی کے لیے بھی جاگیر وغیرہ نہ لکھو اور ان لوگوں کو یہ توقع قائم کرنے کی ہمت نہ دلاؤ کہ تم ان کے لیے کوئی ایسا انتظام کردوگے۔ جو اُن کے ہمسایوں کو نقصان پہنچانے کا باعث ہو۔ مثلاً کسی نہر کے بارہ میں یا کسی ایسی مشترک چیز کے بارہ میں جس سے سب کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

ایفائے عہد اور دشمن سے بھی ایفائے عہد کے بارہ میں مالک بن اشتر کو یہ ہدایت فرماتے ہیں، اگر کبھی اپنے اور دشمن کے درمیان کوئی معاہدہ کرو اور کسی بات کی ذمہ داری لو تو تم کو اس عہد کو پورا کرنا چاہیے۔

اور عہد کی حفاظت میں اپنی جان کی بھی پروا نہ کرو۔ اور معاہدہ کر چکنے کے بعد اس کے کسی مبہم یا ذو معنی لفظ سے فائدہ اٹھانے کی کبھی کوشش نہ کرو۔"

ان الفاظ میں انسانی حیلہ جو فطرت کی کیسی نباضی ہے اور عہد شکنی کے ہر ممکن راستہ کو کس طرح مسدود کیا گیا ہے۔ کیا یہ حق اندیشی اور اصول پرستی کسی دنیاوی سیاست میں ممکن ہے۔

ان اصولی اور بنیادی امور سے قطع نظر انتظامی امور اور تفصیلات حکومت کے بارہ میں بھی آپ کے خطبات اور مکاتیب آپ کی گہری بصیرت اور وسیع تجربہ کا پتہ دیتے ہیں۔ مالک اشتر کے ہدایت نامہ میں آپ نے رعایا کے سات طبقوں کا ذکر کیا ہے۔ اور ہر ایک کے متعلق دور اندیشانہ اور ہمدردانہ نصیحتیں فرمائی ہیں۔ مثلاً جن طبقوں کا ذکر کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ فوجی

۲۔ دفتر والے

۳۔ صاحبانِ عدالت

۴۔ عمالِ حکومت

۵۔ تجارت پیشہ اور اہلِ حرفہ

۶۔ ٹیکس اور مالگزاری دینے والے۔

۷۔ فقراء اور مساکین۔

ان طبقوں کے بارہ میں عام حسن سلوک کے ساتھ بعض خاص ہدایات

دی گئی ہیں جو بہت دلچسپ اور عملی بھی ہیں۔

فوجیوں کے متعلق ہدایت ہے کہ ان کی تنخواہ اتنی کافی ہو جو انھیں گھربار کی فکر سے بے نیاز کر دے۔ ایک بڑے پتہ کی بات بتائی ہے کہ "جو شخص جس کام کو انجام دے اس کو پہچانتے رہو۔ ایک کام کا سہرا دوسرے کے سر نہ باندھو۔" نیز کسی بڑے آدمی کے چھوٹے کام کو بڑا اور چھوٹے آدمی کے بڑے کام کو چھوٹا نہ سمجھو۔"

صاحبانِ عدالت کے تقرر میں تقویٰ، دیانت، غور و فکر اور معاملہ فہمی کی صلاحیت علم اور بُردباری کو معیار قرار دیا ہے۔ ان کے متعلق بھی ہدایت ہے کہ "ان کی تنخواہ اتنی رکھو جو ان کی ضروریات کو پورا کر دے اور ان کو لوگوں کی حاجت نہ رہے۔" نیز اپنی بارگاہ میں تم ان کا اتنا اعزاز قرار دو جسکی ارکانِ سلطنت میں سے کسی کو بھی اپنے لیے توقع نہ ہو سکے تاکہ انھیں اپنے فیصلوں میں رو رعایت کی ضرورت نہ ہو۔ اور لوگوں کی ضرورت ہو اور لوگوں کی مخالفت کا اندیشہ نہ ہو۔"

عمال و حکام کے متعلق بھی کافی تنخواہ دینے کی ہدایت ہے۔ اور وفادار اور دیانتدار جاسوسوں کے ذریعہ سے ان کے کاموں کی دیکھ بھال کرتے رہنے کا مشورہ۔

اسی طرح مال گذاری دینے والے طبقہ کے مفاد کا خیال رکھنے پر خاص طور سے زور دیا ہے اور ہدایت کی ہے کہ ان پر کسی قسم کی سختی نہ ہو۔ اگر وہ کسی وجہ سے تنگی کا عذر کریں تو مطالبہ میں تخفیف کر دی جائے۔

ماحصل یہ ہے کہ "زمین کی آبادی کی فکر مال گذاری کے وصول کرنے سے زیادہ ہونی چاہئے"۔

اسی طرح تاجروں اور صناعوں سے نیکی اور اچھائی کا برتاؤ کرنے کی ہدایت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ تنبیہ بھی ہے کہ اس طبقہ کے اندر اکثر حرص اور لالچ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے ان کو اتنی ڈھیل نہ دی جائے کہ مخلوق خدا پر تنگی کا باعث ہو۔ مثلاً قیمتیں بڑھنے کی امید پر غلہ کو روک رکھتے یا بہت زیادہ نفع اندوزی سے انھیں روکا جائے۔ ان ہی ہدایات میں ایک یہ بھی ہے کہ قیمتوں پر ایسا کنٹرول ہو جس میں بائع اور مشتری دونوں کا یکساں فائدہ ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی نظر نظم و نسق حکومت میں کتنی دقیقہ رس تھی اور اپنے عہد سے کس قدر آگے۔

آخر میں فقراء و مساکین اور یتیموں اور ضعیفوں کی دیکھ بھال پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ اور اس کو حکومت کی ذمہ داری قرار دیا ہے اس سلسلہ میں یہ ہدایت کی ہے۔ کہ بیت المال اور غلات میں سے ایک حصہ ان کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اور ایک متواضع متقی اور پرہیزگار شخص ان کی دیکھ بھال کے معین کر دیا جائے۔

اس کے علاوہ ہر کام کے لیے ایک ایک شخص کو ذمہ دار بنانے کی ہدایت ہے جو اس شعبہ کی بڑی سے بڑی مہم سے عاجز نہ ہو۔

نیز اس بات کی ہدایت ہے کہ ضرورت مندوں کے لیے ایک

وقت عام دربار کا مخصوص کر دیا جائے۔ جس میں فوج، پولیس، کا پہرہ کچھ نہ ہوتا کہ ہر شخص آزادی سے اپنا مطلب بیان کر سکے۔ حاکم کو یہ بھی ہدایت ہے کہ رعایا سے منہ نہ چھپائے اور اپنے آپ کو دور نہ کھینچے۔

چونکہ ان تمام اعمال و افعال میں تقویٰ لئے الٰہی کی سپرٹ جاری و ساری ہوگی اس لیے ان سب کو عبادت کا درجہ حاصل ہے لیکن پھر بھی حاکم کے لیے ہدایت ہے کہ اپنا کچھ وقت اللہ کے لیے مخصوص رکھے۔ جو نماز وغیرہ کی ادائیگی میں صرف ہو لیکن نماز جماعت میں بھی مخلوق کی اس درجہ رعایت ملحوظ ہے کہ امیر کو ہدایت کی جاتی ہے کہ نماز جماعت کو اتنا طول نہ دے کہ بیماروں یا عجلت والوں کو بار گزرے۔

ان ہدایات کے علاوہ آپ کے خطبات اور مکاتیب بے شمار نصیحتوں اور ہدایتوں سے پُر ہیں جن میں کہیں آپ نے آخرت کا خوف دلا کر اپنے عمال کو ظلم اور ناانصافی سے باز رہنے کی تاکید کی ہے۔ کہیں سپہ سالاروں کو صلح جوئی اور جنگ میں سبقت نہ کرنے کی تلقین ہے کہیں خونِ ناحق پر زبردست تہدید ہے۔ کہیں ایسی عملی ہدایات ہیں جو آپ کی معاملہ فہمی اور مردم شناسی پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً عوام کی فلاح و بہبود کی تاکید کرتے ہوئے مالک بن اشتر کو تحریر فرماتے ہیں :-

"عوام کی ناراضگی خواص کی رضامندی کو بھی بے کار کر دیتی ہے اور خواص کی ناراضگی عوام کی رضامندی کے ساتھ نظر انداز کی جا سکتی ہے۔"

خواص کی ذہنیت کا کس قدر سچا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے :-

"خواص سے زیادہ تمام رعیت میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں

جو حاکم پر آسودگی کی حالت میں زیادہ بار ڈالنے والا اور مصیبتوں کے موقع پر حاکم کی سب سے کم امداد کرنے والا، انصاف کو برا سمجھنے والا اور انتہائی اصرار کے ساتھ مطالبوں کو پیش کرنے والا عطا اور مرحمت پر سب سے کم شکر گذار ہونے والا اور زمانہ کے حوادث اور مصائب پر سب سے کم صبر کرنے والا ہو۔"

اسی طرح مشیروں کے انتخاب کے بارہ میں یہ ہدایت فرماتے ہیں:-

"کبھی کسی کنجوس کو اپنا مشیر نہ بناؤ - اس لیے کہ وہ تمہیں فیض و عطا سے ہٹا دے گا۔ کبھی کسی بزدل سے مشورہ نہ لو، اس لیے کہ وہ بڑے معاملوں میں تمہاری ہمت کو پست کرے گا۔ نہ کسی لالچی کو مشورہ میں داخل کرنا اس لیے کہ وہ تم کو ظلم و ستم کے ساتھ ہوس پوری کرنے پر آمادہ کرے گا۔"

پھر ان صفات کا کیسا فلسفیانہ تجزیہ پیش کیا ہے کہ:-

"کنجوسی بزدلی اور لالچ یہ مختلف خصلتیں ہیں جن میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے اللہ پر بھروسہ نہ کرنا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عملی تفصیلات اور اخلاقی جزئیات کا ذکر کرتے وقت بھی آپ کی نظر ان کے بنیادی پہلو پر رہتی تھی۔ اور وہ بنیاد تھی عقیدۂ توحید۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کا نظریۂ سیاست عہدِ جدید کی عملی سیاست

سے بنیادی اختلاف رکھتا ہے، وہاں مصلحت نوری تھی اور یہاں ڈپلومیسی، وہاں حق و عدل کی راہ میں ہر مفاد قربان تھا اور یہاں محدود نفعوں کے لیے ہر اصول پسِ پشت - وہاں موت سے بے نیازی، دنیا سے بے رغبتی، دوسروں کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے ہر تلخ گھونٹ گوارا تھا - اور یہاں زندگی کی حرص، مادی عیش و عشرت پر فریفتگی اور خیر و شر کو ذاتی منفعت کی ترازو میں تولنے کی کوشش، اب کدھر نور ہے اور کس طرف ظلمت، کس طرف پھول ہیں اور کس طرف کانٹے - یہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

آخر میں اقبال مرحوم کے تین شعروں پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں میرے خیال میں یہ شعر مولیٰ علیؑ کے نظریۂ سیاست کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں :-

ہے وہی تیرے زمانہ کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

جو حاکم پر آسودگی کی حالت میں زیادہ بار ڈالنے والا اور مصیبتوں کے موقع پر حاکم کی سب سے کم امداد کرنے والا، انصاف کو بُرا سمجھنے والا اور انتہائی اصرار کے ساتھ مطالبوں کو پیش کرنے والا عطا اور مرحمت پر سب سے کم شکرگذار ہونے والا اور زمانہ کے حوادث اور مصائب پر سب سے کم صبر کرنے والا ہو۔"

اسی طرح مشیروں کے انتخاب کے بارہ میں یہ ہدایت فرماتے ہیں:۔

"کبھی کسی کنجوس کو اپنا مشیر نہ بناؤ۔ اس لیے کہ وہ تمھیں فیض و عطا سے ہٹا لے گا کبھی کسی بزدل سے مشورہ نہ لو، اس لیے کہ وہ بڑے معاملوں میں تمھاری ہمت کو پست کرے گا۔ نہ کسی لالچی کو مشورہ میں داخل کرنا اس لیے کہ وہ تم کو ظلم و ستم کے ساتھ ہوس پوری کرنے پر آمادہ کرے گا۔"

پھر ان صفات کا کیسا فلسفیانہ تجزیہ پیش کیا ہے کہ:۔

"کنجوسی بزدلی اور لالچ یہ مختلف خصلتیں ہیں جن میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے اللہ پر بھروسہ نہ کرنا۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عملی تفصیلات اور اخلاقی جزئیات کا ذکر کرتے وقت بھی آپ کی نظر ان کے بنیادی پہلو پر رہتی تھی۔ اور وہ بنیاد تھی عقیدۂ توحید۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا علیؑ ابن ابی طالبؑ کا نظریہ سیاست عہدِ جدید کی عملی سیاست

اسلامی اور بلادِ اسلامی جیسے کوفہ، بصرہ، شام، مصر میں جا کر اس نے پروپیگنڈہ کیا کہ :۔

۱۔ جس طرح حضرتِ عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں واپس آئیں گے اسی طرح ہمارے پیغمبرؐ بھی دوبارہ تشریف فرما ہوں گے۔

۲۔ علیؑ ابن ابی طالب حضرت محمد مصطفےٰؐ کے وصی ہیں جس طرح ہر نبی کے لیے ایک وصی ہوا کیا، علیؑ خاتم الاوصیاؑ ہیں۔ جس طرح حضرت سرورِ کائنات خاتم الانبیاء ہیں۔

۳۔ حضرت عثمان غاصب ہیں، انھوں نے وصیِ پیغمبر کا حق غصب کیا، لہٰذا وہ ظالم ہیں اور ان سے جنگ کرنا واجب ہے تاکہ حق دار کو حق واپس مل جائے۔"

اس قصہ کے ہیرو کا نام جو ایک افسانوی شخصیت ہے مورخین نے عبداللہ ابن سبا رکھا ہے اور اسے زنِ حبشیہ کے فرزند کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مورخین کا بیان ہے کہ :۔

"ابن سبا نے بلادِ اسلامیہ میں اپنی طرف سے پروپیگنڈہ کرنے والے بھیجے اور انھیں سمجھایا کہ وہ ظاہراً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا مشغلہ بنائیں۔ اور مخفی طور پہ حکام کے خلاف عوام کو برانگیختہ کریں، تھوڑے ہی دنوں میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اسکی پیرو ہو گئی۔ ان ہی مسلمانوں میں صحابہ کرام بھی تھے۔ اور جلیل القدر تابعین بھی۔ جیسے ابوذر، عمار یاسر، محمد

بن ابی حذیفہ، عبدالرحمٰن بن عدیس بلوی، محمد بن ابی بکر، صعصعہ بن ھو جیان عبدی، مالک اشتر اور ان ہی جیسے صالح و دیندار مومنین"

مورخین کا یہ بھی بیان ہے کہ :-

"سبائین جہاں بھی ہوتے لوگوں کو وہاں کے حکام کے خلاف برانگیختہ کرتے، کیونکہ ان کے سردار عبداللہ ابن سبا کا اصل مشن ہی یہ تھا اور حکام کے عیوب خطوں میں لکھ کر دوسرے شہروں میں روانہ کرتے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سبائین کے بھڑکانے سے مسلمانوں کی بہت سی جماعتیں اٹھ کھڑی ہوئیں، مدینہ پر چڑھ دوڑیں اور حضرت عثمان کا محاصرہ کر کے ان کو قتل کر ڈالا۔ یہ تمام باتیں سبائین کی رہنمائی میں انجام پذیر ہوئیں اور یہ لوگ ہر ہنگامے میں برابر کے شریک رہے۔"

مورخین یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ :-

"جب مسلمانوں نے حضرت علیؑ کی بیعت کر لی اور طلحہ و زبیر جنگِ جمل کے لیے بصرہ چلے گئے، سبائیوں نے دیکھا کہ دونوں لشکر کے سردار باہمی سمجھوتہ کی کوشش کر رہے ہیں، اگر یہ سمجھوتہ ہو گیا تو لامحالہ سبائین ہی حضرت عثمان کے قتل میں ماخوذ ہوں گے۔ انھوں نے رات کو اکٹھا ہو کر طے کیا کہ دونوں لشکروں میں

سازش کا جال پھیلایا جائے۔ اور صبح سویرے جنگ چھیڑ دی جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ سبائیوں کو منہ اندھیرے ہی جبکہ دونوں لشکر نیند کے آغوش میں تھے اس تدبیر کے عمل میں لانے کا موقعہ مل گیا۔ حضرت علیؓ کے لشکر میں جو سبائی تھے ان میں سے کچھ علیحدہ ہوکر پوشیدہ طریقہ سے بصرہ کی فوج میں جا ملے اور وقتِ مقررہ پر اِدھر کے سبائیوں نے اُدھر کے سبائیوں پر حملہ کر دیا۔ اور اُدھر کے سبائیوں نے اِدھر کے سبائیوں پر دھاوا بول دیا۔ دونوں لشکروں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اور لشکروں کے سردار بھی گھبرا گئے۔ ہر ایک نے یہی سمجھا کہ ہمارے حریف نے زیادتی کی ہے۔"

مؤرخین کہتے ہیں کہ:-

"بصرہ کی جنگ جو جنگِ جمل کے نام سے مشہور ہے اسی طرح برپا ہوئی۔ دونوں لشکروں کے سرداروں کو اس کا پہلے سے کوئی علم نہ تھا، نہ جنگ کرنے کی رائے ہی تھی"

داستان گو اور افسانہ نویس سبائیوں کا قصہ یہیں پہ لا کر ختم کر دیتے ہیں سبائیوں کا انجام کیا ہوا؟ وہ آخر گئے کہاں؟ جنگِ جمل کے بعد انھیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اس کا کوئی ذکر نہیں[1] یہ ہے افسانۂ عبداللہ ابن سبا، سچ ہے ؏ "جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے"

---

[1] اموی دورِ خلافت حصہ اول صـ۱۸۸ تا ۱۹۰

ہم اس قصہ کی افسانوی حیثیت پر اپنی اسی تاریخ کی دوسری جلد میں اشارہ کر چکے ہیں [1]

عبداللہ ابن سبا کی افسانوی حیثیت پر مصر کے سنی المذہب نامور فلسفی، مشہور ادیب و مورخ اور معروف مفکر ڈاکٹر طہٰ حسین صاحب اس طرح روشنی ڈال رہے ہیں :-

"جنگ صفین میں سبائیوں اور ابن سبا کے ذکر سے مورخین نے جو اعراض کیا ہے اس سے کم سے کم یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ ابن سبا بالکل فرضی اور من گھڑت چیز ہے اور جب فرقہ شیعہ اور دوسرے اسلامی فرقوں میں جھگڑے چل رہے تھے، اس وقت اسے جنم دیا گیا۔ شیعوں کے دشمنوں کا منشا یہ تھا کہ شیعوں کے اصولِ مذہب میں یہودی عنصر داخل کر دیا جائے یہ سب کچھ بالکل زبردست چال بازی اور مکر و فریب کی صورتیں تھیں، محض شیعوں کو زچ کرنے کے لیے ایسا کیا گیا، ورنہ اگر ابن سبا کا معاملہ کسی صحیح بنیاد پر مبنی ہوتا اور معتبر تاریخ سے اس کا پتہ چلتا ہوتا تو لازمی طور پر اس فرقہ کا اثر و نشان اور اس کا مکر و فریب جنگ صفین میں ضرور ظاہر ہوتا خصوصاً معاملہ تحکیم کے موقعہ پہ جب اصحابِ علیؑ میں اختلاف رونما ہوا اس وقت بھی فطری طور پر اس فرقہ کا وجود ہونا چاہیے تھا، مگر ہم

[1] اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد ۲ صفحہ ۳۹۷ - ۳۹۸ طبع ۱۹۵۷ء

خوارج کے معاملہ میں ابن سبا کا کوئی وجود نہیں پاتے ۔ تمام تاریخیں اس موقعہ پر اس کے ذکر سے خاموش ہیں۔ اس خاموشی کی کیا توجیہہ کی جاسکتی ہے ۔ اور واقعۂ صفین اور خوارج کے موقعہ پر ابن سبا کے غائب ہو جانے کی کیا وجہ بیان کی جاسکتی ہے ۔ ہم تو صرف ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور وہ یہ کہ ابن سبا صرف وہمی چیز ہے اور اگر بالفرض اس نام کا کوئی شخص موجود بھی رہا تو اسے ایسی اہمیت ہرگز حاصل نہیں کہ جیسی مورخین تصویر کشی کرتے ہیں ۔ اور قتل عثمان اور حضرت علیؓ کی خلافت کے پہلے سال میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن سبا ایک ہوا ہے جسے شیعوں کے دشمنوں نے محض شیعوں کے لیے تلاش کیا اور خوارج کے لیے نہیں ۔ کیونکہ خوارج تو مسلمانوں کی جماعت میں داخل نہ تھے ۔ اور نہ انھیں خلافت وسلطنت سے کوئی غرض تھی ۔ وہ تو ایسی قوم تھی جو کہ ہر خلافت پر غضبناک اور ہر حکومت کی باغی تھی ۔ وہ خلفاء وسلاطین سے اتنا آمادۂ پیکار رہا کرتے جتنی بھی انھیں گنجائش نصیب ہوتی ۔ پھر ان خوارج کی بعد میں کچھ اہمیت بھی باقی نہ رہی ۔ بنی امیہ کے ختم ہوتے ہوتے وہ بھی برائے نام باقی رہے ۔ بنی عباس کی حکومت آتے آتے ان کا معاملہ انتہائی ضعیف ہو گیا ۔ اب صرف متکلمین کی کتابوں میں ان کا وجود باقی ہے لہٰذا وہ خوارج بہرحال ایسی جماعت

نہیں تھے کہ ان سے اختلاف و نزاع اتنی شدید جدال کی نوبت تک پہنچ جاتی۔ جیسا کہ شیعوں کے ساتھ نوبت آئی[1]
اس کے بعد ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:۔
"سچی بات یہ ہے کہ بنی عباس کی سلطنت کے استوار ہو جانے کے بعد شیعہ اور سنّی کی باہمی عداوت میں نت نئے رنگ جنگ و جدال، پروپیگنڈہ اور تبلیغ کے بدلے مکر و فریب اختراع و افترا کی بہتات ہو گئی۔ اتنی کہ انصاف پسند مورخ کو لازم ہے کہ جب وہ شروع زمانہ اسلام کی تصویر کشی کرنے بیٹھے تو انتہائی احتیاط سے کام لے۔ اس سے بڑھ کر اور آسان بات کیا ہو گی کہ عراق والے شام والوں کو جھوٹی تہمت لگائیں اور شام والے عراق والوں پہ بہتان تراشیں۔ خصوصاً اس وقت جبکہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ مدت طولانی ہو چکی ہے اور صحیح واقعات کی چھان بین بجد دشوار ہے۔ جو لوگ پیغمبر خدا پر تہمت لگانا اور حضرت کی طرف منسوب کر کے جھوٹی حدیثیں گھڑنا، اپنے لیے مباح جانتے ہیں۔ وہ شام و عراق والوں کے خلاف باتیں گھڑنے میں کونسی دشواری محسوس کر سکتے ہیں۔"
ڈاکٹر طٰہٰ حسین اس کے بعد لکھتے ہیں:۔
"جو کچھ بھی ہو علامہ بلاذری نے نہ تو حضرت عثمان کے زمانے

---

[1] الفتنۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۹۸، ۹۹، ۱۰۰۔

کے فتنہ و فساد میں نہ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت کے تذکرہ کے موقعہ پر عبد اللہ ابن سبا کا ذکر کیا، طبری اور طبری کے وہ رواۃ جن سے طبری نے اس قصہ کو حاصل کیا۔ نیز وہ مورخین جنھوں نے بعد میں طبری سے اس قصہ کو لیا سبھی ابن سبا اور اس کے اصحاب کے قصہ کو حضرت عثمان کے زمانہ کے فتنہ و فساد کے ضمن میں اور حضرت علیؓ کی خلافت کے پہلے سال کے تذکرہ میں بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد گول کر جاتے ہیں کسی کو بھی ابن سبا اور اس کے اصحاب یاد نہیں رہتے۔ محدثین و مناظرین بھی طبری کے خوشہ چینیوں کے ہم نوا ہیں۔ طبری کے بیان کیے ہوئے قصہ کو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں، بس فرق یہ ہے کہ محدثین و ارباب مناظرہ طبری کی بیان کی ہوئی باتوں کے علاوہ اپنی طرف سے بھی ایک نرالی بات اضافہ کرکے بیان کرتے ہیں جس میں وہ منفرد ہیں اور یہ کہ ابن سبا اور اس کے پیرو حضرت علیؑ کی الوہیت کے قائل ہوگئے اور علیؑ نے ان کو آگ میں جلا دیا، لیکن اگر آپ تاریخ کی کتابوں میں محدثین و مناظرین کے اس چھوڑے ہوئے شگوفے کو تلاش کیجیے تو کہیں پتہ بھی نہ ملے ہیں تو کہیں سے بھی معلوم نہ ہو سکا کہ حضرت علیؑ کے مختصر زمانہ خلافت میں کس سال ان غالیوں کا فتنہ رونما ہوا۔ شروع زمانہ اسلام میں لوگوں کو آگ میں جلا دینا اور پھر وہ بھی

اصحاب پیغمبر اور صالح مومنین کی موجودگی میں ایسی معمولی بات نہیں کہ مورخ اس سے غافل رہتے، اور اسے اپنی کتابوں میں ذکر نہ کرتے، اور ماہ وسال کی تعیین نہ کرتے بلکہ بالکل ہی مکمل سکوت اختیار کرتے، مورخین کی تمام لمبی چوڑی داستان کا خلاصہ بلاذری نے مختصر لفظوں میں یہ بیان کیا ہے کہ کوفہ کے کچھ لوگ مرتد ہوگئے، حضرت علیؑ نے انھیں قتل کرڈالا۔ مرتد ہوجانے والوں کے متعلق اسلام نے جو حکم دیا ہے وہ ہر شخص جانتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مرتد شخص سے پہلے توبہ کرائی جائے گی۔ اگر اس نے توبہ کرلی تو جاں بخشی کردی جائے گی۔ اگر توبہ نہیں کی تو قتل کرڈالا جائے گا۔ لہٰذا اگر حضرت علیؑ کے زمانے میں کچھ لوگ مرتد ہوگئے ہوں اور آپ نے حکم اسلام پر عمل کرتے ہوئے انہیں قتل کرڈالا ہو تو کون سی تعجب کی بات ہے۔ بشرطیکہ یہ قصہ صحیح بھی ہو۔ اگرچہ بلاذری نے اس قصہ کو بیان کرتے ہوئے مرتد ہوجانے والوں میں سے کسی کا نام نہیں بتایا، اور نہ اسکی صراحت کی کہ یہ واقعہ کب پیش آیا تھا؟ بلاذری نے مطلقاً یہ واقعہ بیان کردیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود بھی اس واقعہ کا یقین نہیں رکھتے تھے[1]"

یہی مصری محقق ڈاکٹر طٰہٰ حسین الفتنۃ الکبریٰ کی پہلی جلد میں بھی

---

[1] الفتنۃ الکبریٰ تالیف ڈاکٹر طٰہٰ حسین مطبوعہ مصر ج ۲ ص ۹۴ تا ۱۰۲

لکھ چکے ہیں :-

"میرا خیال یہ ہے کہ جو لوگ ابن سبا کے معاملہ کو اس حد تک بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں وہ اپنے اوپر بھی انتہائی زیادتی کرتے ہیں اور تاریخ پر بھی۔ سب سے پہلے تو ہماری نظر اس بیان پر پڑتی ہے کہ متقدمین علماء کی بڑی بڑی کتابوں میں جو بعد کے مصنفین کا ماخذ ہیں ابنِ سبا کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ نہ تو ابن سعد نے عہد عثمان کے واقعات اور ان سے لوگوں کی برگشتگی و برہمی کے سلسلہ میں ابن سبا کا تذکرہ کیا۔ اور نہ علامہ بلاذری نے اپنی کتاب انساب الاشراف میں۔ حالانکہ ہمارے خیال میں بلاذری کی کتاب تمام مصادر و ماخذ میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور اس میں حضرت عثمان کے عہد کے حالات اور ان لوگوں کی مخالفت اور ان سے ناراضی کا بیان بھی کافی تفصیل سے مذکور ہے۔ صرف علامہ طبری نے ابن سبا کے واقعات کو سیف بن عمر کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ اور طبری کے بعد جتنے مورخین آئے سبھی نے طبری ہی سے ابن سبا کے واقعات نقل کیے ہیں ہم نہیں کہہ سکتے کہ حضرت عثمان کے زمانے میں ابن سبا کو کوئی اہمیت تھی بھی یا نہیں لیکن ہمیں اس بات کا ضرور یقین ہے کہ بفرضِ محال اگر اسے کچھ اہمیت حاصل بھی تھی تو یہ اہمیت کچھ وزن نہیں رکھتی تھی اور نہ حضرت عثمان کے عہد کے مسلمان ایسے

سادہ لوح سمجھتے کہ ایک یہودی شخص جو تازہ بتازہ مسلمان ہوا تھا وہ ان کے عقول و معتقدات سے کھیلنے لگتا۔ یہ یہودی پوری طرح مسلمان بھی نہ ہوا تھا کہ فتنہ و فساد پھیلانے اور اطراف و اکناف میں مکرو فریب کا جال بچھانے پر کمربستہ ہو گیا۔ اگر عبداللہ بن عامر گورنر بصرہ یا معاویہ گورنر شام اس نام نہاد مسلمان کو جو پہلے یہودی تھا، محض ازراہِ فریب مسلمان ہوا گرفتار کر لیتے تو یقیناً ایک یا دونوں حضرت عثمان کو اسکی شرارتوں کی اطلاع لکھ بھیجتے اور عامر یا معاویہ یا دونوں ہی اس کی گوشمالی اچھی طرح کر دیتے یا عبداللہ بن سعد بن ابی سرح گورنر مصر ہی اس کا قصہ پاک کر دینے کے لیے کیا کم تھا، اس نے تو محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ تک کو ختم کر دیا ہوتا مگر حضرت عثمان کے خوف سے باز رہا، لہٰذا جو شخص محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ ایسے اشخاص کو نشانۂ تشدد بنانے کے لیے اور بعض روایات کے مطابق عمار یاسر کو بھی مبتلائے عقاب کرنے کے لیے حضرت عثمان سے اجازت مانگ سکتا ہے اس کے لیے ایک یہودی شخص کو کچلنے میں کیا چیز مانع ہو سکتی تھی اور یہودی بھی ایسا جس نے ظاہری طور پر مسلمان ہو کر مسلمانوں میں تفرقہ پردازی کا تہیہ کیا اور ان کے ایمان بلکہ ان کے دین تک میں انھیں مشکوک بنا دیا، اس سے بڑھ کر آسان بات اور نہیں ہو سکتی کہ حضرت

عثمان کے عمال و حکام اس نام نہاد مسلمان ابن سبا کی تلاش و جستجو کرتے، اسے پکڑ کر خوب اذیتیں پہنچاتے، حضرت عثمان کے عمال، حکومت کے مخالفین کی تلاش و جستجو کرنے، انھیں وطن سے نکال باہر کرنے اور معاویہ یا عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کے پاس بھیج دینے کے عادی بھی تھے۔

اور سب سے بڑھ کر حیرت انگیز اور تعجب خیز جو بات عبداللہ بن سبا کے متعلق بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ابن سبا ہی نے جناب ابوذر کو معاویہ پر اعتراضات تعلیم کیے، معاویہ کے یہ کہنے پر کہ ان المال مال اللہ (مال سب خدا کا مال ہے) ابن سبا نے جناب ابوذر کو سکھایا کہ آپ یہ جواب دیجیے کہ انہ مال المسلمین نہیں، یہ مسلمانوں کا مال ہے۔

یہاں تک کہا جاتا ہے کہ جناب ابوذر کی امرا و اغنیا کی مخالفت اور سونا چاندی ذخیرہ کرنے والوں کو آتشِ جہنم کی دھمکی اور ان کی تمام مذمت و تنقید یہ سب ابن سبا کی تعلیمات کا نتیجہ تھیں۔

جناب ابوذر پر محدثین نے یہ جو زیادتی کی ہے اپنا جواب نہیں رکھتی ابوذر جیسا جلیل القدر صحابی اور اسے ایک نو مسلم سکھائے کہ مالداروں پر فقیروں کا بھی حق ہے۔ اور جو لوگ سونا چاندی خزانوں میں جمع کر کے رکھتے ہیں اور راہِ خدا میں صرف نہیں کرتے خدا انھیں دردناک عذاب کی بشارت دیتا ہے۔ نیز یہ کہ وہ مال جو دشمنوں پر فتحیاب ہو کر حاصل کریں یا

جو مال اہلِ اسلام بیت المال کو بطور زکوٰۃ یا خراج ادا کریں یا کفار ذمی بیت المال میں جو جزیہ و خراج داخل کریں وہ سب مسلمانوں کا مال ہے۔ مسلمانوں کو اس کی اطلاع دینا بلکہ فوراً مسلمانوں پر تقسیم کر دینا واجب ہے۔

ابوذر اس کے محتاج نہ تھے کہ ایک نومسلم انھیں تعلیم دے۔ انھیں وہ حقائق تعلیم کرے جو دین اسلام کی ابتدائی چیزیں ہیں، ابوذر تمام انصار سے پہلے مسلمان ہوئے اور بہت سے مہاجرین سے پہلے ایمان لائے تھے مدت دراز تک پیغمبرؐ کی صحبت میں رہے، قرآن بہت اچھی طرح حفظ کیا پیغمبرؐ کی بے شمار حدیثیں سنیں اور بہ تیقن ان کی روایت کی اور حضرت ابوبکر و عمر کی جو روش اموال و حقوق کے متعلق رہی وہ اپنی آنکھوں سے دیکھی اور حلال و حرام کو جس طرح دیگر صحابۂ کرام نے پہچانا انھوں نے بھی پہچانا، لہذا جو لوگ یہ روایت کرتے ہیں۔ کہ عبداللہ بن سبا ابوذر سے ملا اور اپنے بعض معتقدات ان کے ذہن نشین کیے وہ اپنے نفس پر بھی ظلم کرتے ہیں اور جناب ابوذر پر بھی۔ اور عبداللہ ابن سبا کو اس اونچے درجہ پر پہنچا دیتے ہیں جس کا خود ابن سبا نے بھی کبھی تصور نہ کیا ہوگا۔

راویان حدیث بیان کرتے ہیں کہ شام سے مدینہ واپس آنے کے بعد ایک دفعہ حضرت ابوذر نے حضرت عثمان سے کہا، مسلمانوں کے لیے یہی کافی نہیں کہ بس وہ زکوٰۃ دے دیں بلکہ ان کو چاہیے کہ حاجت مندوں کو بھی دیں بھوکوں کو بھی کھلائیں اور راہِ خدا میں اپنا مال خرچ کریں۔ اسوقت کعب الاحبار موجود تھے، انھوں نے ابوذر کی یہ گفتگو سن کر کہا کہ جو شخص فریضہ ادا کر دے بس اتنا

ہی اس کے لیے کافی ہے۔ اس پر حضرت ابوذر غضبناک ہو گئے اور بولے اے یہودیہ عورت کے فرزند! تمھیں اس سے کیا ربط؟ کیا تم ہمیں ہمارے دین کی تعلیم دینا چاہتے ہو؟ حضرت ابوذر کو تو یہاں تک گوارا نہ ہوا تھا کہ کعب الاحبار دین کی باتیں انھیں بتائیں بلکہ مسلمانوں کے معاملات میں اپنی رائے سے دخل دیں اور اس پر انھوں نے اپنے عصا سے انھیں مارا بھی۔ حالانکہ بہ نسبت ابن سبا کے کعب الاحبار کو اسلام لائے ہوئے مدتیں گزر چکی تھیں، انھوں نے مدینہ میں ہی سکونت اختیار کر لی تھی اور صحابہ پیغمبرؐ کے درمیان صبح و شام ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان کی صحبت میں ہر وقت رہتے تھے۔ برخلاف اسکے عبداللہ ابنِ سبا سے اسلام کے بنیادی مسائل اور قرآن کے اصولی احکام سیکھنے کے لیے تیار ہو گئے؛ پیغمبرؐ کے جلیل القدر صحابی کی یہ بات کتنی حیرت خیز ہے کہ کعب سے دینی امور میں بحث و تکرار تو انھیں گوارا نہ تھی اور ابن سبا کی باتیں سیکھنی دل سے پسند تھیں، میرا قوی گمان یہ ہے کہ عبداللہ ابن سبا کے متعلق جو باتیں بیان کی جاتی ہیں اگر وہ صحیح بھی ہوں، جو کچھ کہا سو کہا، جو کچھ کیا سو کیا۔ اس وقت جب فتنہ رونما و اختلاف پیدا ہو چکا تھا، اس نے فتنہ کی آگ کو صرف بھڑکایا تھا، سلگایا نہیں تھا، اس طرح میرا قوی گمان ہے کہ امویوں اور عباسیوں کے دورِ حکومت میں شیعوں کے

دشمنوں نے عبد اللہ ابن سبا کے معاملہ میں بہت مبالغہ آمیزی کی اس کے حالات بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیے، اس سے ایک فائدہ تو یہ مدِ نظر تھا کہ حضرت عثمان اور ان کے عمال کی طرف جو خرابیوں کی نسبت دی جاتی ہے اور ناپسندیدہ باتیں جو ان کے متعلق مشہور ہیں ان کے بارہ میں لوگ شک و شبہ میں پڑ جائیں اور دوسرے یہ کہ علیؑ اور ان کے شیعہ لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہوں، نہ معلوم شیعوں کے دشمنوں نے شیعوں پہ کتنے غلط الزامات لگائے اور نہ جانے شیعوں نے کتنی غلط باتیں اپنے دشمنوں کی طرف عثمان وغیرہ کے معاملے میں منسوب کیں۔

ہمارے لیے اس مرحلہ پہ احتیاط بہت ضروری ہے۔ ہم صدرِ اوّل کے مسلمانوں کو اس سے کہیں بلند و برتر سمجھتے ہیں کہ یمن سے آنے والا ایک شخص جس کے ماں باپ یہودی تھے۔ جس کی ماں حبشن تھی جو مدتوں یہودی رہ کر دھوکہ فریب کی خاطر مسلمان ہوا تھا، ان کے دین و انتظامِ مملکت کا مذاق اڑائے، ان کی عقل و دولت سے کھل کھیلے اور اسے اپنے مقاصد میں اتنی خاطر خواہ کامیابی ہو کہ سلطنت کا تختہ الٹ دے اور مسلمانوں کو ان کے خلیفہ سے اتنا برگشتہ کر دے کہ وہ اپنے ہاتھوں ان کے قتل پر آمادہ ہو جائیں۔ یہ سب باتیں عقل میں نہیں آتیں، نہ پرکھنے پہ درست قرار پاتی ہیں۔ نہ ان پر تاریخ کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے اصل بات

یہ ہے کہ اس وقت کی اسلامی زندگی کے حالات ہی کچھ اس کے مقتضی تھے کہ لوگوں کی رائیں مختلف، خواہشیں جدا گانہ ہوں اور متضاد سیاسی جماعتیں ظہور میں آئیں، پرانے زمانے کے لوگ جو ارشاداتِ قرآنی و نبوی اور سیرۃ شیخین کے پابند تھے، وہ بہت سے ناپسندیدہ امور رونما ہوتے دیکھتے اور چاہتے تھے کہ ان کا اسی طرح سامنا کیا جائے جس طرح حضرت عمر سامنا کرتے تھے دور اندیشی، تشدد، ضبطِ نفس اور رعایا پر سختی کے ساتھ اور نوجوان و نوخیز لڑکے وہ قریش کے ہوں یا دیگر قبائل کے وہ ان نئے حالات کا نئے نفوس کے ساتھ استقبال کرتے جس میں طمع بھی ہوتی سرکشی بھی، اپنی برتری کا احساس بھی اور لمبی چوڑی آرزوئیں بھی ان کی ہمتیں بھی غیر معمولی طور پر بلند و بالا تھیں، اسی وجہ سے ان میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا جذبہ تھا، بھڑ جانے کی امنگ تھی۔ صرف حکومت کے عہدوں کے لیے نہیں، بلکہ حکومت اور ہر چیز کے لیے نئے حالات تھے، ایسے کہ جو جوان و پیر دونوں کو ایک رنگ میں رنگ دیں، ممالک جعفر اور دھڑ فتح ہونے جا رہے تھے، ہر جانب سے بے شمار دولت سمٹ سمٹ کر آ رہی تھی لہٰذا اگر وہ ان ممالک مفتوحہ کے لیے ان کے اموال خراج سے فائدہ اٹھانے کے لیے باہم مقابلہ کرتے تو کون سی تعجب کی بات تھی۔ ابھی تو بہت سے شہر ایسے

بھی باقی تھے جو فتح نہیں ہوئے تھے۔ ہر جہت سے ان کی کوشش تھی کہ جو ممالک باقی رہ گئے ہیں وہ بھی ہم فتح کریں۔ اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو اس وقت کے مسلمان دنیا کے طلبگار تھے، یا دین کے، دونوں ہی صورتوں میں کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ممالک کی فتح کے لیے بے چین اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش نہ کرتے۔ طالبِ دنیا تھے تو فاتح بننے کا شرف اور مالِ غنیمت ہی کیا کم وجہ کشش تھا، اور اگر طالبِ دین تھے تو جہاد کا ثواب اور غازی بننے کی فضیلت کیا کم تھی؟ پھر نہ تو تعجب خیز ہے کہ اتنی بڑی سلطنت اور اس بے پناہ دولت کے انتظام میں اختلاف رونما ہو، نہ ہی اچنبھے کی بات ہے کہ انصار اور دیگر قبائل کے نوجوان قریش کے نوجوانوں پر بازی لے جانے کے خواہاں ہوں نہ یہ تعجب انگیز تھی کہ ان کے دلوں میں غیظ و غضب، حزن و اندوہ کا طوفان برپا ہو، جب وہ یہ دیکھتے ہوں کہ خلیفۂ وقت ہماری ترقیوں کی راہ میں حائل ہیں۔ وہ بڑے بڑے عہدے صرف قریش اور ان میں بھی خاصکر بنی امیہ کو دیتے ہیں۔

اس حقیقت میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں کہ حضرت عثمان نے سعد بن ابی وقاص کو معزول کر کے ولید اور سعید بن عاص کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا۔ ابو موسیٰ اشعری کو معزول کر کے عبداللہ ابن عامر کو گورنر بنایا۔ ملکِ شام پورا معاویہ کے حوالے کر دیا اور تقریباً

خود مختار اسٹیٹ کی حیثیت دے دی ۔ حالانکہ اسی شام میں کئی کئی عامل مقرر ہوا کرتے تھے ۔ جن میں کچھ قریش کے ہوتے کچھ دوسرے قبائل کے ۔ عمرو عاص کو معزول کر کے عبداللہ بن ابی سرح کو گورنر مقرر کیا یہ تمام جدید گورنر و حکام حضرت عثمان کے قریبی رشتہ دار تھے کوئی مادری بھائی تھا تو کوئی رضاعی بھائی ۔ کوئی ماموں تھا تو کوئی چچا یا کوئی دور کا رشتہ دار تھا ۔ یہ تمام حقائق ایسے ہیں جن سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ابن سبا نے لوگوں کو اس بہلانے سے بھڑکایا ہو کہ انھوں نے فلاں کو معزول کیا فلاں کو حاکم بنایا ، ہر زمانے کا دستور رہا ہے کہ ملوک و سلاطین نے جب اپنے رشتہ داروں کو ترجیح دی اپنے عزیزوں کو کلیدی عہدے دیئے تو رعایا میں شورش پیدا ہو گئی ، احتجاج کی صدائیں بلند ہونے لگیں ۔ حضرت عثمان کی رعایا دنیا سے نرالی نہ تھی پہلے زمانہ کے لوگ جن باتوں کو پسند یا ناپسند کرتے آئے وہی انھوں نے بھی کیا ۔"[1]

یہ تو آپ نے مصر کے محقق ڈاکٹر طہٰ حسین صاحب کی تحقیقات پر سرچ کا مطالعہ کیا ، اب عراق کی تحقیق پر بھی غور فرمایئے : ۔ محقق عصر حاضر حضرت علامہ الشیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء مجتہد اعلم اعلی اللہ مقامہ اپنی شہرہ آفاق کتاب " اصل الشیعہ واصولہا " میں تحریر فرماتے ہیں : ۔

---

[1] الفتنۃ الکبریٰ جلد اول عثمان صفحہ ۱۳۲ تا صفحہ ۱۳۴

"عبداللہ ابن سبا، مجنون عامری، ابو الہلال، یہ داستان سرادل کے خیالی ہیرو ہیں، اموی اور عباسی سلطنتوں کے وسطی دور میں عیش و عشرت اور لہو ولعب کو اتنا فروغ حاصل ہوگیا تھا کہ فسانہ گوئی محل نشینوں اور آرام طلبوں کا جزوِ زندگی بن گئی۔ چنانچہ اس قسم کی کہانیاں بھی ڈھل گئیں[1]"

علامہ محمد حسین آل کاشف الغطا مجتہد اعظم عراق اعلی اللہ مقامہٗ صرف دنیائے شیعیت ہی میں عظیم الشان بلندی کے مالک نہ تھے۔ بلکہ اہل سنت میں بھی نہایت ہی مقبول، ہر دلعزیز اور پسندیدہ تھے۔ دنیا کی تمام بڑی شخصیتیں مرحوم کی معترف تھیں۔ عجم و عرب ہندوستان و پاکستان تمام میں آپ کی علمی بلندی کا شہرہ تھا۔ مصر کی ازہر یونیورسٹی کے بانی شیعہ تھے۔ اس کے باوجود وہاں نہ شیعہ رہ سکتا تھا، اور نہ وہاں تعلیم حاصل کر سکتا تھا۔ یہ علامہ موصوف ہی کا کام تھا کہ انھوں نے اپنے علمی تبادلۂ خیالات کی وجہ سے حکومت کو اس امر پہ مجبور کر دیا۔ کہ وہ شیعوں کو مرا ہے اور علماء کو اس پر آمادہ فرما دیا کہ ازہر یونیورسٹی میں نہ صرف شیعہ تعلیم حاصل کریں بلکہ ان کے مذہب کو تسلیم کیا جائے اور ان کی فقہ وہاں داخلِ نصاب کی جائے۔ چنانچہ بحکم مفتیٔ مصر علامہ شلتوت شیعوں کی کتاب فقہ، مختصر النافع اور شرحِ لمعہ داخلِ نصاب ہوئیں۔

۱۹۵۱ء کا ذکر ہے کہ علامہ موصوف حکومتِ پاکستان کے زیرِ اہتمام "اتصالِ علماء" کی دعوت پر کراچی تشریف لائے۔ آپ کی علمی بلندی کا اسی سے

---

[1] "اصل الشیعہ و اصولہا" صہ ۲۵ - "الغفاری" صہ ۲۷۹

اندازہ ہو سکتا ہے کہ ممالکِ اسلام کے آئے ہوئے علماء کی موجودگی میں جلسہ کی صدارت علامہ موصوف نے ہی فرمائی بعد تمام مذاہبِ عالم کے علماء کو نماز جماعت آپ ہی نے پڑھائی ہے[1]

علامہ عبداللہ السبتی اپنی کتاب "ابوذر الغفاری" میں لوگوں کے اس الزام کے حوالے سے کہ حضرت ابوذر پر عبداللہ ابن سبا کا تسلط تھا، تحریر فرماتے ہیں:-

"ان عبد اللہ ابن السبا الرجل الخیالی" کہ عبداللہ ابن سبا جو کہ ایک خیالی اور فرضی شخصیت ہے، ہم فی الحال اس پر بحث کر کے وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے، ہم چاہتے ہیں کہ اصل موضوع یعنی حضرت ابوذر کے حالات پر روشنی ڈالیں"[2]

برِ عظیم پاک و ہند کے یگانہ محقق حضرت مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ کراروی مدظلہ العالی علی رؤس المعالی اس سلسلۂ عبداللہ ابن سبا میں تحریر فرماتے ہیں:-

"عبداللہ ابن سبا بالکل اسی قسم کا ایک فرضی نام ہے جس کا تحقیق کی روشنی میں من حیث الوجود کوئی نشان نہیں مل سکتا، ہم نے ہندوستان میں سب سے پہلے ۱۹۳۷ء میں جبکہ "الواعظ" کی ادارت ہمارے سپرد تھی اس کی وضاحت کی تھی جس کا حوالہ اخبار "شیعہ" لاہور کی مورخہ ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں زیرِ عنوان

---

[1] الغفاری حاشیہ ص ۲۷۸ و ص ۲۷۹

[2] ابوذر غفاری ص ۱۳۶ ، الغفاری ص ۲۸۰

"سعد و نحس" اب بھی موجود ہے۔ ہماری تحریر نہایت تحقیق پر مشتمل ہے۔ ہم نے اپنے تاریخی استنباط سے اسے صاف صاف لکھا تھا کہ یہ ایک فرضی نام ہے۔ جو جنگِ جمل و صفین پر پردہ ڈالنے کے لیے انظارِ عامہ کے سامنے فرضی طور پہ لایا گیا ہے۔ اس کا تحقیقی طور پر کوئی وجود نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری تحقیق بالکل صحیح ثابت ہوئی اور تھوڑے سے ہی عرصہ میں اس پہ اہلِ تحقیق نے توجہ کر کے وہی کچھ تحریر فرما دیا جو ہم نے لکھا تھا[1]

افسانۂ عبداللہ ابن سبا کا ماخذ طبری کی ایک روایت ہے جس کی حیثیت خبرِ احاد سے زیادہ نہیں۔ ایک ہزار برس سے جس مصنف و مؤلف نے بھی اس کا ذکر کیا طبری کی اسی روایت سے کیا ہے اور اس روایت کا سلسلہ رواۃ اس طرح ہے:-

یزید فقعسی
|
عطیہ
|
سیف ابن عمر
|
شعیب
|
سری

اب ذرا اس افسانہ پر غور کیجیے۔ سری نے شعیب سے شعیب نے

---

[1] الغدیر ص ۲۰۹

سیف ابن عمر سے اور سیف بن عمر نے عطیہ سے اور عطیہ نے یزید فقعسی سے روایت کی ہے: یزید فقعسی کہتا ہے کہ ابو اسودا (عبداللہ ابن سبا) شام میں وارد ہوا۔ تو ابوذر سے ملا، اور کہا کہ اے ابوذر آپ معاویہ پر تعجب نہیں کرتے۔ الخ

اس کے بعد طبری نے ابن سبا اور ابوذر کے قصہ کو سیف کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سیف کے علاوہ کوئی دوسرا واسطہ ہی نہیں۔

سلسلہ افسانۂ ابنِ سبا

سیف ابن عمر تمیمی - المتوفی ۱۷۰ھ

طبری المتوفی ۳۱۰ھ

ابن عساکر المتوفی ۵۵۷ھ

ابن اثیر المتوفی ۶۳۰ھ

مستشرقین

ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ
تاریخ ابن کثیر

نکلسن
تاریخ الادب العربی

فان فلوتن

دوایت م ڈونالڈسن
عقیدۃ الشیعہ

صاحبزادہ
نشتر
جالندھری

پروفیسر
حمید الدین
تاریخ اسلام

سید عبدالقادر
و پروفیسر شجاع الدین
تاریخ اسلام

تاریخ ابوالفداء
متوفی ۷۳۲ھ

سید رشید رضا
مولف دور حاضرہ
السنۃ والشیعہ

احمد امین
فجر الاسلام

ڈاکٹر حسن ابراہیم
تاریخ الاسلام
السیاسی

فرید وجدی
دائرۃ المعارف
الاسلامیہ

جس کسی نے بھی اس قصہ کو لیا طبری ہی سے لیا ہے۔

متاخرین میں علامہ سید رشید رضا مدیر المنار مصر ہیں، وہ لکھتے ہیں :-

"خلیفہ چہارم حضرت علیؓ سے وابستگی اور ان کی شیعیت ہی دین و سیاست میں امتِ محمدیہ کے افتراق و پراگندگی کی بنیاد ہے۔ شیعیت کے اصول ایک یہودی نے گھڑے جس کا نام عبداللہ بن سبا تھا، اس نے مکر و فریب سے کام لیتے ہوئے اسلام ظاہر کیا اور لوگوں کو حضرت علیؓ کے بارے میں غلو کی دعوت دی، غرض یہ تھی کہ امتِ اسلامیہ میں پھوٹ پڑ جائے اور مسلمانوں کی دین و دنیا غارت ہو جائے۔" [۱]

رشید رضا کا ماخذ تاریخ کامل ابن اثیر ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"جو شخص جنگِ جمل کے واقعات کو تاریخ کامل ابن اثیر ہی میں مثلاً غور کی نگاہ سے دیکھے تو اسے اندازہ ہوگا کہ سبائیوں کی سازش اور فتنہ انگیزی کتنی کامیاب ہوئی! درآنحالیکہ صلح کی پوری پوری امید ہو چکی تھی۔" دیکھو تاریخ کامل صفحات ۹۵، ۹۶، ۱۰۳، جلد ۳ [۲]

تاریخ ابوالفداء المتوفی ۷۳۲ھ نے بھی اپنی تاریخ میں دیگر غلط قصوں کے ضمن میں اس قصہ کو نقل کیا ہے اور کتاب کے دیباچہ میں صراحت کر

---

[۱] کتاب السنۃ والشیعہ ص ۴ تا ص ۶

[۲] کتاب السنۃ والشیعہ ص ۴ تا ص ۶

دی ہے :-

"میں نے اپنی تاریخ کو ابن اثیر کی "تاریخ کامل سے انتخاب کرکے لکھا ہے۔"[1]

تاریخ کامل ابن اثیر کا ماخذ کیا ہے، اس کی توضیح علامہ ابن اثیر نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں ان الفاظ میں کی ہے :-

۱۔ میں نے ابتدا تاریخ کی بہت بڑی کتاب طبری سے کی ہے جسے امام جعفر طبری نے تالیف کیا ہے کیونکہ یہی تاریخ مسلمانوں میں بالاتفاق اعتماد و وثوق کے قابل ہے اور اختلافی امور میں اس کی طرف رجوع کی جاتی ہے۔

۲۔ البتہ صحابۂ رسولؐ کے مناقشات اور لڑائی جھگڑے بس اتنے ہی لکھے جتنے طبری میں ملے۔ دیگر مورخین کی کتابوں سے کوئی اضافہ نہیں کیا۔

۳۔ میں نے تمام مورخین میں طبری ہی پر اس لیے بھروسہ کیا کہ وہ اس فن کے واقعی امام، جامع علوم، صحیح الاعتقاد اور صداقت شعار تھے۔[2]

علامہ ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ نے بھی اپنی تاریخ البدایہ والنہایہ جلد ہفتم میں ابن سبا کے اس پورے قصہ کو نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں :-

"سیف ابن عمر نے بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان کے

---

[1] دیباچہ تاریخ ابوالفدا۔ [2] مقدمہ تاریخ کامل ابن اثیر

کے خلاف لوگوں کے اٹھ کھڑے ہونے کا سبب یہ تھا کہ ایک شخص عبد اللہ ابن سبا کہا جاتا ہے اور جو یہودی تھا، بظاہر مسلمان ہوا اور مصر کی طرف چلا گیا، اس نے وہاں اپنے جی سے گھڑ کر لوگوں کے دلوں میں بہت سی باتیں ڈال دیں[1]

یہ لکھ کر ابن کثیر نے ابن سبا کے قصہ کو شروع سے آخر تک نقل کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ جب جنگِ جمل کا پورا واقعہ لکھ چکے تو یہ فقرہ لکھا ہے :-

یہ خلاصہ ہے اس کا جیسے طبری نے ذکر کیا ہے[2]

فرید وجدی نے بھی اپنی کتاب دائرۃ المعارف جلد ۷ تحت لفظ عثم جنگ جمل کے ذکر میں بسلسلۂ حالات حضرت علیؑ ابن ابی طالب افسانۂ عبداللہ ابن سبا کو بیان کیا ہے۔ اور صہ ۱۶۰ و صہ ۱۶۸ و صہ ۱۶۹ پر اشارتاً لکھا ہے کہ ہم نے اس قصہ کو تاریخ طبری سے نقل کیا ہے۔

احمد امین حسن نے "اہلِ ایران اور اسلام پر ان کا اثر" کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے افسانۂ عبداللہ ابنِ سبا کو لکھا ہے، چنانچہ وہ اپنی کتاب فجر الاسلام پر مزدک کی تعلیمات کو دنیا میں سب سے پہلی اشتراکیت قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں :-

"جناب ابوذر غفاری کے نظریہ اور مزدک کے نظریہ میں

---

[1] تاریخ البدائیہ والنہائیہ ج ۷ صہ ۱۶۷

[2] تاریخ البدائیہ والنہائیہ ج ۷ صہ ۲۴۶

ایک گونہ مشابہت جھلکتی ہے (مگر یہ مشابہت محض سرمایہ کی تقسیم میں ہے) چنانچہ طبری کا بیان ہے۔ ابوذر شام میں مقیم ہوئے۔ اور لوگوں سے یہ کہنے لگے، اے گروہِ اغنیا، فقیروں سے ہمدردی کرو، بشارت ہو ان لوگوں کو جو سونا چاندی خزانہ میں جمع کر کے رکھتے ہیں۔ اور راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے وہ جہنم میں رہیں گے۔ اور آگ سے ان کی پشتیں اور پیشانیاں داغی جائیں گی۔ جناب ابوذر نے اس بات پر اتنا زور دیا، کہ نادار مسلمان بھی ان کے ہمنوا اور ان کی باتوں پر فریفتہ ہو گئے۔ اور مالداروں سے اسی بات کے متقاضی ہوئے یہاں تک کہ مالدار افراد عوام سے پریشان ہو کر اٹھے۔ پھر معاویہ نے ابوذر کو شام سے مدینہ حضرت عثمان کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ شام والوں کو بگاڑ نہ سکیں جب حضرت عثمان نے حضرت ابوذر سے پوچھا کہ شام والے کیوں آپ سے نالاں ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ مالداروں کو مناسب نہیں کہ مال جمع کر کے رکھیں [1]

اس سے پتہ چلا کہ دولت کے متعلق ان کا نظریہ قریب قریب وہی ہے جو مزدک کا نظریہ تھا۔ لیکن ابوذر نے یہ نظریہ پایا کہاں سے؟ اس سوال کا جواب طبری نے دیا ہے:۔

---

[1] فجر الاسلام ص ۱۳۶

"ابن سودا (عبداللہ بن سبا) حضرت ابوذر غفاری سے ملا اور اپنے خیالات ونظریات ان کے سامنے پیش کیے۔ یہ ابن سبا ابو دردا اور عبادہ بن صامت کے پاس بھی پہنچا مگر انھوں نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرا۔ عبادہ اسے معاویہ کے پاس پکڑ کر لے گئے کہ "اسی نے تمھارے خلاف یہ ہنگامے بپا کیے ہیں۔"

ہم جانتے ہیں کہ ابن اسودا عبداللہ بن سبا کا لقب ہے، جو صنعا کا یہودی تھا، عہدِ عثمان میں اس نے اسلام ظاہر کیا، اس نے ارادہ کیا کہ مسلمانوں کے دین کو غارت کرے، اس نے شہروں میں بہت سے مضر اور نقصان رساں عقائد کی اشاعت کی، جنھیں ہم بعد میں بیان کریں گے، اس نے بہت سے ملکوں اور شہروں کا سفر کیا۔ حجاز، مصر، شام، کوفہ، بصرہ وغیرہ کے دورے کیے تھے۔ لہٰذا بہت قوی احتمال اس کا ہے کہ اس نے خیالات ونظریات عراق یا یمن کے مزدکیوں سے حاصل کیے ہوں گے۔ اور جناب ابوذر خلوص نیت کے سبب ابنِ سبا کی باتوں میں آگئے ہوں گے۔"

اور اسی عبارت کے حاشیہ پر احمد امین لکھتے ہیں: ـ

دیکھو طبری جلد ۵ ۹ ص ۲۶ اور اس کے آگے۔ اپنے فقرہ میں:ـ

"اس نے شہروں میں بہت سے مضر اور نقصان رساں عقائد کی اشاعت کی جنھیں ہم بعد میں بیان کریں گے۔"[1]

---

[1] اموی دور خلافت جلد اول ص ۱۹۶ و ص ۱۹۷

فاضل موصوف نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"حضرت عثمان کے آخری زمانے میں خفیہ جماعتیں حضرت عثمان کو معزول اور ان کی جگہ پر دوسرا خلیفہ مقرر کرنے کے لیے تمام ممالک میں پھیل گئیں ان ہی جماعتوں میں ایک وہ جماعت بھی تھی جو علیؑ کو خلیفہ مقرر کرنے کے لیے کوشاں تھی اس جماعت کا سرگرم رکن عبداللہ بن سبا تھا، یہ یمن کا یہودی تھا جو مسلمان ہو گیا تھا۔ اس نے بصرہ، کوفہ، شام، مصر کے دورے کیے اور ہر جگہ یہ کہتا پھرا کہ ہر نبی کے لیے ایک وصی ہوتا رہا ہے۔ علیؑ محمد مصطفےٰؐ کے وصی ہیں، جو شخص پیغمبر کی وصیت کو پورا نہ کرے اور پیغمبر کے وصی پر تغلب کرے اس سے بڑھکر ظالم کون ہوگا یہ شخص حضرت عثمان کے مخالفین میں سب سے سخت و شدید تھا یہاں تک کہ حضرت عثمان قتل کر ڈالے گئے"[1]

پھر لکھتے ہیں:۔

"یہ تاریخی واقعات کا مختصر خلاصہ ہے جسے ہم نے بہت مجبور ہو کر ذکر کیا ہے کیونکہ اسی پر اسلام کے تین بڑے فرقوں کی بنیاد پڑی، خوارج، شیعہ"[2]

فاضل موصوف اتنا کچھ لکھنے سے یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ کہ شیعیت اور علیؑ کے وصی رسول ہونے اور رجعت کے عقائد کا سنگ بنیاد

---

[1] فجر الاسلام ص۳۱۱ [2] فجر الاسلام ص۳۱۳

عبداللہ بن سبا نے رکھا اور ان سب باتوں کا نتیجہ آخر میں یہ نکالا ہے کہ حضرت ابوذر اشتراکی تھے، اور اشتراکیت ابن سبا کے پروپیگنڈے سے پھیلی اور ابن سبا ایران کی مزدکیت سے متاثر تھا[1]

اسی بات کو انھوں نے پھر دہرایا ہے چنانچہ حاشیہ پر لکھتے ہیں :-

"بعض تقلید کے دلدادہ افراد کا خیال ہے کہ عبداللہ بن سبا ایک فرضی شخصیت ہے اس کا کوئی تاریخی اور تحقیقی وجود نہیں لیکن ہماری نظر سے کوئی دلیل ایسی نہیں گزری جو ان کے دعوے کو ثابت کر سکے۔"[2]

فاضل موصوف سے کون پوچھے کہ منکر پر بار ثبوت کب ہوتا ہے؟ مدعی پر لازم ہے کہ جس چیز کا وہ دعویٰ کر رہا ہے اس کا ثبوت بھی پیش کرے۔ جو حضرات ابن سبا کے وجود کے قائل ہیں ان پر لازم ہے کہ تاریخی دلائل و براہین سے ثابت کریں کہ واقعاً اس نام کا کوئی شخص دنیا میں گزرا بھی ہے[3]

تاہم ہمیں ان کا یہ چیلنج بسر وچشم منظور ہے۔ "دعویٰ بے دلیل قبول نخرد نہیں" ہمارا اصول ہے جس پر ہم تیرہ سو برس سے عمل پیرا ہیں ہم اپنے اس مقالہ میں کسی انتہا تک ثابت کر چکے ہیں کہ عبداللہ ابن سبا ایک موہوم، خیالی اور فرضی شخصیت ہے۔ ایک افسانوی کردار ہے

---

[1] اموی دورِ خلافت جلد اول ص ۱۹۸ [2] فجر الاسلام ص ۳۳

[3] اموی دورِ خلافت جلد اول حاشیہ ص ۱۹۸

جسے حضرت عثمان کے دورِ سلطنت اور واقعاتِ جمل وصفین پر پردہ ڈالنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ جبکی فرضی حیثیت کو ایک عبرِ احادیث طبری کے ایک غیر معتبر راوی سیف بن عمر تیمی کی سند سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے انشاء اللہ ہم آئندہ چند صفحات میں اس کی فرضی شخصیت کو ثابت کر کے بتلا دیں گے کہ اس کے قبیح نتائج کیا ہیں؛ ایسے ہی ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے اس افسانہ کو حقیقت بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے وہ اپنی کتاب تاریخ الاسلام السیاسی میں حضرت عثمان کے آخر زمانہ خلافت میں مسلمانوں کی تصویر کشی کے بعد لکھتے ہیں:-

"یہ فضا انقلاب کے لیے پوری طرح سازگار اور عبداللہ بن سبا اور اس کے پیروؤں کی باتوں کو قبول کرنے اور متاثر ہونے کے لیے انتہائی حد تک تیار تھی۔ اس ہنگامہ کی آگ ایک جلیل القدر عظیم المرتبت صحابی نے بھڑکائی جو سابقین میں تھے اور زہد و پرہیزگاری میں مشہور اور بزرگ ترین ائمہ حدیث سے تھے، یعنی حضرت ابوذر غفاری جنھوں نے عبداللہ ابن سبا کی باتوں میں آکر حضرت عثمان اور ان کے گورنر معاویہ کی سیاست کو چیلنج کیا تھا۔ یہ عبداللہ ابن سبا صنعا کا رہنے والا ایک یہودی تھا۔ جو مسلمان ہو گیا تھا۔ اس نے ممالک اسلامیہ کے دورے کیے ابتدا اس نے حجاز سے کی پھر بصرہ آیا اس کے بعد کوفہ اور کوفہ سے شام و مصر گیا"[1]

[1] تاریخ الاسلام السیاسی صفحہ ۳۴۷

اس عبارت کے حاشیہ پر ڈاکٹر صاحب موصوف لکھتے ہیں :-
تاریخ طبری جلد ۲ ص ۲۵۹

پھر لکھتے ہیں :-

"ابنِ سبا جس نے سب سے پہلے حضرت عثمان سے لوگوں کو متنفر و بیزار بنایا اس نے انھیں خلافت سے معزول کرنے کے لیے راستہ بالکل ہموار پایا"[۱]

اس عبارت کے حاشیہ پر بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے چار دفعہ طبری کے ان ہی صفحات کا حوالہ دیا ہے - اس طرح ص ۳۵۲ تک اس قصہ کو لکھا ہے اور بارہ جگہ طبری کے ان ہی صفحات کا حوالہ دیا ہے - اس لیے معلوم ہوا اس افسانہ کا اکیلا ماخذ طبری ہی ہے لیکن طبری نے جنگِ جمل کے متعلق جو باتیں لکھی ہیں وہ ڈاکٹر صاحب موصوف کو ٹھیک معلوم نہیں ہوئیں - اس لیے اس موقعہ پر گول کر گئے ہیں حالانکہ دونوں میں ابن سیف ہی سنگِ بنیاد ہے پھر ان دونوں واقعات کا ماخذ بھی ایک ہی ہے اور بیان کرنے والا بھی ایک یعنی طبری[۲]

الغرض جمہور مسلمین کے متقدین علماء ہوں یا متاخرین سب نے عبداللہ ابن سبا کے قصہ کو طبری ہی کی خبر واحد سے نقل کیا ہے اور اسی کا حوالہ دیا ہے -

---

[۱] "تاریخ الاسلام السیاسی ص ۳۴۹
[۲] اموی دورِ خلافت جلد اول ص ۲۰

مستشرقین (ORIENTALISTS)

ان میں فان فلوتن (FAWN-FLOTTON) اپنی کتاب "سیادۃ عربیہ" "شیعہ اور اسرائیل عہد بنی امیہ میں" سلسلۂ جماعات شیعہ میں لکھتے ہیں :-

"لیکن سبائیہ یعنی عبداللہ ابن سبا کے انصار جو عہدِ عثمان میں علیؓ کو زیادہ سزاوارِ خلافت سمجھتے تھے۔"[1]

اس عبارت کے حاشیہ میں انھوں نے طبری اور اس کے صفحات کا حوالہ دیا ہے۔[2]

پروفیسر نکلسن اپنی کتاب "تاریخ ادبِ عربی" مطبوعہ کیمبرج میں لکھتے ہیں :-

"عبداللہ ابن سبا جس نے فرقۂ سبائیہ کی بنیاد رکھی صنعا یمن کے رہنے والوں میں سے تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے یہودی تھا، عہدِ عثمان میں مسلمان ہوا۔ اس کے بعد اس نے دورے اور تقریریں کرنی شروع کیں، مورخین بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر میں پھرتا تھا تاکہ مسلمانوں کو گمراہ کرے اور انھیں موارد خطا میں لاڈالے، وہ حجاز میں آیا وہاں سے بصرہ پہنچا البصرہ سے کوفہ پھر شام میں نمودار ہوا، اور آخری سفر اس نے مصر کا کیا اور وہیں جم کر رہ گیا جہاں لوگوں کو رجعت کے اعتقاد کی دعوت دیتا تھا۔ ابن سبا کا عقیدہ — ابن سبا کہا کرتا تھا" انتہائی حیرت انگیز و تعجب خیز ہے کہ کوئی

---

[1] سیادۃ عربیہ ص۹۰
[2] سیادۃ عربیہ ص۸۰

شخص اس بات کا تو اعتقاد رکھے کہ عیسیٰ اس دنیا میں پلٹ کر آئیں گے اور حضرت محمد مصطفیٰؐ کے دوبارہ دنیا میں آنے کا معتقد نہ ہو جس پر قرآن نے نص بھی کی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہزاروں نبی دنیا میں ایسے گزرے ہیں کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوا کیا۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے وصی علیؑ ہیں، لہٰذا محمدؐ آخر الانبیاء ہیں اور علیؑ آخر الاوصیاء ہیں[1]"

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد مستشرق موصوف نے حاشیہ پر اسی طبری اور اس کے صفحات کا حوالہ دیا ہے۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ جسے جرمنی انگلینڈ کے ۹ بڑے بڑے مستشرقین نے مل کر ترتیب دیا۔ اس کی پہلی جلد میں یہ عبارت موجود ہے:-

طبری اور مقریزی کی عبارات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سبا جن چیزوں کی تبلیغ کرتا تھا ان میں ایک چیز یہ بھی کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ نیز اس نے ایک قاعدہ بنایا تھا کہ ہر نبی کے لیے ایک وصی ہوا کیا اور علیؑ حضرت محمد مصطفیٰؐ کے وصی ہیں، اس کا نظریہ یہ تھا کہ ہر مومن پہ فرض ہے کہ علیؑ کی معیت میں حق کی حمایت و نصرت کرے، قولاً و عملاً دونوں حیثیتوں سے، کہا جاتا ہے کہ ابن سبا پروپیگنڈا کرنے والوں کو استعمال کرتا تھا جو اس کے خیالات و نظریات کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ یہ

---

[1] تاریخ ادب عربی مطبوعہ کیمبرج ص ۲۱۵

ابن سبا ان لوگوں سے تھا جو ماہ شوال ۳۵ھ مطابق اپریل ۶۵۶ء میں حضرت عثمان کو قتل کرنے کے لیے مصر سے مدینہ گئے"۔[1]

اس دائرۃ المعارف میں بھی طبری ہی کا حوالہ ہے۔ طبری کے علاوہ مقریزی کا بھی ذکر ہے لیکن مقریزی کے روایات اعتماد کے قابل نہیں کیونکہ نہ اس نے سلسلۂ اسناد ذکر کیے ہیں نہ اس کے ماخذ کا ذکر کیا ہے (اسکی مثال موجودہ زمانے کے بعض مورخوں کی ہے جو پاکستان اور ہندوستان کی دانش گاہوں (Universities) میں پروفیسر یا لیکچرار ہیں اور مسلمانوں کی تاریخ بنا رہے ہیں، لکھ نہیں رہے اور یہ سب کچھ شیعیت کی مخالفت میں ہو رہا ہے) مگر بے سند بات کا اعتبار کیا اور بغیر ماخذ کے لکھی ہوئی بات پر بھروسہ کیا، مقریزی نویں صدی ہجری کا مورخ ہے۔ جو واقعہ اس کی پیدائش سے تقریباً ۸۰۰ برس پہلے گزرا ہو اس کو بغیر کسی کتاب کے حوالے کے (اور بغیر اسناد کے) بیان کرنا جتنا ناقابلِ اعتبار ہے ظاہر ہے۔ موقع ملا تو ہم مقریزی کی روایت پر بھی آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔[2]

روایت ۸ ڈونلڈسن (W.M. Donaldson) ظاہراً عیسائی اور باطناً بہائی جس نے عقیدۃ الشیعہ (Shia Faith) لکھ کر اپنی شیعیت دشمنی کا کھلم کھلا ثبوت پیش کیا ہے اس کتاب کے آخر میں بہائیت کو شیعیت کی نشاۃ ثانیہ کہا ہے حالانکہ بہائیت کے اسلام سے انکار ہے

---

[1] دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱ ص ۲۹

[2] اموی دورِ خلافت ج اول ص ۲۰۲۔

اور یہائیت میں شرک کی تعلیم موجود ہے۔ اور اسی ڈونلڈسن نے حضرت امام حسن علیہ السلام کے متعلق معاندانہ روش اختیار کی ہے۔ یہی مصنف عبداللہ ابن سبا کے متعلق لکھتا ہے:۔

"قدیمی روایتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ اصحاب علیؑ اور شیعیان علیؑ محض سیاسی اغراض کے تحت علیؑ کی خلافت کے قائل نہ تھے بلکہ خلافت کو علیؑ کا حق الٰہی سمجھتے تھے۔ اس عقیدہ کی نشر و اشاعت میں ایک مخفی شخصیت کے پروپیگنڈوں اور ریشہ دوانیوں کو بڑا دخل حاصل ہے۔ حضرت عثمان کے زمانے میں ایک شخص ظاہر ہوا جس کا نام عبداللہ ابن سبا تھا اس نے مسلمانوں کو بگاڑنے اور غارت کرنے کے لیے تمام ممالک اسلامیہ میں گھوم پھر کر اپنے عقائد کی تبلیغ اشاعت کی جیسا کہ طبری کا بیان ہے"[۱]

مستشرق موصوف نے اس کتاب کے صفحہ ۵۹ پر جو حاشیہ تحریر کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابن سبا کے اس قصہ کو طبری سے نقل نہیں کیا بلکہ مذکورہ بالا کتابیں "ادارۃ المعارف الاسلامیہ" اور نکلسن کی تاریخ الادب العربی سے اقتباس کیا ہے اور ان دونوں کتابوں میں ابن سبا کے متعلق جو کچھ بھی ہے وہ طبری ہی سے منقول و ماخوذ ہے۔ مختصر یہ کہ ابن سبا کا قصہ خوب پھیلا اور مشہور ہوا۔ اکثر مورخین نے اس قصہ کو سلسلۂ اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے اور بلا واسطہ یا بالواسطہ طبری تک سلسلۂ اسناد کو منتہی کیا ہے۔ کچھ

---

[۱] عقیدۃ الشیعہ (Shia Faith) صفحہ ۸۵

مورخین ایسے بھی ہیں، جنھوں نے اپنی کتابوں میں اس قصہ کو بغیر حوالہ کے لکھا ہے لیکن کتاب کے شروع یا آخر میں مصادرِ کتاب کی فہرست میں طبری کا نام لکھا ہے یا ان کتابوں کے نام کی صراحت کی ہے جو طبری سے لکھی گئی ہیں جیسا کہ صاحب روضۃ الصفا نے کیا ہے۔

ان تمام باتوں سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ طبری ہی سے اس قصہ کی بنیاد پڑی ہے۔ سب سے پہلے ان ہی نے اپنی کتاب میں اس قصہ کو لکھا ہے۔ بعد میں آنے والے مورخین نے ان پر حیرت انگیز حد تک اعتماد و وثوق کرتے ہوئے آنکھ بند کر کے اس قصہ کو اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ تاریخ طبری پر توجہ مرکوز کی جائے۔ اور اس کے سلسلۂ اسناد کی چھان بین کی جائے[1]

عبداللہ ابن سبا کے افسانے کی ابتدا تاریخ طبری نے کی ہے۔ تاریخ طبری کے مولف ابن جریر کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی۔ ان سے پہلے کسی اہلِ قلم نے عبداللہ ابن سبا کے متعلق نہیں لکھا حالانکہ مندرجہ ذیل کتب طبری سے مقدم ہیں۔

۱۔ طبقات ابن سعد۔ تالیف محمد بن سعد کاتب الواقدی ۲۲۳ھ
۲۔ سیرت ابن ہشام۔ تالیف عبدالملک بن ہشام ۲۱۳ھ
۳۔ فتوح البلدان۔ تالیف علامہ بلاذری ۲۷۹ھ
۴۔ صحیح بخاری۔ تالیف محمد بن اسمٰعیل بخاری ۲۵۶ھ

---

[1] اموی دورِ خلافت ج اول ص ۲۰۴

۵۔ صحیح ترمذی۔ تالیف محمد بن عیسیٰ ترمذی سنہ ۲۷۹ھ
۶۔ مسند احمد حنبل۔ تالیف امام احمد حنبل سنہ ۲۴۱ھ
۷۔ موطاء امام مالک۔ تالیف امام مالک سنہ ۱۷۹ھ
۸۔ معارف ابن قتیبہ۔ تالیف ابن قتیبہ الدینوری سنہ ۲۷۶ھ
۹۔ انساب الاشراف۔ تالیف علامہ بلاذری سنہ ۲۷۹ھ
۱۰۔ سیرۃ ابن اسحاق۔ تالیف ابن اسحٰق سنہ ۱۵۱ھ
۱۱۔ مسند۔ تالیف ابو داؤد الطیالسی سنہ ۲۰۴ھ
۱۲۔ المغازی۔ تالیف الواقدی سنہ ۲۰۷ھ
۱۳۔ مسند۔ تالیف الحمیدی سنہ ۲۱۹ھ
۱۴۔ اخبار المدینہ۔ تالیف زبیر بن بکار سنہ ۲۵۶ھ

جہاں تک ہمیں علم ہے یہ کتابیں جن کے مولف علامہ ابن جریر طبری سے مقدم ہیں افسانۂ عبداللہ ابن سبا کے متعلق خاموش ہیں۔ وہ عبداللہ بن سبا جس نے مکتبِ رسالت کے فارغ التحصیل شاگردوں یعنی صحابہ کی جماعتِ کثیر کو بہکایا، بھٹکایا اور ایک عظیم انقلاب پیدا کیا جو منجر بہ قتل خلیفۃ المسلمین حضرت عثمان ہوا اور جس کی ریشہ دوانیوں سے جنگِ جمل واقع ہوئی جس میں ہزارہا مسلمان تلوار کے گھاٹ اترے ایسی شخصیت سے متعلق معلومات کے بحرِ غواص علمائے علام و مصنفین کرام خاموش ہیں اگر اس افسانہ کی کوئی حقیقت ہوتی تو یہ حضرات اپنی کتب میں کما ینبغی اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔ ابن جریر طبری پہلے شخص ہیں جو تین صدیوں

کے کامل سکوت کے بعد اسے صرف ایک راوی سیف ابن عمر سے روایت کرتے ہیں۔

سیف ابن عمر تمیمی برجمی کوفہ کا رہنے والا تھا۔ اور دو کتابوں الفتوح والردہ اور الجمل والسیر (عائشہ و علیؑ) کا مولف ہے زمانۂ سلطنت ہارون الرشید میں ہوا ہے سنہ ۱۷۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

علمائے رجال اس کے متعلق لکھتے ہیں :—

۱۔ یروی عن خلق کثیر من المجہولین — بے شمار گمنام اور مجہول الاحوال لوگوں سے روایت کرتا ہے۔

۲۔ ضعیف الحدیث لیس بشئی — اسکی حدیثیں بہت ضعیف ہوتی ہیں یہ کچھ بھی نہیں۔

۳۔ متروک لیضع الاحادیث — وہ متروک ہے۔ حدیثیں گھڑا کرتا ہے۔

۴۔ ھو فی الروایۃ ساقط — یہ ساقط الروایت ہے۔

۵۔ یروی الموضوعات عن الثقاۃ — معتبر ثقہ لوگوں سے منسوب کر کے من گھڑت حدیثیں روایت کرتا ہے۔

۶۔ عامۃ حدیثہ منکر — اس کی زیادہ تر حدیثیں منکر یعنی انھونی ہیں۔

۷۔ متہم بالوضع والزندقۃ — زندقہ (بیدینی) اور وضع الکتب و افترا کا متہم ہے[۱]

---

[۱] فہرست ابن ندیم ص۱۳۷ - میزان الاعتدال ج ۱ ص۴۳۸ و ص۲۵۵ - تہذیب التہذیب ج ۴ ص۲۹۵ - الغدیر ج ۸ ص۳۲۶

علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب لئالی مصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ میں صرف ایک حدیث بطور نمونہ سیف ابن عمر سے نقل کی ہے اور نقل کرنے کے بعد لکھا ہے :۔

"یہ حدیث موضوع ہے اس کے سلسلۂ اسناد میں سب ہی ضعیف راوی ہیں، سب سے زیادہ ضعیف ان میں سیف ہے۔"

غرضیکہ علمائے فن رجال نے ان ہی الفاظ میں سیف کی توصیف کی ہے[1]

صاف ظاہر ہے کہ عبداللہ ابن سبا نام کا کوئی شخص تاریخِ اسلام میں گذرا ہی نہیں ۔ یہ ساری مصیبت سیف ابن عمر ایک راوی کی ہے جس نے ابن سبا تو ابن سبا بہت سے ایسے فرضی صحابی گھڑ لیے ہیں اور ان کے نام سے فرضی روایتیں بیان کی ہیں جو کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے بلا استثنا تمام مورخین نے خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے یا یورپ کے مستشرقین سبھی نے ابنِ سبا کے قصہ کو طبری سے نقل کیا ہے۔ اور طبری نے سری ایک شخص سے معلوم کیا۔ اور سری نے سیف ابن عمر سے۔ سیف ابن عمر نے اس قصہ کو بیان کیا اور اسی نے شہرت دی، سیف ابن عمر زمانہ ہارون الرشید میں سنہ ۱۷۰ھ میں مرا ہے[2]

اتنا بڑا اعظیم الشان واقعہ، اتنی بڑی انقلاب آفریں شخصیت اور اس کے متعلق سنہ ۱۷۰ھ تک صحابہ، تابعین اور تبع تابعین خاموش ہیں ۔ ان کی

---

[1] کتاب عبداللہ ابن سبا از مرتضیٰ عسکری نجف اشرف عراق ۔

[2] اموی دورِ خلافت ج ا صفحہ ۲۰۸ ۔

قوتِ گویائی پر قفل لگے ہوئے ہیں۔ عبداللہ ابن سبا اور اس کے متبعین کے متعلق جو اُس زمانے کے سب سے بڑے مفسدہ پرداز ہیں، کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا۔ یہ کتمانِ شہادت کے جرم کا ارتکاب نہیں کہ جس کے قرنِ اولیٰ کے مسلمان مرتکب ہو رہے ہیں۔ یہ سکوت صاف بتلا رہا ہے کہ افسانہ ابن سبا ایک اختراع ہے، افترا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہ تضاد سخت تعجب انگیز ہے کہ صحابہ کی وہ جماعت جس کے متعلق سوادِ اعظم کے علمائے اہلِ سنت زبانِ رسالت سے یہ قول نقل کرتے ہیں:۔

"اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔"

"میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے تم جس کی اقتدا کر لوگے، ہدایت پا جاؤ گے۔"

یہ حدیث اتنی مشہور ہے کہ اہلِ سنت میں زبان زدِ خلائق ہو گئی ہے۔ اور بعض علمائے کرام اسکو بنیاد قرار دے کر دھواں دار تقریریں کیا کرتے ہیں۔

ایک طرف تو ان صحابہ کی یہ عظمت اور دوسری طرف ان کے متعلق ایسا سوءِ ظن کہ ان کی بہت بڑی تعداد صنعاء (یمن) کے رہنے والے ایک حبشیہ زادہ یہودی ابنِ سبا کی پیرو ہو جاتی ہے۔ اس سے بہت بڑے گروہ میں صحابہ کبار بھی ہیں اور جلیل القدر تابعین بھی، ان میں ابوذر بھی ہیں عمار یاسر بھی، محمد ابن ابی حذیفہ بھی ہیں اور عبدالرحمٰن ابن عدیس بلوی بھی۔ محمد ابن ابی بکر بھی ہیں اور صعصعہ ابن صوحان عبدی بھی۔ مالک اشتر بھی اور اویس قرنی بھی۔ جو لوگ ایک

نوسلم یہودی کے دامِ فریب میں آسکتے ہیں ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں سے جس کی بھی پیروی کی جائے ہدایت ہی ہے۔ ع

کو خویشتن گم است کرا رہبری کند

حضرت ابوذر کے متعلق یہ کہا جاتا ہے جیسا کہ طبری میں ہے کہ ابن السودا (عبداللہ ابن سبا) حضرت ابوذر سے ملا اور اپنے خیالات و نظریات ان کے سامنے پیش کیے۔ یہ ابنِ سبا ابودردا اور عبادہ ابن صامت کے پاس بھی پہنچا۔ مگر انھوں نے اسکی باتوں پر کان نہ دھرا، عبادہ اسے معاویہ کے پاس پکڑ کرلے بھی گئے کہ اسی نے تمھارے خلاف ہنگامے برپا کیے ہیں بس۔[1]

اس روایت میں یہ دکھلایا ہے کہ ابوذر تو ابنِ سبا کے دامِ فریب میں آگئے مگر ابودردا اور عبادہ ابن صامت نہیں آئے۔ یہ امر واقعات کے قطعاً خلاف ہے۔ اگر حکومتِ وقت اور عمالِ حکومت اور سرمایہ داروں کی مخالفت وہ سبق تھا جو ابوذر نے ابنِ سبا سے لیا تھا تو اس نظریہ میں ابودردا اور عبادہ ابن صامت بھی جناب ابوذر کے ہمنوا اور شریک کار تھے :-

ا- امیر معاویہ نے حضرت ابوذر کو شام سے جلاوطن کر دیا، حضرت ابودردا کو راستہ میں خبر ملی تو اِنّا لِلّٰہِ پڑھا اور کہا "اب ان لوگوں کا بھی انتظار کرو جیسا کہ اصحابِ ناقہ کے بارے میں کہا گیا تھا۔" (گویا ابودردا ان لوگوں کو اصحابِ ناقہ کی طرح مستحقِ عذاب سمجھتے تھے) اس کے

---

[1] نورالاسلام ص ۱۳۶

بعد نہایت جوش میں فرمایا "خدایا ان لوگوں نے ابوذر کو جھٹلایا، لیکن میں نہیں جھٹلاتا ہوں، لوگوں نے ان کو متہم کیا، لیکن میں نہیں کرتا ہوں، ان لوگوں نے ان کو خارج البلد کیا لیکن میں نے اس رائے میں شرکت نہیں کی کیونکہ میں جانتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے برابر کسی کو زمین پر سچا نہیں سمجھتے تھے۔ اور ان کے برابر کسی سے راز نہیں کہتے تھے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں ابودردا کی جان ہے کہ اگر ابوذر میرا ہاتھ بھی کاٹ ڈالیں تو بھی میں ان سے بغض نہ رکھوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اور میں نے سنا تھا کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذر سے زیادہ سچا کوئی نہیں"[1]

۲۔ امیر معاویہ نے کوئی چاندی کا برتن خریدا جس کی قیمت میں چاندی کے وزن سے کم و بیش روپے مالک کو دیے۔ اسلام میں یہ ناجائز ہے حضرت ابودردا نے فوراً ٹوکا "معاویہ! یہ درست نہیں ہے رسول اللہ نے چاندی سونے میں برابر برابر کا حکم دیا ہے"[2]

۳۔ ابودردا ایک روز مکان میں تشریف لائے۔ چہرہ سے غیض و غضب عیاں تھا۔ بیوی نے پوچھا کیا حال ہے؟ فرمایا، خدا کی قسم رسول اللہ کے زمانے کی ایک بات بھی باقی نہیں رہی۔ لوگوں نے سب چھوڑ دیا۔ صرف نماز باجماعت پڑھتے ہیں"[3]

---

[1] سیر الانصار، جلد اول صفحہ ۲۰۲ [2] مسند، ج ۶ صفحہ ۴۴۸۔ سیر الانصار، ج ۱ صفحہ ۲۰۱
[3] مسند، ج ۵ صفحہ ۱۹۵۔ سیر الانصار، ج ۱ صفحہ ۲۰۳۔ اغاثۃ اللھفان ابن القیم صفحہ ۱۰۸

یہی وہ انقلاب تھا جس کی مخالفت جناب ابوذر کرتے تھے۔ اور حکومت کے معتوب تھے۔

۱۔ عہدِ عثمانی میں حضرت امیر معاویہ نے دربارِ خلافت میں شکایت لکھی کہ عبادہ نے تمام شکر کو بگاڑ رکھا ہے۔ یا تو ان کو مدینہ بلا لیجئے۔ یا میں شام چھوڑ دوں گا۔ امیر المومنین نے جواب میں لکھا کہ ان کو یہاں روانہ کر دو۔ مدینہ پہنچکر سیدھے حضرت عثمان کے کاشانہ میں پہنچے۔ جہاں صرف ایک شخص تھا جو مہاجر و تابعی تھا، لیکن باہر بہت سے لوگ جمع تھے اندر جا کر ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ حضرت عثمان کی نظر اٹھی تو حضرت عبادہ سامنے تھے۔ پوچھا کیا معاملہ ہے؟ پیکرِ حق اب بھی راستگوئی کا وہی جذبہ رکھتا تھا۔ کھڑے ہو کر مجمع سے مخاطب ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے بعد امرا منکر کو معروف اور معروف کو منکر سے بدل دیں گے لیکن معصیت میں اطاعت جائز نہیں۔ تم لوگ بدی میں ہرگز آلودہ نہ ہونا۔[1]

۲۔ ابوذر ہوں یا ابو درداء، عمار یاسر ہوں یا عبادہ ابن صامت سبھی محبوب صداقت کی زلف کے اسیر تھے۔ حقگوئی میں دریغ نہیں کیا ؎

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
زلفِ جاناں کے سب اسیر ہوئے

امرائے مقابلے میں حقگوئی حضرت عبادہ کے "تاجِ فضیلت کا طرۂ امتیاز

---

[1] مسند، ج ۵ ص ۳۱۹ ۔ سیر الانصار ج ۲ ص ۵۷

رہی ہے، وہ نہایت جوش سے اس فرض کو ادا کرتے تھے۔ شام گئے، اور وہاں بیع و شرا میں شرعی خرابیاں دیکھیں تو ایک خطبہ دیا۔ جس سے تمام مجمع میں ہلچل مچ گئی۔ حضرت معاویہ بھی موجود تھے۔ بولے کہ عبادہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تھا۔ اب ان کے طیش کو کون روک سکتا تھا۔ فرمایا کہ مجھے معاویہ کے ساتھ رہنے کی بالکل پروا نہیں گواہی دیتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا[۱]۔

حضرت عمر نے اپنے زمانۂ خلافت میں عبادہ بن صامت کو فلسطین کا قاضی بنایا تھا۔ اس زمانے میں یہ صوبہ حضرت معاویہ کی ماتحتی میں تھا کسی بات پر دونوں میں اختلاف ہوگیا جس میں حضرت امیر معاویہ نے سخت کلامی کی تو انھوں نے کہا کہ آئندہ جہاں تم ہوگے میں نہیں ہونگا۔ ناراض ہوکر فلسطین سے مدینہ چلے آئے۔ حضرت عمر نے دیکھا تو پوچھا کیوں؟ انھوں نے سارا قصہ دہرایا، فرمایا کہ آپ اپنی جگہ پہ جائیے۔ دنیا آپ ہی جیسے لوگوں سے قائم ہے۔ جہاں آپ لوگ نہ ہوں گے خدا اس زمین کو خراب کر دے گا۔ اس کے بعد ایک خط امیر معاویہ کو لکھا کہ میں عبادہ کو تمھاری ماتحتی سے الگ کرتا ہوں[۲]۔

یہ ان لوگوں کے حکومت کے متعلق بیانات ہیں جو بہ تحریر طبری: نجم الاسلام ابن سبا کے متبعین میں سے نہیں تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابن سبا

---

[۱] مسند، ج ۵ ص ۳۱۹، سیر الانصار ج ۲ ص ۵۶

[۲] بلاذری فتوح البلدان ص ۱۳۹، سیر الانصار ج ۲ ص ۵۳

کے اسلنے سے واقعات پہ پردہ ڈالنے کی لاکھ جدوجہد کی جائے حق حق ہی رہے گا۔ اسے مٹایا نہیں جاسکتا۔ طبری کی روایت میں ہے کہ عبداللہ ابن سبا کو عبادہ ابن صامت نے پکڑ کر معاویہ کے حوالے کردیا اور کہا، کہ اسی نے تمہارے خلاف ہنگامے برپا کیے ہیں۔ اگر عبادہ بن صامت نے اسے پکڑ کر معاویہ کے حوالے کردیا تھا اور یہ بھی بتلادیا تھا کہ تمہارے خلاف تمام ہنگامے اسی نے برپا کیے ہیں تو یہ ناممکن تھا کہ حضرت معاویہ اسے قتل نہ کروا دیتے۔ اس کا گرفتار ہونا اور پھر بچ نکلنا کسی تاریخ کی کتاب میں موجود نہیں ہے حالانکہ حضرت معاویہ جس شخص کو بھی اپنا مخالف پاتے اس کا جس طرح ممکن ہوتا خاتمہ کرکے دم لیتے۔ وہ ایک سیاسی انسان تھے۔ درایت کے لحاظ سے ان کی زندگی کا طرۂ امتیاز ہر طرح کے جائز و ناجائز وسائل استعمال کرنا تھا۔ ایسے مفادپرست انسان کے لیے جو کچھ بھی وہ کر گزرے بعید نہیں۔

ابن اثال دمشق کا نصرانی طبیب حضرت معاویہ کی خلوت و جلوت کا جلیس تھا۔ اس کے بنائے ہوئے زہروں سے حضرت معاویہ کے زمانۂ حکومت میں اکابر مسلمین و امرا کی ایک بڑی جماعت کی جانیں تلف ہوئیں۔[1] خالد بن ولید فاتح شام تھے۔ جن کی کمانڈ میں اولادِ ابوسفیان کو فتوحات کے دروازے سے قصرِ حکومت میں داخلہ کا موقع ملا۔ عبدالرحمٰن اسی فاتحِ شام خالد بن ولید کے چشم و چراغ تھے۔ سب ہی مفتوحہ ممالک میں خالد بن ولید

---

[1] عیون الانباء فی طبقات الاطباء ضمن حالات ثامر طبیب معاویہ

بہ حیثیت فاتح کے فاتحین کے دلوں پر قبضہ کیے ہوئے تھے۔ ان کے بیٹے عبدالرحمن کے ہوتے ہوئے کیا ممکن تھا کہ اہلِ شام کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہوں؟

عیون الانبار میں ابی سہیل سے مروی ہے کہ معاویہ نے جب یزید کی ولیعہدی کا ارادہ کیا تو اہلِ شام سے اس معاملہ میں مشورہ کیا اور لوگوں نے عبدالرحمن بن خالد بن ولید کو اس منصب کے لیے قرار دیا، معاویہ یہ سنکر کچھ دن خاموش رہے اتفاق سے عبدالرحمن بیمار پڑ گئے، معاویہ نے ابن آثال عیسائی طبیب سے زہر دلوا دیا[1]

حضرت معاویہ کی سیرت اور ان حالات کو جس میں اس نے کامیابی حاصل کی ایک انگریز صاحبِ قلم (کرنل آسبورن) نے جو اس معاملے میں تعصب سے بری ہے اس طرح لکھا ہے:۔

"تیز فہمی، بدعنوانی اور بے رحمی خاندان بنی امیہ کے پہلے خلیفہ کا شعار تھا۔ وہ کسی جرم سے جو اس کی پوزیشن کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہوتا۔ پہلو تہی نہیں کرتا تھا۔ ایک ناگزیر دشمن کو اپنے رستے سے ہٹانے کے لیے قتل اس کا عادی طریقِ کار تھا۔ وہ رسولؐ کے نواسے کو زہر دیے جانے کا سبب ہوا۔ مالک اشتر کو جو حضرت علیؑ کا شجاع لفٹیننٹ تھا اسی طریق سے موت کے گھاٹ اتارا۔ اپنے بیٹے یزید کی جانشینی کی حفاظت کے لیے

---

[1] عیون الانبار فی طبقات الاطبار ضمن حالات ثمامہ طبیب معاویہ

اس نے امام حسنؓ سے جو فرزندِ رسول اللہؐ کے زندہ نواسے تھے جو عہد کیا تھا اس کے توڑنے میں ذرا نہیں جھجکا۔ بہرحال یہ سرد مہر، منصوبہ باز اور ہٹ دھرم امیرِ عرب اسلام کی سرزمینوں پر حکمران تھا۔ یہ عصائے حکومت اس کے خاندان میں تقریباً نوّے برس تک رہا۔"[1]

اس کے علاوہ حضرت معاویہ نے حجر بن عدی، عمرو بن الحمق الخزاعی، مالک بن اشتر، محمد بن ابی بکر کو قتل کردایا۔

اگر عبداللہ بن سبا حقیقتاً کوئی شخصیت ہوتی جو اس کے یا حضرت عثمان کے خلاف پروپیگنڈا کر رہی ہوتی اور وہ گرفتار ہو کر اس کے قبضہ میں آجاتی اور یہ بھی اسے علم ہوتا کہ میری اور خلیفہ ثالث کی مخالفت کا یہی سرچشمہ ہے تو اسے قتل کیے بغیر نہ رہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبداللہ ابن سبا کوئی انسان نہیں تھا بلکہ ایک فرضی شخصیت تھی۔ جسے ۱۷۰ برس بعد دنیا کے سامنے لایا گیا اور تین سو برس بعد دنیائے تالیف میں اسے لایا گیا۔ اور اس کے متعلق پروپیگنڈا کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے حجاز، عراق، کوفہ، بصرہ اور مصر کا دورہ کرکے لوگوں کو سلطنت کے خلاف بھڑکایا اور برانگیختہ کیا

حضرت عثمان نے صوبوں کی گورنریاں کو اپنے خاندان میں اس طرح تقسیم فرمایا تھا:۔

---

[1] اسلام انڈر عرب بائی آسبورن

مصر۔ عبداللہ ابن سعد ابن سرح، یہ وہ شخص تھا جو رسول اللہؐ کے زمانے میں ہی مشرکوں سے مل گیا تھا۔ اور جس کا خون رسول اللہؐ نے مباح فرما دیا تھا، یہی وہ شخص ہیں جنہوں نے محمد بن ابی بکر اور محمد بن ابی حذیفہ کو ختم کر دیا تھا۔ اور حضرت عثمان نے انھیں الکھزار دینار عطا کیے تھے۔

بصرہ ۔ حضرت عثمان کے خالہ زاد بھائی عبداللہ ابن عامر۔
شام ۔ معاویہ بن ابی سفیان حضرت عثمان کے چچا زاد بھائی۔
کوفہ۔ حضرت عثمان کا اخیانی بھائی۔ ولید بن عقبہ
فلسطین ۔ عمرو عاص۔

سارے ملک پر جب حضرت عثمان کے اعزا و اقربا، ہی حکمران تھے تو کیا ایک اجنبی نو مسلم کو یہ موقع مل سکتا تھا کہ وہ ان کے اقتدار میں رہ کر حکومت کے خلاف کوئی پروپیگنڈا کر سکے اور زندہ رہ سکے۔ اگر عبداللہ ابن عامر گورنر بصرہ یا معاویہ گورنر شام ایسی پروپیگنڈے کرنے والی ہستی کا قصہ پاک کر سکتے تھے۔ دورِ حاضر میں تو شک وشبہ پر بھی اس زمانے کی حکومتیں بے گناہ انسانوں کا ناطقہ بند کر دیتی ہیں اور ناک میں دم کر دیتی ہیں، تو بنی امیہ کے چالاک اور ہوشیار ایسے پروپیگنڈا کرنے والے نو مسلم یہودی کو ایسا پروپیگنڈا کرنے کا کہاں موقع دے سکتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبداللہ بن سبا ایک افسانوی کردار ہے۔

بہرکیف عبداللہ ابن سبا کے افسانہ کو وضع کرنے والوں نے اس

کے تاریخ سے بے پروا ہو کر اسے عالمِ لاشعوریت میں وضع کیا ہے۔ اس کا پہلا نتیجہ صحابہ کرام کی توہین و تنقیص ہے۔ اس افسانہ سے صاف ظاہر ہے کہ صحابہ کرام کی جماعت کثیر سادہ لوح اور فہم و فراست سے اس طرح عاری و عاطل تھی کہ وہ ایک نومسلم یہودی کے پروپیگنڈا کا شکار ہو گئی۔ اب سوادِ اعظم کو دو صورتوں میں سے ایک صورت کو اختیار کرنا پڑے گا۔

۱۔ عبداللہ ابن سبا ایک افسانوی کردار اور ایک خیالی و فرضی شخصیت ہے بعض سیاسی ضروریات اس کی تخلیق کا سبب ہوئی ہیں۔

یا

۲۔ حدیث اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھدیتم "میرے صحابی ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کسی کی بھی پیروی کی جائے ہدایت پا جاؤ گے۔" اس حدیث کی رو سے جو حضرت ابوذر کی پیروی کرلیں وہ بھی ہدایت پر ہیں؟

سوچیئے اور فیصلہ کیجیئے۔

عبداللہ ابن سبا کے افسانے کو وضع کرنے والوں نے حضرت ابوذر غفاری کے متعلق جو زہر فشانی کی ہے وہ آپ پڑھ چکے۔ حالانکہ حضرت ابوذر کی تبلیغی سرگرمیاں حضرت رسول کریمؐ کی ان امیدوں کی بنیاد پر قائم تھیں جو انھیں ان سے تھیں انھوں نے حضرت ابوذر سے اسی امر پر بیعت لی تھی کہ حق کو ظاہر کرنے میں کسی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے

اور کسی طاقت سے مرعوب و مغلوب ہو گے۔ اے ابوذر۔ میں تمھیں آخرت میں اسی حال میں دیکھنا چاہتا ہوں جس حال میں تمھیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اے ابوذر تمھارے جذبۂ ایمانی کی وجہ سے خدا تمھیں دوست رکھتا ہے اور اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں بھی تمھیں چاہوں[1]۔

ابوذر! میں تم میں قرآن اور اہل بیت کو چھوڑے جا رہا ہوں۔ خدا سے میری دعا ہے " وال من والاھم وعاد من عاداھم" اے دوست رکھ جو میری آل کو دوست رکھے اور ان سے دشمنی کر جو میری آل کے دشمن ہوں۔ میرے بعد خلافت ملوکیت سے بدل جائے گی[2] شاہانہ جاہ و حشم اسلام پر چھا جائیگا' اے ابوذر تمھیں حق گوئی کی پاداش میں طرح طرح سے ستایا جائے گا۔ لیکن خبردار جذبہ سے کام نہ لینا اور صبر کو شعار و وقار اور اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لینا۔ میں تمھیں تمھاری صداقت کی سند دیے جا رہا ہوں[3]۔

بھلا ان حالات میں کون زیرک و دانا انسان کہہ سکتا ہے کہ حضرت ابوذر اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں کسی ابھارنے والے کے محتاج تھے۔ اور جب کوئی انھیں ابھارتا تھا تو وہ اپنی تبلیغی سرگرمیاں تیز کر دیتے تھے۔ اور کیسے اس امر میں شک ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کرتے تھے وہ خدا و رسول کے منشا کے مطابق نہ تھا۔ اسے کون نظر انداز کر سکتا ہے کہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ:۔

---

[1] مشکوٰۃ شریف [2] تاریخ الخطیب البغدادی

[3] الغفاری ص ۲۷۵ و ص ۲۷۶

"اگر ابوذر کی رگِ گردن پر تلوار کی دھار بھی رکھ دی جائے اور کسی سچی بات کی تبلیغ اس سے رہ گئی ہو تو وہ اسے نافذ کر کے رہیگا۔ میرے دوست (محمد مصطفےٰ ص) نے وصیت کی ہے کہ میں سچ بات کہوں، اگرچہ وہ تلخ ہی کیوں نہ ہو۔"[1]

حضرت ابوذر کے متعلق جناب رسالت مآب کے ارشادات :-

"شامیانۂ آسمان کے نیچے اور فرش کے اوپر ابوذر سے زیادہ سچ بولنے والا کوئی نہیں"[2]

اس حدیث کی توثیق و تفصیل میں علامہ سبیتی لکھتے ہیں :-

حضرت رسولِ کریمؐ نے اپنے اصحاب کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اے میرے اصحاب تم میں سے کون ایسا ہے جو اسی حالت میں قیامت کے دن مجھ سے ملے گا جس حال اور خیال میں اسے چھوڑ کر دنیا سے جاؤں گا۔ یہ سنکر سب خاموش رہے۔ صرف ابوذر بولے اے مولا! وہ میں ہوں۔ حضرت نے فرمایا، بے شک سچ کہتے ہو اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ اے اصحاب یاد رکھنا، میں سب کے سامنے کہہ رہا ہوں کہ آسمان نے سایہ نہیں کیا اور زمین نے اوپر نہیں اٹھایا کسی ایسے شخص کو جو ابوذر سے زیادہ راست گفتار ہو۔[3]

---

[1] مسند احمد حنبل الغفاری ص ۲۰۶ [2] ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۸۲۔ مجالس المومنین ص ۹۴۔ طبقات ابن سعد ج ۴ ص ۱۶۷۔ مستدرک حاکم ج ۳ ص ۳۴۲۔ اصابہ جلد ۴ ص ۲۶۲۔ جامع صغیر مناوی ج ۵ ص ۴۲۳

[3] تاریخ الائمہ ص ۲۰۷

ناظرین کرام علم رجال کی روشنی میں افسانۂ ابن سبا کی حقیقت واضح کردی گئی لیکن اگر اسے صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو خود مورخ طبری کا بیان اس کے جھٹلانے کے لیے کافی قرار پاتا ہے۔ دیکھیے حضرت عثمان ۳ محرم ۲۴ھ کو خلیفۂ وقت قرار پائے۔ واقعہ حضرت ابوذر بروایت تاریخ کامل سنہ ۳۰ھ میں ظہور پذیر ہوا اور ان کی وفات بمقام ربذہ مطابق عام تواریخ ۳۲ھ میں اور بروایت طبری ۳۱ھ میں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ فتنۂ ابن سبا کا ظہور ۳۱ھ و ۳۲ھ کے درمیان ہونا چاہیے۔ تاکہ مطابق تحریر علامہ مصری و گیلانی یہ کہا جا سکے کہ ابن سبا نے حضرت ابوذر کو بہکایا تھا۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ خود مورخ طبری تحریر فرماتے ہیں کہ ۳۵ھ میں عبداللہ بن سبا نے مذہب رجعت ظاہر کیا۔ اور مخلوق کے ایک گروہ نے اسے قبول کیا اور وہ گمراہ ہو گئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (فارسی ترجمہ تاریخ طبری ج ۴ ص ۵۲۲ طبع لکھنؤ سال ۱۲۹۱ھ۔ اس سے صاف واضح ہے کہ عبداللہ ابن سبا ۳۵ھ میں ظاہر ہوا اور حضرت ابوذر ۳۰ھ یا ۳۱ھ میں انتقال فرما چکے۔ پھر عبداللہ ابن سبا کا ابوذر کو بہکانا کیا معنی اور مورخ طبری کا لکھنا "واللہ اعلم بالصواب" ظاہر کر رہا ہے کہ مورخ طبری کو خود اس کے وجود کا یقین نہیں تھا۔
(الغفاری ص ۲۸۴)

عبداللہ ابن سبا کے افسانہ کو جو طبری کی ایک خبر پر مبنی ہے تسلیم کرکے صحابہ کرام کی توہین و تنقیص ہوتی ہے اور سرکار رسالت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تکذیب، حضرت عثمان، حضرت طلحہ و حضرت زبیر کے

واقعات پر پردہ ڈالنے کے لیے صحابہ کی توہین اور رسول اللہ کی تکذیب کا مرتکب ہونا کسی باایمان صاحبِ عقل و شعور کے لیے شایان نہیں جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک صحابہ غیر معصوم ہیں۔ کسی غیر معصوم کو تنقید سے بچانے کے لیے تکذیبِ رسالت اور توہینِ صحابہ کا مرتکب ہونا بہت گھاٹے کا سودا ہے۔ عصمت تو صرف محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام کے لیے ہے جس پر شیعوں کا اعتقاد ہے۔ اور بعض اہلِ سنت بھی اسی امر کے معتقد ہیں۔ چنانچہ علامہ محمد معین السندی اپنی کتاب دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنہ بالحبیب میں لکھتے ہیں:۔

آیۂ تطہیر کا اطلاق بلا شائبہ اہل بیت کے ائمہ اثنا عشر اور سیدۃ النساء العالمین بضعۃ الرسولؐ ام الائمۃ زہراء الطاہرہ پر ہوتا ہے بے شک یہ سب کے سب معصوم ہیں۔[1]

اور یہ کہنا کہ علی علیہ السلام کا وصیِ رسول اللہ ہونا صرف عبداللہ ابن سبا کا عقیدہ تھا قطعاً غلط ہے۔ یہ عقیدہ جمہورِ اسلام کا عقیدہ ہے جیسا کہ احادیث متفق علیہ فریقین سے ثابت ہے۔ جن میں سے دو حدیثیں ہم نقل کرتے ہیں:۔

۱۔ ابوسعید خدری سلمان فارسی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ ہر نبی کے لیے وصی ہوتا رہا ہے حضور کا وصی کون ہے؟ فرمایا کہ تو جانتا ہے کہ موسیٰ کا وصی

---

[1] دراسات اللبیب ص ۲۳۸ و ص ۲۳۹

کون تھا؟ میں نے عرض کیا کہ یوشع بن نون۔ حضرت نے فرمایا کیوں؟ میں نے گذارش کیا، اس لیے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں سب سے زیادہ عالم تھے۔ پس آپ نے فرمایا، کہ میرا وصی اور میرا راز دار اور جن لوگوں کو میں اپنے بعد چھوڑتا ہوں ان سب سے بہتر اور میرے وعدوں کو پورا کرنے والا اور میرے قرضوں کو ادا کرنے والا علیؓ ابن ابیطالب ہے[1]

۲ ۔ انس روایت کرتے ہیں کہ سلمان نے رسول اللہ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ میرا بھائیُ میرا وزیر اور میرا وصی اور میرے پیچھے رہنے والوں میں سب سے افضل علیؑ ابن ابی طالب ہیں[2]

فرضی شخصیت عبداللہ ابن سبا کا ظہور ۳۵ھ میں ہوا اور سلمان نے زمانہ حضرت عمر میں انتقال فرمایا۔ معلوم ہوا کہ صحابت کا عقیدہ اسلامی عقیدہ ہے جو مزعومہ عبداللہ ابن سبا سے پہلے موجود تھا۔

ان بیانات سے اظہر من الشمس ہے کہ عبداللہ ابن سبا ایک فرضی شخصیت ہے۔

---

[1] اخرجہ ابوبکر ابن مردویہ والطبرانی فی الکبیر فی مسند سلمان الفارسی، ارجح المطالب صہ ۲۴

[2] ارجح المطالب صہ ۲۴

تاریخ سازی یا تاریخ نویسی

مسلمانوں میں تدوین تاریخ کا سلسلہ بنی امیہ کے عہد میں شروع ہوا۔ بنوامیہ کے سب سے پہلے تاجدار معاویہ بن ابی سفیان کے زمانے میں سب سے پہلی تاریخ کی کتاب "اخبار الماضیین" لکھی گئی۔ تاریخ کے اس دور کی خصوصیت ہے کہ یہ تاریخ نویسی نہیں تھی بلکہ تاریخ سازی تھی جس میں اربابِ اقتدار آلِ محمدؐ کے کارناموں پہ پردے ڈالنے میں مصروف رہے۔ یہ مہم آج تک جاری ہے اور روبہ ترقی ہے۔ عصرِ حاضر میں جو روشنی اور ترقی کا زمانہ کہلاتا ہے اس میں علومِ مغربیہ سے مزین لوگ بھی تاریخ میں غلط فہمیاں پیدا کرنے اور آلِ محمدؐ کے کارناموں کو چھپانے میں سرگرمِ عمل ہیں۔ یہاں ہم صرف دو عظیم دانشگاہوں کے بلند مرتبہ پروفیسروں کی نامناسب جدو جہد کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں اور یہ دونوں حضرات "حمید" ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ۔ استاذ قانون بین الممالک جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

۲۔ ڈاکٹر حمید الدین ایم۔ اے (پنجاب) ایم۔ اے (دہلی) پی ایچ۔ ڈی لیکچرار شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے تاریخ کا پوسٹ مارٹم کیا ہے اور حقائق کو جسمِ ملت سے نکال دیا ہے۔ ان کی تالیف ہے "عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ" قارئین کو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا، کہ عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ جتنے بھی انھوں

نے لکھے ہیں وہ "غالب کل غالب اسد اللہ الغالب" یعنی لافتیٰ الّا علیؑ سے خالی نظر آتے ہیں۔ لطف تو یہ ہے کہ شبِ ہجرت میں بستر رسالت پر علی علیہ السلام کی فداکاری اور جان نثاری کو چھپانے کی مذموم کوشش بھی موجود ہے۔ لکھتے ہیں :-

"جب آپ کی جان کے خلاف ایک سخت خطرناک اور زبردست سازش کی گئی تھی۔ مکے سے نکلتے، غارِ ثور میں چھپتے عام رستے سے بچتے اور پہاڑوں اور وادیوں سے ہوتے ہوئے مدینہ کی جنوبی آبادی قبا پہنچتے ہیں۔ اونٹوں کا ایک مختصر قافلہ جس میں آنحضرت اور آپ کے یارِ غار حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ایک غلام اور ایک رہبر تھا قبا پہنچا۔"[1]

ایسی حق پوشی کا پتہ انسانوں کو مرنے بعد ہی چل سکے گا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جنگِ بدر جہاں پچاس فی صدی کفار کو علی علیہ السلام نے قتل کیا تھا اس علی کا کہیں ذکر نہیں۔ حالانکہ موجودہ زمانے کے انصاف پسند مورخ حضرت علی علیہ السلام کو بدر کا ہیرو کہتے ہیں۔

"اس حق پوشی کا فیصلہ کرنے والا احکم الحاکمین اللہ ہی ہے۔"[2]

جنگِ احد میں بھی اس جان نثار علیؑ کا کہیں ذکر نہیں۔ جس نے

---

[1] عہدِ نبی امیہ کے میدانِ جنگ ص۱۰
[2] دیکھیے عہدِ نبیؐ کے میدانِ جنگ از ص۱۴ و ص۱۵

رسول اللہ کے سامنے سینہ سپر ہو کر رسول اللہ کی جان بچائی اور شکست کو فتح سے بدلا۔

غزوۂ احزاب یعنی خندق میں اس کل ایمان علیؑ کا جس کی ایک ضرب[1] عبادتِ ثقلین سے بڑھی ہوئی تھی۔ کہیں ذکر نہیں نہ ہی عمرو ابن عبدوُد کا ذکر ہے حالانکہ خندق کی کھدائی میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کا مٹی دھونا نہایت شدومد سے دکھلایا گیا ہے۔ لاکھ اخفا کی کوشش کی جائے مگر ؎

"پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا"

فتح مکہ میں شیرِ حبشی کا ثبوت موجود ہے مگر دیکھنے والے چشمِ عرفان سے دیکھ رہے ہیں ؎

علیؑ بر دوشِ احمدؐ چشمِ بد دور
ازاں شد معنیٔ نورٌ علیٰ نورٌ
بود چوں گفت نبی بالاتر از عرشِ بریں
زاں سبب شد جائے پائت یا امیرالمومنینؑ[3]

جنگِ حنین میں بھی مظہر العجائب والغرائب کا نام نہیں لیتے[4] فاتح خیبر، کرار غیر فرار جو اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور رسولؐ اس سے محبت کرتے ہیں کا نام لینا اس مولف کے نزدیک گناہ ہے۔

---

[1] عہدِ بنی امیہ کے میدانِ جنگ (اُحد) صفحہ ۲۹ تا صفحہ ۳۳ [2] خندق صفحہ ۳۴ تا صفحہ ۴۲

[3] فتح مکہ صفحہ ۴۴ تا صفحہ ۴۸ [4] حنین صفحہ ۴۸ تا صفحہ ۵۴

حق پوشی کی سب کوششیں رائیگاں جائیں گی۔
حق، حق رہے گا اور حق پوش مواخذہ میں ہوں گے۔

— نالی اللہ المشتکی

۲۔ ڈاکٹر حمید الدین ایم۔ اے لیکچرار شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی

حزبِ اقتدار کے مورخین کا ایک مغالطہ اور اسکی تردید

ڈاکٹر حمید الدین صاحب پر ہی موقوف نہیں۔ بلکہ عام مورخین عامہ عوام کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے شیعہ کے نظریہ حکومت الہیہ کی غلط ترجمانی اس طرح پر کرتے ہیں:-

"شیعہ ایک خاص خاندان یعنی اہل بیت کو حکومت کا حقدار سمجھتے ہیں انھوں نے یہ تخیل ایران سے لیا تھا۔ ایران میں شاہی خاندان کے افراد کے سوا کوئی دوسرا بادشاہ بننے کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا"[1]

اسی جادۂ پامال پر ہمارے فاضل مورخ ڈاکٹر حمید الدین صاحب بھی گامزن ہوئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

خلافت اور اہلبیت

خلافت کے متعلق قرآن مجید میں کسی مخصوص طریق انتخاب کا

---

[1] پانچ پروفیسروں کی تالیف تاریخ خلافت اسلامیہ

ذکر نہیں ہے۔ معتبر حدیثیں بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے اس نظام کو خود امت پر چھوڑ دیا ہے کہ حالات زمانہ اور ضرورتِ وقت کے مطابق جو طریقہ بہتر ہو اس پر عمل کر کے خلیفہ منتخب کر لیا کریں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے پہلے تینوں خلفاء کے انتخاب مختلف طریق پر ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ کو مہاجرین و انصار ہر دو نے متفقہ طور پر کچھ بحث و تمحیص کے بعد خلیفہ تسلیم کر لیا۔ اور ساری اُمتِ اسلامیہ نے بلا چون و چرا آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یہ طریقہ سراسر جمہوری تھا۔ حضرت عمرؓ کو خلیفہ اول نے نامزد کیا تھا۔ مگر یہ نامزدگی بھی جمہوری اصولوں کے عین مطابق تھی۔ کیونکہ اس سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ نے اکابر صحابہ سے مشورہ کیا اور سب نے بالاتفاق رائے اس انتخاب کی داد دی اور تائید کی تھی۔ یہاں تک کہ حضرت علیؓ نے بھی اس نامزدگی پر اعتراض نہ کیا۔ حالانکہ خلیفۂ اول کے انتخاب پر انھوں نے اپنی نارضامندی کا اظہار کیا تھا۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت بھی جمہوری آئین کے مطابق عمل میں آئی۔ چونکہ یہ انتخاب چھ معتدر صحابہ نے باہمی مشورے سے کیا تھا۔

مگر اس دوران میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ خلافت صرف اہل بیت کا حق ہے۔ (اہل بیت سے مراد

خود حضرت علیؓ اور ان کی اولاد ہے) اور وہ لوگ جو خلافت پر متمکن ہیں ظالم اور غاصب ہیں، ان کے نزدیک خلیفہ کا انتخاب جمہوری نہیں بلکہ قرابتداری کی بنا پر ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس فرقے نے ایک بہت بڑا فتنہ برپا کر کے حضرت عثمان کو شہید کر دیا۔

لیکن حضرت علیؓ کے بھی انتخاب میں جمہوری روح موجود تھی چونکہ آپ نے صحابہ کے پیہم اصرار سے مجبور ہو کر یہ بار اٹھانا قبول کیا تھا، نیز حضرت عمر کی وفات کے بعد حضرت عبدالرحمن بن عوف نے چھ صحابہ کی کمیٹی میں سے حضرت عثمان اور حضرت علیؓ کو خلافت کا اہل قرار دیا تھا۔ اور جب عثمان دنیا سے اٹھ گئے، تو قدرتی طور پر خلافت کا حق حضرت علیؓ کو پہنچتا تھا مگر حامیانِ اہل بیت نے حضرت علیؓ کے اس انتخاب کو ان کی ذاتی اہلیت اور استعداد کی بنا پر نہیں بلکہ قرابت داری کی رُو سے تسلیم کیا تھا۔ وہ آپ کو اس عہدے کا مستحق اس لیے گردانتے تھے کہ آپ حضور صلعم کے نزدیک ترین رشتہ دار اور وصی تھے۔ ان کے عقیدہ میں جمہوری طرز پر خلیفہ کا انتخاب بے انصافی اور خلافِ انصاف تھا۔ کیونکہ یہ حق اہل بیت کے لیے مخصوص ہے، چنانچہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اپنے اس اعتقاد پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے بڑے

بیٹے حضرت حسنؑ کو خلیفہ بنا لیا اور جمہوری انتخاب ختم کر دیا۔ رہی سہی کسر بنی امیہ اور بنی عباس نے پوری کر دی جبکہ خلافت سراسر موروثی حق ہو کے رہ گئی"[۱]

یہ ہے وہ زہر فشانی جو ڈاکٹر صاحب ممدوح نے فرقۂ شیعہ کے خلاف فرمائی ہے۔ انکا یہ کارنامہ یا تو لاعلمی اور جہالت کا شاہکار اور یا عصبیت و تعصب کا شاہ پارہ ہے۔ یا تو انھیں شیعہ اصول و عقائد کا علم ہی نہیں اور یا پھر ان کا تجاہل عارفانہ ہے۔ ع

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

شیعہ تیرہ سو برس سے اس امر کا اعلان کر رہے ہیں کہ ہم ائمہ اہل بیت کی امامت کا عقیدہ وراثت اور قرابت داری کی وجہ سے نہیں رکھتے۔ بلکہ ہمارے عقیدہ کی بنیاد نص و احدیت و رسالت و عصمت و طہارت و علم لدنی پر ہے۔

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا (غالب)

ہم اپنی اسی کتاب کی دوسری جلد میں اور دوسری کتابوں میں لکھ چکے ہیں ہمارے متقدمین نے اعتقادات و تاریخ و حدیث و تفسیر میں ہمیشہ سمجھایا ہے کہ امامت الہی منصب، مقدس عہدہ، اور رسالت کے احکام و سنن کو نافذ العمل کرنے والا عہدہ ہے۔ جس کے لیے کمال علم و نفس و عصمت

---

[۱] تاریخ اسلام مرتبہ ڈاکٹر حمید الدین لیکچرار شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

کی ضرورت ہے اور چونکہ یہ کمال آلِ محمدؐ کے لیے مخصوص ہے لہٰذا وہی امام ہیں اب رہا خاندان میں امامت کا ہونا تو یہ قدیم سنتِ الٰہی ہے۔

پروفیسر صاحب فرماتے ہیں۔ خلافت کے متعلق قرآنِ مجید میں کسی مخصوص طریق انتخاب کا ذکر نہیں ہے، معتبر حدیثیں بھی اس بارے میں خاموش ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے اس نظام کو خود امت پر چھوڑ دیا ہے۔

خاندانی قرابت سے حصولِ حکومت کا نظریہ شیعوں کا نظریہ نہیں، بلکہ حضرت ابوبکر کا نظریہ ہے جنھوں نے انصار کے مقابلہ میں حقِ قرابت کو پیش کر کے اور رسول اللہؐ کی عزیز داری کی اپیل سے انھیں مرعوب کر کے اپنے مقصد کو حاصل کیا ہے۔

فاضل موصوف کو اپنے اس بیان کا مندرجہ ذیل سوالات کی روشنی میں جائزہ لینا چاہیے تھا:۔

۱۔ کیا قرآنِ مجید نامکمل کتاب ہے جو نظریۂ حکومت جیسے اہم اصول کے متعلق خاموش ہے؛ جس پر انسانی اصلاح معاشرہ و تمدن کا انحصار ہے؟

۲۔ کیا معتبر حدیثوں کی خاموشی معاذ اللہ رسول اللہؐ کی فرائض کی کوتاہی کی دلیل ہیں؟

۳۔ کیا نظریۂ حکومت مسلمانوں میں تشنۂ تکمیل ہے؛ پھر الیوم اکملت لکم دینکم کے کیا معنی ہیں؟

۴ ۔ کیا یہ کہنا کہ اسلام نے نظریۂ حکومت کو بیان نہیں کیا، قرآن کی تکذیب نہیں ؟

۵ ۔ یہ اصول کہ شریعت نے اس نظام کو خود امت پہ چھوڑ دیا ہے قرآن کی کس آیت یا رسول اللہ کی کس حدیث سے مستنبط ہے ؟

۶ ۔ کیا ایسے حضرات جو نہ نصِ احدیت سے اور نہ نصِ رسالت سے خلیفہ ہوئے ہوں انھیں خلیفۃ اللہ یا خلیفۂ رسولؐ کہہ سکتے ہیں ؟

۷ ۔ جنھیں مسلمان منتخب کریں وہ خلیفۃ اللہ یا خلیفۂ رسولؐ کی بجائے خلیفۃ المسلمین کہلانے کے زیادہ مستحق نہیں ؟

قرآن نے نظریۂ حکومت کا جس طرح ذکر کیا ہے اسے ہم نے اسی تالیف اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے حصہ دوم میں بیان کیا ہے [1]

خلافت کے متعلق معتبر احادیث ہماری اس تالیف اسلام و مسلمانوں کی تاریخ کے پہلے حصہ میں موجود ہیں ۔

شیعوں نے قرآنی نظریۂ حکومت اور احادیث معتبرہ کی نص سے خلافت کے نظریہ کو اختیار کیا ہے جس کی عملی وضاحت رسول اللہ نے میدان خم غدیر میں فرما دی تھی ۔ جب عام مسلمانوں نے انسانی حاکمیت کے نظریہ کو عملاً اپنا لیا تو یہ گروہ سلیم حزبِ اختلاف میں تبدیل ہو گیا ۔ اور ہم اس وقت تک اصولاً حزبِ اختلاف میں رہیں گے جب تک حکومت الٰہی حاکمیت کے نجوید پہ گرگشت نہیں کرے گی ۔ ہاں مگر ہمارے پیشواؤں نے حزب اختلاف میں رہ کر ہمیشہ تعمیری کام کیا ہے اور تخریبی پروگرام کو کبھی اختیار نہیں کیا

---

[1] اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ حصہ دوم ص ۱۲ تا ۱۵

حزبِ اقتدار کو نیک مشورے دیے اور ایک صالح سیاست کے منصب کو تا امکان نبھایا۔ اگر کبھی کسی حکومت سے چپقلش ہوئی تو اس وقت جب اربابِ اقتدار نے ہمارے پیمانۂ صبر کو لبریز کر دیا اور ہمیں حفاظتِ خود اختیاری کے لیے کوئی اقدام کرنا پڑا جس کا ہر ذی حیات کو فطرتاً حق ہے۔[1]

ہم جن مسلمانوں کی حکومت میں زندگی بسر کریں اس کی سالمیت اس کے دفاع اور اس کے نشو و ارتقا کو اپنا ایمانی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اور مسلمانوں کی کسی حکومت میں افتراق و انتشار پیدا کرنا منافیٔ ایمان سمجھتے ہیں۔ اور اسلامی ملک و ملت و مذہب کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بہانا فریضۂ ایمانی جانتے ہیں۔ صالح و سلیم حکومت کی مخالفت کرنا اہل صفین کا شعار ہے ہمارا نہیں؟

ڈاکٹر حمید الدین صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ پہلے تین خلیفوں کا انتخاب مختلف طریق پر تھا۔

بیشک پہلی خلافت نام نہاد جمہوریت تھی جسے اجماع کہا گیا دوسری نص مگر غیر معصوم کی نص، نامزدگی، اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر نے پہلے طریق کار کو ناپسندیدہ قرار دیا تھا جیسا کہ صحیح بخاری میں اسے فلتۃ کہا گیا۔ چونکہ اب اس طریق کار میں ناکامی کا اندیشہ تھا، اس میں نامزدگی جمہوری اصول کے مطابق کہاں؟ جمہوریت کی سراسر تضحیک ہے۔ تیسرا طریق شوریٰ تھا جس میں جناب امیرؑ نے سلطنت کی پیشکش کو اس لیے مسترد کر دیا کہ اس میں سیرتِ شیخین پر عمل کی شرط تھی اگر جناب امیرؑ نے ان کی خلافت کو تسلیم کیا ہوتا تو سیرتِ شیخین

[1] اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ حصہ دوم ص ۱۹

کی شرط پر حکومت کو مسترد نہ فرماتے۔ حضرت ابوبکر کی حکومت جمہوری نہیں تھی۔ اس پر ہم نے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ حصہ دوم میں ایک باب سپرد قلم کیا ہے[1]

جناب امیرؑ حزبِ اختلاف کے لیڈر رہے۔ جو ملک و ملت کے فلاح و بہبود کے لیے خلافتِ مسلمین کو نیک مشورے دیتے رہے اور تعمیری پروگرام میں حصہ لیتے رہے اور اپنے استحقاق کے لیے احتجاج بھی فرماتے رہے یہ سراسر بہتان ہے کہ حضرت عثمان کے خلاف حکومت کو اہل بیت کا حق سمجھنے والوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جس نے حضرت عثمان کو قتل کر دیا حضرت عثمان کے قتل میں دولت اور اقتدار کی غلط تقسیم، طبقاتی امتیاز معاشرہ میں عدم توازن، اقربا، نوازی اور دوست پروری کے عناصر سرگرم عمل تھے یہ ایسی حقیقت ہے جس سے تاریخ کا کوئی انصاف پسند مطالعہ کرنے والا انکار نہیں کر سکتا۔ جناب امیر علیہ السلام کی خلافت نص قرآنی پر مبنی تھی اس لیے وہ خلیفۃ اللہ تھے۔ رسول اللہؐ نے ان کی خلافت کا اعلان فرمایا۔ اس لیے خلیفۂ رسولؐ تھے۔ ان کے انتخاب میں جمہوری روح موجود تھی اس لیے وہ خلیفۃ المسلمین تھے۔ وہ صفاتِ عصمت و علم و شجاعت کے لحاظ سے بھی خلیفہ تھے اور حقِ وراثت سے بھی جس حیثیت سے بھی انھیں پرکھا جائے وہ خلیفہ تھے۔ شیعوں کے ہاں انتخاب ہے مگر وہ پبلک الیکشن نہیں جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے بلکہ ڈیوائن سلیکشن

[1] حضرت ابوبکر کی سلطنت کو جمہوری سلطنت نہیں کہہ سکتے۔ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ از ص ۲۰۹ تا ص ۲۱۰

(Devine Selaction) جس میں الٰہی تقرر صفات سے ہوا کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے بنی امیہ اور بنی عباس کے جمہوری طریق کو ختم کرنے کے الزام کو شیعوں کے سر تھوپنے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ امام حسن علیہ السلام علیؑ کے بڑے بیٹے کو خلیفہ بنا کر جمہوری طریق انتخاب کو ختم کر دیا۔ ان کا یہ خیال تاریخ پر بھی ظلم عظیم ہے۔ اور شیعوں پر بھی۔ شیعہ نقطہ نگاہ سے وہ صفت عصمت و علم لدنی کے حامل نص احدیت و رسالت سے خلیفہ اور سوادِ اعظم اہل سنت کے نزدیک ان کا انتخاب جمہور نے کیا تھا۔ تاریخی مسلمات کو مسخ کرنا تاریخ پر ظلم عظیم ہے۔

چنانچہ پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم و پروفیسر محمد شجاع الدین تحریر فرماتے ہیں :-

"شہادت جناب امیرالمومنین اور ان کی تدفین کے بعد اہلِ کوفہ جامع مسجد میں جمع ہوئے اور انھوں نے حضرت حسنؑ کے ہاتھ پر ان کی ذاتی خوبیوں کی بنا پر بیعت کی۔ سب سے پہلے قیس بن سعد انصاری نے بیعت کی اور اس کے بعد تمام حاضرین نے باری باری یہ سعادت حاصل کی۔

پہلے چار خلیفوں کو دارالحکومت مدینہ کی اکثریت کے فیصلے اور بیعت نے خلیفہ بنایا۔ حضرت حسنؑ کی تخت نشینی

کے وقت مدینہ کی بجائے کوفہ دارالخلافہ تھا۔ لہذا یہ حق اہلِ کوفہ کا تھا۔ کہ وہ شخصی خوبیوں کی بنا پر جسے چاہیں خلیفہ رسولؐ منتخب کر لیں۔ حضرت حسنؓ کا تختِ خلافت پر متمکن ہونا خلافت راشدہ کے اصولوں کے عین مطابق تھا۔ اس لیے آپ کو پانچواں خلیفہ راشد متصور کیا جاتا ہے حضرت حسنؓ کے انتخاب خلافت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے۔ کہ خلافت راشدہ میں باپ کے بعد بیٹا بھی تختِ خلافت کی زینت بن سکتا ہے بشرطیکہ اسے بڑے باپ کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے خلیفہ نہ بنایا جائے بلکہ اس میں جوہر ذاتی بھی ہو علاوہ ازیں باپ اسے اپنی زندگی میں خود ولی عہد نامزد کر کے رعایا سے جبراً اس فیصلہ کی تائید نہ کرائے بلکہ رعایا خود بخود اس کی شخصی خوبیوں سے متاثر ہو کر اسے اپنا حاکم مان لے"[1]

ابو نعیم عبدالحکیم خان نشتر جالندھری اور عبدالحمید صاحب حمید ایم۔اے ایم۔او۔ایل اپنی تاریخ اسلام میں لکھتے ہیں:۔

"لوگوں کو معلوم تھا۔ کہ محاسن و کمالات کے اعتبار سے حضرت امام حسنؓ کے سوا حضرت علیؓ کا بہترین جانشین کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے سب سے پہلے قیس بن سعد انصاری نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اور کہا "میں کتاب و سنت اور محلین سے

---

[1] تاریخ اسلام حصہ اول مرتبہ پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم و پروفیسر محمد شجاع الدین صفحہ ۳۹۳

جنگ پر آپ سے بیعت کرتا ہوں۔" آپ نے فرمایا کتاب و سنت ہی کافی ہے اور تمام شرائط پر حاوی ہے۔ اس کے بعد تمام اہل عراق جوق در جوق آ کر بیعت کرنے لگے۔ اور رمضان سنہ ۴۰ھ میں حضرت امام حسنؑ نے مسندِ خلافت کو زینت بخشی۔[1]

جسٹس سر سید امیر علی لکھتے ہیں:-

Hassan the eldest son of Ali was elected to the vacant Khilafat by the unanimous Suffrage of Kufa and its dependencies.[2]

"حضرت علیؑ کے فرزندِ اکبر امام حسن علیہ السلام کو خلافت کی خالی اسامی کے لیے کوفہ اور اس کے مضافات کی رائے عامہ نے منتخب کیا۔"

حضرت علیؑ کی وفات کے بعد امیر معاویہ کے مقبوضہ علاقہ کے علاوہ سارے ملک کی نظریں حضرت حسنؑ کی طرف تھیں۔ چنانچہ والد بزرگوار کی تدفین سے فراغت کے بعد آپ جامع مسجد میں تشریف لائے۔ مسلمانوں نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ آپ نے ان

---

[1] تاریخ اسلام نشتر جالندھری صفحہ ۲۶۳

[2] History of the Saracens P. 70.

سے بیعت لی ہے۔[1]

اس کے بعد ڈاکٹر حمید الدین صاحب حضرت ام المومنین عائشہ کے لشکر کے بصرہ پر قابض ہو جانے کے بعد لکھتے ہیں :-

"بصرہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد اعلان عام کر دیا گیا کہ جس جس قبیلہ میں ایسے لوگ ہوں۔ جو حضرت عثمان کے قتل میں شریک تھے پکڑ کر لائے جائیں، چنانچہ اس قسم کے بہت سے لوگ لائے گئے اور جو مجرم ثابت ہوئے انھیں قتل کر دیا گیا"۔[2]

جو لوگ بصرہ میں جوشِ انتقام میں اسی طرح قتل کر دیے گئے جس طرح عبیداللہ ابن عمر نے ہرمزان، جفینہ اور فیروز کی کم سن لڑکی کو قتل کر دیا۔ ورنہ بصرہ میں کونسا بورڈ آف انکوائری تشکیل دیا گیا تھا جس کی تحقیقات کے بعد ملزموں کو جنکی تعداد بعض تاریخوں کی رو سے ۶۰۰ سو تک تھی۔ سزائے موت دی گئی جبکہ ڈاکٹر صاحب کو خود اعتراف ہے کہ اس قتل کی کوئی عینی شہادت موجود نہیں تھی :-

"مگر یہ معاملہ بڑا پیچیدہ تھا، سب سے بڑی الجھن یہ تھی۔ کہ کوئی عینی شہادت موجود نہ تھی۔ قتل کے وقت صرف حضرت نائلہ وہاں موجود تھیں اور وہ اپنے ضعفِ بصارت اور بڑھاپے کی وجہ سے کسی کو پہچان نہ سکتی تھیں"۔[3]

---

[1] سیر الصحابہ ج ۶ صہ ۶ [2] تاریخ اسلام ڈاکٹر حمید الدین صہ ۱۹۲
[3] تاریخ اسلام ڈاکٹر حمید الدین صہ ۱۹۱

ڈاکٹر حمیدالدین صاحب نے بھی سبائیوں کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

"علوی فوج میں سبائیوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ اور انھیں یقین تھا۔ کہ مصالحت کی صورت میں ان کی خیر نہیں۔ اس لیے جس صبح کو صلح کا اعلان ہونا تھا اس روز انھوں نے شرارت کر کے اہل بصرہ پر حملہ کر دیا"۔[1]

ہر وہ شخص جو تاریخ اسلام پر عادلانہ نظر رکھتا ہے جانتا ہے کہ سرکار ولایت علی ابن ابیطالب علیہ السلام جارحانہ اقدام کے سخت خلاف تھے، ان کی اپنے عساکر کو ہدایات اور میدان جنگ کے متعلق جناب امیر علیہ السلام کے احکامات اس حقیقت پر شواہد صدق ہیں۔ فاضل مؤلف نے اصحاب جمل کے جارحانہ اقدام پر پردہ ڈالنے کے لیے افسانہ عبداللہ ابن سبا اور اس کے متبعین کی بے وقت کی راگنی چھیڑ کر جناب امیر علیہ السلام کے لشکریوں کو متہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر حمیدالدین نے یہ بھی غلط لکھا ہے کہ جناب امیر نے قیس بن سعد انصاری کو بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے مصر سے بلا لیا تھا۔ اور حضرت محمد بن ابی بکر کو ان کی جگہ مصر کا گورنر بنایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قیس بن سعد انصاری جیسی شخصیت کی مرکز میں ضرورت تھی۔ اس لیے انھیں مرکز میں طلب کر لیا گیا تھا اور ان کی جگہ محمد ابن ابی بکر کو مصر کا گورنر مقرر کیا تھا ایسی روایات بنی امیہ کی ساختہ وضعی روایات ہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے

---

[1] تاریخ اسلام ڈاکٹر حمیدالدین ص ۱۹۳

تاریخ سازی میں ایک عجیب وغریب اضافہ فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اس مسلسل خانہ جنگی اور بدامنی سے گھبرا کر حضرت علیؑ اور امیر معاویہ نے باہم صلح کر لی"۔

کیا صلح اسی کو کہتے ہیں؟ کہ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد اس ذات قدسی صفات پر حضرت معاویہ کے فرمان سے سب وشتم ہوتی رہے اور یہ سب وشتم حضرت معاویہ کے آثار باقیہ کے طور پر سالہا سال تک جاری رہی ہو۔ کیا جس شخص کے باپ نے رسولِ عربیؐ کو اپنی آغوشِ شفقت میں پرورش کیا ہو اور اپنی زندگی بھر ان کی حفاظت کی ہو جس کے خاندان کے افراد نے عظیم الشان قربانیوں سے اسلام کو اسلام بنایا ہو۔ اور عظیم الشان قربانیوں سے اس کی بقا کے سامان کیے ہوں۔ اس پر ایسے خاندان کا ایک بادشاہ جس نے فتح سے پہلے اسلام کو صفحۂ عالم سے مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہو۔ وہ محسنِ اسلام علیؑ پر سب وشتم کرے اور مسلمانوں کی حمیت نہ صرف اسے برداشت کرے بلکہ اس کی حمایت میں حقائق پر پردے ڈالنے کی سعی کرے۔ الی اللہ المشتکی

صلح کیسی؛ جبکہ بعض تاریخی جھروکوں سے ہمیں یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ ابنِ ملجم کی پشت پر حکومت کا ہاتھ ہے اور نمبر خارجیوں کی سازش والی روایت حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے بنی امیہ کے موضوعات میں سے ہے۔ ہم تاریخ ساز مورخوں سے حق وصداقت کے نام پر

لہ تاریخ اسلام ڈاکٹر حمید الدین

عدل و انصاف کا واسطہ دے کر اپیل کریں گے کہ وہ اپنی اس حق پوشی کی روش کو ترک کر کے تاریخ نویسی کے اہم فرائض کو انجام دیں۔ بنو امیہ کا دور گزر چکا۔ ان کے انعام و اکرام کا دور ختم ہو گیا۔ اب کون سے ایسے محرکات ہیں جن پر تیرہ سو برس پہلے کے بادشاہوں کی حمایت کے اعلام بلند کر کے بنی نوع انسان کو ان جھنڈوں تلے آنے کی دعوت دی جائے۔ آج ممالکِ اسلامیہ بڑے نازک دور سے گزر رہے ہیں اس لیے ایسی صحیح تاریخ نویسی کی ضرورت ہے جس کے ذریعے ہم دورِ حاضر کی گتھیوں کو سلجھا سکیں اور الجھنوں کو رفع کر سکیں۔ اور مشکلات کو حل کر سکیں۔ گذشتہ سلاطین کی بے جا حمایت کر کے امپریلیسٹ ویلوز کو فروغ دینا مردِ مومن آزاد مسلم کے شایانِ شان نہیں۔ معاد ہمارا عقیدہ ہے۔ ہم نے میدانِ محشر میں علام کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔ جہاں ہر ذرہ نیکی کے لیے جزا کا وعدہ اور ہر ذرہ بدی کے لیے سزا کا وعید موجود ہے۔ ؏

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

وما علینا الا البلاغ وما توفیقنا الا باللّٰہ هو ولی التوفیق وبیدہ ازمة التحقیق ۔

اسلام کی تاریخ

دورِ سرکارِ صلح و امن

حضرت امام حسن علیہ الصلوٰۃ والسلام

صرف چھ ماہ

آں یکے شمعِ شبستانِ حرم
حافظِ جمعیتِ خیر الامم!
تا نشیند آتشِ پیکار و کیں
پشت پا زد بر سرِ تاج و نگیں

(علامہ اقبال علیہ الرحمۃ)

ذکرالحسنؑ

کنیت واسم سامی حضرت امام حسن علیہ السلام کی کنیت ابو محمد ہے جو سرکارِ رسالت محمد مصطفےٰ ارواحنا الفداء نے تجویز فرمائی اور اکثر فرماتے تھے کہ زمانہ جاہلیت میں یہ کنیت کسی کی نہیں ہوئی۔[1]

آپ کا اسم سامی حسنؑ ہے۔ حسن حسُن سے مشتق ہے جس کے معنی خوبصورت جمیل اور خوشنما ہیں چنانچہ آپ کا حلیہ مبارک ان معنیٰ کا آئینہ دار ہے۔

حلیہ مبارک حضرت امام حسن کی آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی غلافی خوشنما اور خوش منظر تھیں، رخسار پتلے کتابی خد و خال کے تھے۔ کلائیاں گول گاؤ دم تھیں، داڑھی گنجان کانوں کی لو تک بل کھائے ہوئے تھی۔ گردن بلند اور روشن شفاف صراحی کی طرح تھی۔ شانے اور بازو گدگدے اور بھرے بھرے تھے۔ سینہ چوڑا چکلا تھا قد نہ زیادہ طویل نہ کوتاہ گویا میانہ تھا۔ رخ اقدس زیبا، نورانی اور نہایت حسین تھا۔ آپ کے بال گھونگھریالے تھے، وسمہ کا خضاب فرماتے تھے بدن سڈول اور نہایت خوبصورت تھا گویا حسن و جمال کے لحاظ سے اسم بامسمٰی تھے۔

---

[1] نورالابصار ص ۱۱۹

اکثر روایات شاہد ہیں کہ آپ حسن و جمال میں رسول اللہؐ سے مشابہ تھے آپ نصف جسم میں رسول اللہؐ سے کامل مشابہت رکھتے تھے۔ جناب امیر علیہ السلام کا ارشاد ہے جو شخص اسے دیکھنا چاہے جو گردن سے روئے مبارک تک سرکار رسالت محمد مصطفےٰ سے زیادہ مشابہ ہے وہ حسنؑ کو دیکھ لے آں حضرت یہ بھی فرماتے تھے کہ امام حسنؑ سینہ سے سر تک سب سے زیادہ رسالتمآبؐ سے مشابہ ہیں۔ انس بن مالک کہتے تھے کہ امام حسنؑ سے زیادہ کوئی شخص حضرت رسول پاکؐ کا ہم شکل نہیں ہے[1]

سرکار رسالت محمد مصطفےٰؐ کا ارشاد ہے کہ حسنؑ میں میری ہیبت اور سرداری ہے اور حسینؑ میں میری جرأت اور سخاوت ہے (طبرانی) اور یہ امر حسن باطنی کا آئینہ دار ہے[2]

القابات

کثرت القابات کثرتِ فضائل کی دلیل ہے۔ جناب امام حسن علیہ السلام القابات کثیرہ سے ممتاز ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں :-

(۱) تقی (۲) زکی (۳) سبط (۴) ولی (۵) مجتبیٰ (۶) طیّب (۷) نقی (۸) امین (۹) حجت (۱۰) سیّد (۱۱) برّ (۱۲) زاھد (۱۳) صفوۃ اللہ (۱۴) ناصح (۱۵) القائم (۱۶) ریحانۃ النبیؐ (۱۷) شبیہ رسولؐ

ولادت باسعادت

مصرع: نازل ہوئے قرآں کی صورت رمضان میں

ولادت امام حسن علیہ السلام نیم رمضان یعنی

---

[1] کنز العمال جلد ۷، صفحہ ۱۰۶ و صفحہ ۱۰۱
[2] طبرانی

۱۵ رمضان ۳ھ میں ہوئی۔

والدین

آپ کے والد بزرگوار علی مرتضیٰ علیہ السلام ہیں

مسلمِ اول شہِ مرداں علیؑ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؑ

اور والدہ ماجدہ بضعۃ الرسولؐ کہ اگر علیؑ نہ ہوتے تو کائنات میں کوئی ان کا کفو نہ ہوتا۔ اللہ کی زبان وحی ترجمان نے ان کا نام فاطمہؑ رکھا، یعنی اپنے غلاموں کو اور اپنی اولاد کو جہنم سے چھڑانے والی جو صنفِ نسواں کے لیے اسی طرح اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل ہیں جس طرح صنفِ رجال کے لیے محمد مصطفےٰؐ اروا حنا لہ الفدا ہیں، عصمتِ کبریٰ ہیں جس پر آیۂ تطہیر کی مہرِ تصدیق ثبت ہے۔ اللہ نے قیامت تک کے لیے رشد و ہدایت ان کے بطنِ اقدس سے وابستہ کر دیا۔ یہاں تک کہ دنیا کو عدل و انصاف سے پر کرنے والا رسالت کا آخری جزو اور اسلام کو ادیانِ عالم پر غلبہ دینے والا قائم آلِ محمدؐ مہدیٔ موعود عجل اللہ فرجہ بھی فاطمہ طاہرہؑ کا بیٹا ہے۔

فرزندیٔ رسولؐ

اتنے عظیم الشان ماں باپ، اتنے جلیل الشان والدین کے باوجود زبانِ احدیت نے انھیں ابنائنا کے امتیاز سے ممتاز فرما کر دنیا کو بتلا دیا کہ یہ سید المرسلین خاتم الانبیاءؐ کے بیٹے ہیں۔ اللہ نے ان کی ابنیتِ رسولؐ کا قرآن میں ذکر فرمایا۔ حسنینؑ ہی ابنائے رسولؐ ہیں، رسول اللہؐ امت میں سے کسی مرد کے باپ

نہیں حالانکہ انکی بیویاں امت کی مائیں ہیں۔ یہ عجیب ہے کہ بیویاں امت کی مائیں مگر ان کا شوہر باپ نہیں۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ کی ابوّت کو حسنین کے لیے مخصوص رکھنا چاہتا ہے ۔ اور امہات المومنین کی امومت کو عام کرنا چاہتا ہے۔

محبوبِ رسولؐ حضرت ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ فرماتے تھے۔ کہ اہل بیتؑ میں مجھے حسنؑ و حسینؑ سب سے زیادہ محبوب ہیں[1]

سوارِ دوشِ رسولؐ آنحضرت ایک مرتبہ امام حسنؑ کو شانہ پر سوار کیے ہوئے تھے ایک صحابی نے کہا آقا زادہ تم کیسی اچھی سواری پر ہو۔ یہ سنتے ہی رسول اللہ نے بگڑ کر فرمایا کہ یہ سوار بھی تو کیا اچھا ہے[2]

عہدِ طفولیت میں مطالعہ لوحِ محفوظ بخاری کی روایت کے مطابق ایک موقع پر رسول اللہؐ نے امام حسنؑ کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "اما تعلم ان الصدقۃ علینا حرام" کیا تم نہیں جانتے کہ صدقہ ہم پر حرام ہے۔ اس پر علماء نے استعجاب کیا ہے کہ بچوں سے ایک علمی مسئلہ کا سوال کرنا قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا اس پر علامہ ابن حجر عسقلانی نے

---

[1] صحیح ترمذی، فضائل حسنینؑ، سیر الصحابہ ج ۶ ص ۴۲

[2] اسد الغابہ ج ۲ ص ۱۵

اس کی شرح کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

"امام حسن علیہ السلام کا قیاس اور بچوں پر نہیں کیا جا سکتا۔
اس لیے کہ وہ بچپن میں ہی لوح محفوظ کا مطالعہ کرتے تھے"۔ [1]

تعلیم بالحکمت

ایک بوڑھا آدمی وضو کر رہا تھا مگر طریقۂ وضو سے ناواقف تھا۔ امام حسن و امام حسین علیہما السلام دونوں بھائیوں نے اپنے عہدِ طفولیت میں اس مردِ پیر کو غلط وضو کرتے ہوئے دیکھا دونوں نے کہا، ایسے طریقہ سے اسے صحیح وضو کی تعلیم دی جائے کہ اس پیرانہ سالی میں وہ نادم و شرمسار نہ ہو۔ چنانچہ امام حسن علیہ السلام نے امام حسین علیہ السلام سے کہا کہ میں آپ سے اچھا وضو کرتا ہوں۔ امام حسین علیہ السلام نے امام حسن علیہ السلام سے عرض کیا، کریں آپ سے اچھا وضو کرتا ہوں آخر دونوں نے اس بوڑھے سے کہا، اے شیخ تو حکم بن اور فیصلہ دے کہ ہم دونوں میں سے کون اچھا وضو کرتا ہے۔ جب اس نے دونوں شاہزادوں کے وضو کو دیکھا تو عرض کیا کہ آپ دونوں اچھا وضو کرتے ہیں لیکن میں جاہل تھا۔ اب آپ کی عنایت و شفقت سے صحیح وضو کا طریقہ یاد کر لیا۔ یہ ہے علمائے ربانی کا طریقِ تعلیم۔

بچپن کا ایک واقعہ

سرکار رسالت محمد مصطفٰےؐ کے انتقال پُرملال کے بعد حضرت امام حسن علیہ السلام اس طرف تشریف لیے جاتے تھے۔ جہاں حضرت ابوبکر تھے۔ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے منبر پہ ہیں۔ اس پر آپ نے ان سے فرمایا، میرے

[1] فیض الباری

والد کے بیٹھنے کی جگہ ہے اس پر سے آپ اتر آیئے۔ حضرت ابوبکر نے کہا، آپ سچ کہتے ہیں۔ واقعاً یہ آپ کے والد ہی کے بیٹھنے کی جگہ ہے، پھر آپ امام حسنؑ کو گود میں بٹھا کر رونے لگے[1]

عبادات

وضو حضرت امام حسن علیہ السلام جب وضو کرتے تھے، تو حضور کا جوڑ جوڑ کانپنے لگ جاتا تھا، رنگ زرد ہو جاتا تھا۔ جب آپ سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا، جو بھی رب العرش کے سامنے کھڑا ہو اس پر یہ حق ہے کہ اس کا رنگ زرد ہو جائے۔ اور اس کے جوڑ کانپنے لگیں[2]

غور فرمایئے کہ جس بزرگوار کی حیثیت کا مقدمۂ نماز میں یہ عالم ہو، اس پر نماز کی حالت میں کیا خضوع و خشوع کی حالت طاری ہوتی ہوگی۔

تلاوت قرآن مجید اور حسن علیہ السلام

کتاب امالی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب امام حسن علیہ السلام تلاوت کلام پاک فرماتے اور یا ایھا الذین امنوا پڑھتے تو لبیک اللّٰھم لبیک اللّٰھم پڑھتے۔ یعنی حاضر ہوں میرے معبود! میں حاضر ہوں کہتے۔ کلام پاک کی تلاوت کی یہ صورت تھی کہ ہر آیت کو انتہائی غور و تدبر کے ساتھ پڑھتے تھے۔ جب کسی ایسی آیت پر پہنچتے

---

[1] ریاض نضرہ صفحہ ۱۹۱ صواعق محرقہ صفحہ ۱۰۵، تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۰۵

[2] روضۃ الواعظین

جس میں مومنین کو خطاب کیا گیا ہوتا، تو عرض کرتے۔ لبیک اللّٰھم لبیک "میں حاضر ہوں میرے معبود! میں حاضر ہوں"[1]

"تلاوت کے وقت خوف الٰہی کی حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی جب جنت و نار کا تذکرہ ہوتا، تو اس طرح تڑپتے جس طرح بچھو کا کاٹا تڑپتا ہے۔ اور جب موت و مابعد الموت کا ذکر ہوتا تو شدت سے گریہ فرماتے"[2]

جب خدا کے حضور پیش ہونے کا ذکر آتا تو اتنے زور سے چیخ مارتے کہ بے ہوش ہو جاتے[3]

انفاق فی سبیل اللّٰہ حافظ ابو نعیم نے وثوق و صحت کے ساتھ اپنے معتبر راویوں سے بإسناد معتبر اپنی مشہور تالیف حلیۃ الاولیاء میں روایت کیا ہے کہ آنحضرت نے دو بار اپنے جملہ مملوکات سے دست بردار ہو کر اپنا تمام مال راہِ خدا میں خیرات کیا۔ اور تین بار خدا تعالیٰ کے ساتھ اپنے مال و اسباب میں مقاسمہ کیا۔ یعنی آدھا مال اپنے پاس رکھ لیا اور نصف راہِ خدا میں تصدق فرمایا۔ یہاں تک کہ جفت پاپوش سے ایک جوڑا رکھ لیتے اور دوسرا خیرات کرتے[4]

بلا طلب عطا خیرات و صدقات میں حصہ لینا آپ کی خاندانی خصوصیت تھی، جس فیاضی سے آپ اپنا مال و متاع اللّٰہ کی

---

[1] امالی شیخ صدوق [2] اعیان الشیعہ ج ۴ ص ۱۱
[3] امالی شیخ صدوق ص ۱۰۱ [4] مرآۃ الجنان، نور الابصار

راہ میں صرف کرتے تھے۔ اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص بیٹھا ہوا دس ہزار درہم کے لیے دعا کر رہا تھا، آپ نے سن لیا، اس کے پاس دس ہزار درہم نقد بھیج دیے۔[1]

جوازِ سوال کے متعلق مسئلۂ شریعت اور جود و سخا

بحار میں خصال ابن بابویہ سے منقول ہے کہ ایک شخص حضرت عثمان ابن عفان کے پاس آیا۔ جبکہ وہ دروازۂ مسجد پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے سوال کیا اور آپ نے پانچ درہم اسے دیے۔ اس نے عرض کیا کہ مجھے کسی اور سخی کا پتہ نشان بھی دیجیے۔ انھوں نے گوشۂ مسجد میں بیٹھے ہوئے جوانوں کی طرف اشارہ کیا وہ حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ اور حضرت عبداللہ بن جعفر طیار تھے۔ اس شخص نے ان کی خدمت میں پہنچ کر سلام کیا اور مال کا خواہاں ہوا۔ حضرت امام حسن مجتبیٰ نے فرمایا کہ سوال کے کچھ شرائط ہیں انسان کو سوال کرنا اس وقت جائز ہے جبکہ وہ تین حالتوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہو۔

۱۔ دم مضجع۔ خون بہا کی ایسی ذمہ داری جو کام سے بٹھا دے۔

۲۔ او دین مقرح۔ یا قرض کا ایسا فکر جو دل کو مجروح رکھے۔

۳۔ او فقر مدقع۔ یا ایسی تنگ دستی جو ذلیل و رسوا کرے۔

اب تو بتا کر تجھے ان میں سے کون سی صورت درپیش ہے۔ جو تو

---

[1] اسعاف الراغبین ص۱۷۷۔ ابن عساکر ج ۴ ص۲۱۲۔ طبقات کبریٰ شعرانی ج ۱ ص۲۳۔

سوال کرتا ہے۔ اس نے عرض کی کہ ان ہی تین باتوں میں سے ایک امر میرے سوال کرنے کا باعث ہوا ہے۔ جناب امام حسن علیہ السلام نے پچاس دینار عطا کرنے کا حکم دیا، امام حسین علیہ السلام نے انچاس دینار کا اور حضرت عبداللہ ابن جعفر نے اڑتالیس دینار کا۔ جب وہ سائل یہ بیش بہا عطیات لے کر چلا گیا تو پھر اس کا گزر حضرت عثمان کے پاس سے ہوا۔ انھوں نے پوچھا تم نے کیا پایا؟ کہا آپ نے جو دینا تھا دیا اور تحقیق نہیں کی کہ مجھے کیا ضرورت آ پڑی ہے کہ میں سوال کرنے پر مجبور ہوا ہوں۔ اور صاحب وفرہ یعنی امام حسن علیہ السلام نے مجھے ہدایت کی کہ سوال کرنا تین صورتوں میں سے ایک کے بدوں حلال نہیں۔ جب ان میں سے ایک کا میں نے اظہار کیا تو ان میں سے ایک نے پچاس، دوسرے نے انچاس، اور تیسرے نے اڑتالیس دینار مجھے عطا کیے۔ یعنی انھوں نے اعطاء مال کے علاوہ سوال کرنے کے متعلق ایک ضروری مسئلہ بھی مجھے تعلیم کیا، جو تم نے نہیں کیا تھا۔ اس پر حضرت عثمان نے فرمایا، ان کے برابر کون ہو سکتا ہے؟ انھوں نے علم و سخا کو اوروں سے جدا کر لیا ہے۔ اور اپنے لیے ان دونوں کو خاص کر لیا ہے۔ سائل نے امام حسن علیہ السلام کو جو صاحبِ وفرہ کہا ہے یہ لفظِ وفرہ وفور سے مشتق ہے جس کے معنی کثرت و زیادتی کے ہیں۔ یہاں مقصود بالوں کی زیادتی ہے۔ جو امام حسن علیہ السلام کے کان کی لو کے نیچے تک چھٹے ہوئے تھے۔[1]

---

[1] بحار الانوار، و خصال

حج

امام حسن علیہ السلام نے پچیس حج پا پیادہ کیے۔ ایک حج میں سواری بھی ساتھ تھی۔ مگر پیادہ چلتے چلتے پاؤں بھی ورم کر گئے۔ کسی نے سواری کے ساتھ ہوتے ہوئے پیادہ چلنے کا سبب دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا سواری اس لیے ہے تاکہ کسی تھکے ماندہ انسان کو اس پر سوار کر سکیں

حضرت نے پچیس حج پاپیادہ کیے اور وہ اس طرح کہ آپ کی سواری کی اونٹنیاں ساتھ جاتی تھیں مگر آپ ان پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ فرماتے تھے کہ مجھے اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے کہ اس کی ملاقات کو جاؤں اور اس کے گھر تک پاپیادہ نہ جاؤں۔[1]

امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ان پاپیادہ حجوں .. میں بسا اوقات آپ پا برہنہ چلتے تھے۔

جہاد

جناب امام حسن علیہ السلام نے جنگِ جمل و صفین و نہروان میں دادِ شجاعت دی۔ چنانچہ جنگِ صفین میں جب امیرالمومنین نے اپنے اصحاب کو اکٹھا کیا اور عام حملہ کی تیاری کی تو معاویہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ ہر فریق اپنی قوت سمیٹ کر دوسرے پر حملہ آور ہوا۔ امام حسن علیہ السلام شام کی

---

[1] اسد الغابہ، ج ۲ ص ۱۴

فوجوں پر ٹوٹ پڑے۔ امیرالمومنین علیہ السلام کی نظر پڑی آپ گھبرا گئے اور ساتھیوں سے کہا:-

"اس نوجوان کو روکو، لڑائی میں جان دے کر کہیں مجھے بے دست و پا ہی نہ کر دے۔ میں ان دونوں حسنؑ و حسینؑ کو انتہائی عزیز رکھتا ہوں تاکہ ان کے مرنے سے رسول اللہؐ کی نسل منقطع نہ ہو جائے"[1]

حلم و عفو

امام حسن علیہ السلام کو مروان بن الحکم سے بار بار اذیتیں پہنچیں آپ حلم و بردباری سے برداشت فرماتے۔ معتبر راویوں کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مروان نے امام حسنؑ کے روبرو آپ کو سب وشتم کیا۔ جب فارغ ہوا تو آپ نے فرمایا۔ کہ جو کچھ تو نے کہا اگر راست و درست ہے تو خدا اس صداقت کی تجھے جزائے خیر دے۔ اگر یہ کذب و افترا ہے اور جھوٹ ہے تو تو حق سبحانہ کی طرف سے اس کا بدلہ پائے گا اور خدا کی قسم اللہ کا انتقام میرے انتقام سے شدید تر ہے۔

ایک غلام سے ایک شدید جرم کا ارتکاب ہوا جس سے وہ سخت سزا کا مستحق تھا۔ آپ نے تعزیر کا حکم دیا، جب اسے مارنے لگے تو پکارا ہوا میری ایک عرض سن لیجئے۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والوں کی مدح کرتا ہے۔

"والعافین من الناس۔ وہ لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں"

آپ نے فرمایا، "عفوت عنک"۔ "میں نے تیرا گناہ معاف کیا"

---

[1] شرح نہج البلاغہ محمد عبدہٗ، ج ۲ ص ۲۰۲ مطبوعہ مصر

اس نے عرض کیا اس کے بعد فرماتا ہے :۔

"واللہ یحب المحسنین"۔ "اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

فرمایا، میں نے تجھے راہِ خدا میں آزاد کیا اور جو کچھ تجھے پہلے ملتا تھا اب اس سے دگنا ملا کرے گا۔

اخلاص امام حسن علیہ السلام کی زندگی سراپا اخلاص تھی۔ عالم طفلی میں تین روزے رکھے اور خود فاقہ سے رہ کر مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلایا۔ اور ایسے ایثار کے وقت اعلان فرماتے تھے۔ "انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاءً ولا شکورًا" (الدھر)

"سوائے اس کے نہیں کہ ہم تم کو صرف اللہ کے لیے کھلاتے ہیں۔ تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔"

جس ہستی کے روزہ اور اخلاص کا بچپن میں یہ عالم ہو اس کی بقیہ زندگی میں کیا حالت ہو گی۔

ایثار و مواسات امام حسن علیہ السلام کی زندگی سراپا ایثار تھی وہ اس وقت تک کھانا تناول نہیں فرماتے تھے۔ جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ ان کے ہمسایے میں کوئی فاقہ سے نہیں ہے۔ جب کوئی مسکین ایسی حالت میں آ جاتا کہ کھانا دسترخوان پر چنا جا چکا ہو تو کھانا اسے اٹھا دیتے۔ اور خود فاقے سے رہتے۔ تین روزے رکھ کر مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلانا اور خود فاقہ سے روزہ پر روزہ رکھنا

ایثار کا وہ شاہکار ہے جس پر سرکارِ احدیت کی طرف سے ہل اتیٰ کا قصیدۂ مدحیہ نازل ہوا - امام حسنؑ خود سادہ اور تنگ دستی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر کسی سائل کو اپنے دروازہ سے خالی ہاتھ جانے نہیں دیتے تھے -

صبر و بُردباری

امام حسن علیہ السلام کی زندگی تمام کی تمام شدائد و مصائب میں بسر ہوئی - آپ نے اپنی زندگی میں ایسا صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا، جو تاریخ صبر میں سنہری حروف میں درخشاں رہے گا - طفولیت میں نانا کا سایۂ رحمت سر سے اٹھ گیا - چند مہینے نہیں گزرے تھے کہ ماں کی آغوشِ شفقت سے محروم ہوئے - سلطنت کے ہاتھ سے نکلنے پر دنیا داروں کی بے رخی و بے اعتنائی کے مصائب برداشت کیے - والد بزرگوار کے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی سول وار کے شدائد کو برداشت کیا - حکومت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بدعہدی کی تلخیوں کو چکھنا پڑا - مجمعِ اسلام باپ پر سب و شتم کو برداشت کیا - والد بزرگوار کے دوستوں اور شیعوں کا قتل عام دیکھا - آخر زہر سے زندگی کا خاتمہ ہوا - آپ کی زندگی سراپا صبر و بردباری ہے -

حُسنِ معاشرت

ایک شخص امام حسنؑ کے پاس آ کر بیٹھ گیا - آپ اس وقت کہیں باہر تشریف لے جانا چاہتے تھے - فرمایا آپ اس وقت میرے پاس آئے - جبکہ میں کہیں جانے کا قصد کر رہا تھا - اب اگر آپ چاہیں تو چلا جاؤں ورنہ نہ جاؤں -

اللہ، اللہ اس وسعتِ اخلاق کا کیا کہنا کہ ایک عام آدمی سے باہر جانے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔ (تاریخ الخلفاء)

تواضع وانکساری

امام حسن علیہ السلام کا گزر ایک ایسے مقام سے ہوا جہاں کچھ فقراء، و مساکین بیٹھے ہوئے تھے اور زمین پر روٹی کے کچھ رکھے ہوئے ٹکڑے کھا رہے تھے۔ آپ پر نظر پڑی تو ادب و احترام سے کھڑے ہو گئے اور عرض کی یا ابن رسول اللہؐ! آئیے تشریف لائیے اور کھانا کھانے میں شرکت فرمائیے۔ ان کی یہ استدعا سن کر آپ سواری سے اترے اور ارشاد فرمایا:-

"ان اللہ لا یحب المتکبرین۔ اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

پس ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ ان سب نے ان کی شرکت کی برکت سے کھانا سیر ہو کر کھایا۔ اور کھانا باقی بچ رہا۔ بعد ازاں حضور نے اپنے ہاں ان کو دعوت دی تو وہ حاضر ہوئے، انھیں کھانا کھلایا اور پہننے کے کپڑے عنایت فرمائے۔[1]

رقتِ قلب

راوی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ جناب امام حسن علیہ السلام کھانا تناول فرما رہے تھے اور ایک کتا آپ کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک لقمہ آپ کھاتے تھے اور دوسرا ویسا ہی لقمہ کتے کو ڈالتے تھے۔ میں نے عرض کی کہ اس کتے کو سامنے سے کیوں نہیں ہٹاتے

---

[1] مناقب شہر آشوب

آپ کھانا تناول فرما رہے ہیں یہ سامنے کھڑا ہے۔ فرمایا، اسے کھڑا رہنے دو۔ مجھے شرم آتی ہے۔ کہ ایک ذی روح میرے سامنے کھڑا ہو۔ میں کھائے جاؤں اسے نہ دوں یا دھتکار دوں [1]

غیبت ایک شخص خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی یابن رسول اللہ فلاں شخص آپ کی برائی بیان کر رہا تھا۔ اس کا یہ کلام حضرت کو ناگوار گزرا فرمایا تو نے مجھے تعب و تکلیف میں مبتلا کر دیا۔ اب میں حق تعالیٰ سے اس کے اور اپنے دونوں کے لئے استغفار کروں گا۔ اس کے لئے تو اس لئے کہ اس نے غیبت کا ارتکاب کیا۔ اپنے لیے اس لیے کہ اسکی برائی کو سننا غیبت سننے والا غیبت کرنے والوں میں سے ایک ہے۔

اقوال حکیمانہ

۱۔ ضرورت کا پورا نہ ہونا اس سے کہیں بہتر ہے کہ اس کے لیے کسی نااہل کی طرف رجوع کیا جائے۔

۲۔ انسان کا اپنے دین میں سبقت کرنا، اپنے مال کی اصلاح کرنا، اور حقوق کی نگہداشت کرنا، عقل و دانائی ہے۔

۳۔ دنیا میں ایسی سرگرمی سے کام کر گویا کہ تو اس میں ہمیشہ زندگی بسر کرے گا اور آخرت کے لیے اس طرح کام کر گویا کہ تو کل ہی مر جائے گا۔

[1] بحارالانوار

۴۔ تمھارا قریبی وہ ہے جو محبت و مودت کے لحاظ سے تمھارے قریب ہو اگرچہ خاندان کے لحاظ سے تم سے دور ہو اور تمھارے لیے وہ بعید ہے جو محبت کے لحاظ سے دور ہو اگرچہ خاندان کے لحاظ سے تمھارا قریبی ہو۔

۵۔ تو نے نعمتوں سے جب وہ موجود تھیں جہالت اختیار کی اور جب انھوں نے پیٹھ پھیر لی تو تو نے ان کی قدر جانی۔

اشعار

یا اھل لذات دنیا لا بقاء لھا ان المقام لظل زائل حمق

"اے دنیا کی لذتوں کے شیفتہ کہ جن کو بقا نہیں ڈھلنے والے سایہ کے نیچے مقام کر لینا نادانی ہے۔ یا زوال پذیر سایہ سے دھوکا کھانا حماقت ہے۔"

قل للمقیم لغیر دار اقامۃ حان الرحیل فودع الاحبابا
ان الذین لقیتھم وصحبتھم صاروا جمیعا فی القبور ترابا

تو اس شخص سے جو ایسی جگہ میں مقیم ہے کہ جہاں ہمیشہ ٹھہرنا نہیں کہدے کہ کوچ کا وقت آ گیا دوستوں کو وداع کرو، حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں سے تو نے ملاقات کی اور صحبت رکھی وہ سب قبروں میں مٹی ہو گئے۔

دورِ خلافت

سرکارِ امن حضرت حسن علیہ السلام

حضرت علی علیہ السلام کی شہادت سے بنی امیہ کا رستہ کسی قدر صاف ہو گیا لیکن خاندانِ رسالت آلِ عمران یعنی اولادِ ابی طالب تقدس روحانیت، علم و اخلاق میں کہیں افضل و برتر تھے۔ اور رسول اللہؐ کی قرابتِ قریبہ کا شرف بھی انھیں حاصل تھا۔ اس لیے روحانی سیادت کا اس خاندان سے بنی امیہ میں منتقل ہو جانا اب بھی مشکل تھا۔ چنانچہ حضرت امیر علیہ السلام کے بعد آلہی نص امیرالمومنین کی وصیت اور جناب امیرؑ کے اوصاف مختصہ امامت و خلافت و ولائت کے مطابق اور ارباب حل و عقد کے اجماع سے جناب امیرؑ کے فرزندِ اکبر حضرت امام حسن علیہ الصلوٰۃ والسلام خلیفۂ رسولؐ اور امامِ خلق تسلیم کر لیے گئے۔

مولف سیر الصحابہ لکھتے ہیں:۔

حضرت علیؑ کی وفات کے بعد امیر معاویہ کے مقبوضہ علاقہ کے علاوہ باقی سارے ملک کی نظریں حضرت امام حسن علیہ السلام کی طرف تھیں۔ چنانچہ والد بزرگوار کی تدفین کے بعد آپ جامع مسجد

میں تشریف لائے مسلمانوں نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھائے
آپ نے ان سے بیعت لی اور بیعت کے بعد حسب ذیل تقریر
فرمائی :-

لوگو! تم میں سے ایک ایسا شخص بچھڑا ہے کہ نہ اگلے اس سے
بڑھ سکے اور نہ پچھلے اس کو پا سکیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم انہیں اپنا علم عطا فرما کر لڑائیوں میں بھیجتے تھے۔ وہ کبھی
کسی جنگ سے ناکام نہ لوٹے میکائیل و جبرائیل چپ و راست
ان کے جلو میں ہوتے تھے۔ انہوں نے سات سو درہم کے سوا
سونے چاندی کا کوئی ذرہ نہیں چھوڑا ہے۔ یہ درہم بھی ایک غلام
کے لیے جمع کیے تھے"۔[1]

دورِ جدید کے مؤرخوں جناب پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم اور پروفیسر
محمد شجاع الدین صاحب نے لکھا ہے :-

"شہادت امیرالمومنین اور ان کی تدفین کے بعد اہلِ کوفہ
جامع مسجد میں جمع ہوئے۔ اور انہوں نے حضرت حسنؑ کے
ہاتھ پر ان کی ذاتی خوبیوں کی بنا پر بیعت کی۔ سب سے پہلے
قیس بن سعد انصاری نے بیعت کی اور اس کے بعد تمام
حاضرین نے باری باری یہ سعادت حاصل کی"۔[2]

---

[1] ابن مسعود، جزو ۳، ق اول ذکر علیؑ۔ مستدرک میں حاکم نے بھی خفیف
تغیر کے ساتھ اسے نقل کیا ہے۔ [2] تاریخ اسلام

مکتبِ فکر اہلسنت کی ترجمانی

پہلے چار خلیفوں کو دارالخلافہ مدینہ کی اکثریت کے فیصلے اور بیعت نے خلیفہ بنایا۔ حضرت حسنؓ کی تخت نشینی کے وقت مدینہ کی بجائے کوفہ دارالخلافت تھا۔ لہٰذا یہ حق اہلِ کوفہ کا تھا کہ وہ شخصی خوبیوں کی بنا پر جسے چاہیں خلیفۂ رسول منتخب کریں۔ حضرت حسنؓ کا تختِ خلافت پر متمکن ہونا، خلافتِ راشدہ کے اصولوں کے عین مطابق تھا۔ حضرت حسن کے انتخاب خلافت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے۔ کہ خلافت راشدہ میں باپ کے بعد بیٹا تخت خلافت کی زینت بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسے بڑے باپ کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے خلیفہ نہ بنایا جائے بلکہ اس میں جوہرِ ذاتی بھی ہوں۔ علاوہ ازیں باپ اسے اپنی زندگی میں خود ولی عہد نامزد کر کے رعایا سے جبراً اس فیصلہ کی تائید نہ کرائے بلکہ رعایا خود بخود اس کی شخصی خوبیوں سے متاثر ہو کر خدا اسے اپنا حاکم مان لے۔[1]

مکتبِ فکر شیعہ کی ترجمانی

شیعہ کے ہاں خلافت کے معنی سلطنت نہیں ہیں، جو شخص کارِ رسالت کو عصمتؑ علمِ لدنی سے باحسن وجوہ انجام دے۔ اسے خلیفۃ اللہ بھی کہتے ہیں اور خلیفۃ الرسول بھی خواہ وہ تختِ سلطنت پر ہو یا نہ ہو۔ اس کا تقرر الٰہی نص سے ہوتا ہے خواہ وہ نص بزبان رسولؐ ہو یا بزبان خلیفۃ الرسول معصوم، اور وہ اللہ کا نمائندہ ہوتا ہے، مخلوق خدا کی رہنمائی

---

[1] تاریخ اسلام ص ۲۹۳

کی وجہ سے اسے امام کہتے ہیں۔ جسے اللہ اور رسولؐ نص سے مقرر کریں وہ خلیفۃ الرسول یا امام ہے۔ جسے لوگ مقرر کریں اسے شیعی مکتہ نگاہ سے خلیفۃ المسلمین کہتے ہیں، خلافت راشدہ کی اصطلاح سلاطین کے لیے شیعی فکر نہیں ہے۔ اس لیے تین خلیفوں سے پہلے خلیفہ کا انتخاب جیسا بھی ہوا وہ ہوا۔ اسلامیانِ مدینہ نے کیا دوسرے خلیفہ کا انتخاب نہیں ہوا۔ بلکہ انھیں پہلے خلیفہ نے اپنی شخصی نص سے خلیفہ بنایا۔ تیسرے خلیفہ کا تقرر چھ آدمیوں کی کمیٹی کے ذریعہ ہوا البتہ حضرت علیؑ نصِ الٰہی اور نصِ رسولؐ سے بھی خلیفہ تھے دارائے عصمت و علمِ لدنی بھی تھے۔ یعنی صفات مختصہ کے لحاظ سے بھی خلیفہ تھے۔ اسی طرح جناب امیر علیہ السلام ہر نکتۂ فکر سے خلیفہ تھے۔ اسی طرح جناب امام حسن علیہ السلام جناب امیر علیہ السلام کی نص سے بھی بلکہ نصِ رسولؐ سے بھی خلیفہ تھے۔ اور دار الخلافہ کے اربابِ حل و عقد نے بھی انھیں خلیفہ چنا۔ اس لیے وہ خلیفۃ اللہ بھی تھے۔ خلیفۃ الرسول بھی اور خلیفۃ المسلمین بھی تھے۔ اور معصوم و صاحبِ علمِ لدنی اور ہدایتِ خلق کے لحاظ سے امام بھی تھے۔

بیعت کے وقت اقرار بیعت کے دوران حضرت حسنؑ لوگوں سے اقرار لیتے تھے۔ کہ وہ آپ کے مطیعِ فرمان رہیں گے جس سے آپ کی صلح ہو گی اسے دوست سمجھیں گے جس سے آپ کی جنگ ہو گی اس سے وہ بھی نبرد آزما ہوں گے۔[۱]

---

[۱] تاریخ اسلام مولفہ پروفیسر سید عبدالقادر صد ۳۹۲

حضرت علیؑ کے بعد امام حسنؑ ایران، عراق، خراسان، حجاز، یمن وغیرہ میں خلیفہ تسلیم کر لئے گئے۔ ان چالیس ہزار آدمیوں نے جنھوں نے حضرت علیؑ سے معاویہ کے ساتھ جنگ کرنے پر آپ کی نصرت میں رہنے کی بیعت کی تھی۔ امام حسن علیہ السلام سے بھی بیعت کر لی۔[1]

معاویہ کا جارحانہ اقدام

جناب امیر علیہ السلام اور حضرت معاویہ میں بہت قدیم سے اختلاف چلا آ رہا تھا۔ امیر معاویہ جناب امیر علیہ السلام کی حیات میں ہی عالم اسلامی پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن جناب امیر علیہ السلام کی زندگی میں یہ خواب منت کش تعبیر نہ ہوئے۔ آپ کی وفات کے بعد یہ جذبہ دفعتاً نہایت شدت کے ساتھ اُبھر آیا۔ امیر معاویہ کو یہ معلوم تھا کہ امام حسن علیہ السلام صلح پسند ہیں اور جنگ و جدال کو وہ دل سے ناپسند کرتے ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی تھا۔ کہ حضرت حسن علیہ السلام کو قتل و خونریزی سے شدید نفرت تھی۔ اور اس قیمت پر وہ خلافت (بمعنی سلطنت) لینے پر آمادہ نہ تھے۔ امیر معاویہ کو ان حالات کا پورا اندازہ تھا۔ اس لیے حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد ہی انھوں نے پیش قدمی شروع کر دی۔ اور پہلے عبد اللہ بن عامر بن کبریز کو مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے روانہ کر دیا۔ اور انبار ہوتے ہوئے مدائن کی طرف بڑھے۔[2]

---

[1] تاریخ الائمہ صـ۳۳۲ [2] سیر الصحابہ ج ۶ صـ ۔

آغازِ جنگ معاویہ خود چھ ہزار فوج لے کر مقام مسکن میں اترا جو بغداد سے دس فرسخ تکریت کی جانب اوانا کے قریب واقع ہے۔ امام حسن علیہ السلام یہ سنکر خود تو بڑا حصہ فوج لے کر کوفہ سے ساباط مدائن میں آ گئے۔ اور بارہ ہزار فوج قیس بن سعد کی ماتحتی میں معاویہ کی پیش قدمی روکنے کے لیے روانہ کر دی۔ اسی دوران میں معاویہ نے مخفی طور پر یہ فریب کیا۔ کہ ایک شخص کو مدائن بھیجا جہاں امام حسن علیہ السلام مقیم تھے۔ اور یہ مشہور کرایا کہ حضرت کے سپہ سالار قیس بن سعد نے معاویہ سے صلح کر لی ہے اور اس طرح دوسرے شخص کو قیس کے لشکر میں بھیج کر مشہور کرایا کہ امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے صلح کر لی ہے۔ پس جب دونوں جگہ یہ خبر پھیل گئی تو امام حسن علیہ السلام کی فوج میں بغاوت پھیل گئی۔ فوجی آپ کے خیمہ پر ٹوٹ پڑے۔ آپ کا کل اسباب لوٹ لیا۔ آپ کے نیچے سے مصلیٰ تک گھسیٹ لیا۔ دوش پر سے ردا بھی اتار لی۔ بعض گمراہوں نے معاویہ سے سازش کر کے اور رشوتیں لے کر ارادہ کیا کہ آپ کو گرفتار کر کے معاویہ کے حوالے کر دیں۔ اور ان کے بعض رئیسوں نے خفیہ طور پر خط و کتابت کر کے معاویہ کی اطاعت قبول کر لی اور اسے لکھا کہ بہت جلد عراق چلے آیئے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام کو پکڑ کر آپ کے حوالے کر دیں گے۔ آپ کمالِ صدمہ سے اپنے مدائن کے گورنر سعد کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں ایک خارجی نے موقعہ پا کر ران پر ایسا زخم لگایا جو ہڈی تک پہنچا۔ آپ زخمی

حالت میں مدائن کے قصر میں جا کر ٹھہرے۔ سعد نے علاج کرایا اور کچھ مدت میں اچھے ہو گئے۔ ۲۱ رمضان سنہ ۴۰ھ کو امام حسن علیہ السلام کی بیعت کی گئی۔ اسی روز آپ نے اپنی طرف سے عمال مقرر کر کے روانہ فرمائے۔ چنانچہ عبداللہ ابن عباس کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا جب معاویہ کو یہ خبر پہنچی تو اس نے دو جاسوس روانہ کیے۔ قبیلہ حمیر کا ایک جاسوس کوفہ کی طرف روانہ ہوا اور قبیلہ قیس کا ایک جاسوس بصرہ کی طرف روانہ کیا تاکہ یہ جاسوس لوگوں کو گمراہ کر کے امام حسن علیہ السلام سے منحرف کریں۔ چنانچہ یہ دونوں جاسوس گرفتار کر کے قتل کر دیے گئے۔ اس پر امام حسن علیہ السلام نے بطور تنبیہہ معاویہ کو ایک خط تحریر فرمایا جس میں تحریر فرمایا۔ تیرا یہ معاندانہ رویہ نہایت خطرناک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو آمادۂ جنگ ہو رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کے لیے میں بھی تیار ہوں۔ کافی خط و کتابت اور سوال و جواب کے بعد معاویہ نے ایک کثیر التعداد فوج کے ساتھ جس کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ عراق پر چڑھائی کی اور چند جاسوس ایسے لوگوں کی طرف بھیجے، جو جناب امام حسن علیہ السلام کے ہمراہ تھے۔ اور صرف خوف تیغ امیر المومنین علیہ السلام سے اطاعت کرتے تھے۔ مثلاً عمرو بن حریث اشعث بن قیس اور شیعث بن ربعی وغیرہم۔

اور ان میں سے ہر ایک کو یہی لکھا کہ تو امام حسن علیہ السلام کو قتل کر دے تو میں اپنی بیٹی کا عقد تم سے کر دوں گا۔ بارہ ہزار درہم نقد بھی انعام

دوں گا۔ اور فوج کے کسی اعلیٰ عہدہ پر بھی مامور کر دوں گا۔

اس طرح سے اکثر لوگوں کو امام حسن علیہ السلام سے منحرف کر لیا اور سازش کر کے باطنی طور پہ اپنے ساتھ ملا لیا۔ اگرچہ وہ ظاہری طور پہ امام حسن علیہ السلام ہی کے ساتھ تھے اس صورتِ حال پہ امام حسن علیہ السلام نے احتیاط اختیار فرمائی۔ چنانچہ زرہ پہن کر نماز کے لیے مسجد میں تشریف لاتے تھے، ایک دفعہ حالتِ نماز میں آپ پر تیر سے حملہ کیا گیا۔ لیکن زرہ کی وجہ سے آپ محفوظ رہے [۱]

چنانچہ معاویہ نے جن لوگوں کو خطوط لکھے تھے انھوں نے اس سازش میں شرکت کو قبول کیا۔ اور اسے اطلاع بھی دے دی کہ وہ ہر حال میں امام حسن علیہ السلام کی مخالفت میں شریک ہیں۔ حضرت امام حسن علیہ السلام نے جب امیر معاویہ کی فوج کشی کی خبر سنی تو اپنے ہمراہیوں کو جمع کیا اور دعوتِ جہاد دی۔ لیکن کسی ایک آدمی نے بھی اس دعوت پہ لبیک نہیں کہی۔ یہ صورتِ حالات دیکھ کر عدی بن حاتمؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا:۔

"سبحان اللہ! تم کس قدر برے لوگ ہو۔ اے فرزندِ رسولؐ تمھیں دعوتِ جہاد دے رہے ہیں اور تمھاری رگِ حمیت میں تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ تمھارے مردِ میدان کہاں گئے تم لوگ نہ غضبِ خدا سے ڈرتے ہو اور نہ تمھیں ننگ و عار کی کچھ پرواہ ہے"۔

---

[۱] منتہی الآمال ج ا ص ۱۹۳ و ص ۱۹۴، بحار الانوار ۱۰/۱۰۷

اس پر زور سرزنش پر چند آدمیوں نے اٹھکر اعانت کا وعدہ کیا۔ حضرت امام حسنؑ نے نخیلہ کو اپنا فوجی اڈا قرار دیا اور معاونت کی حامی بھرنے والوں کو وہاں جانے کا حکم دیا۔ مغیرہ بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب کو اپنا جانشین بنا کر کوفہ میں چھوڑا اور خود بھی نخیلہ کی طرف روانہ ہوئے جب وہاں پہنچے تو عجیب ماجرا تھا۔ جن کوفیوں کو نخیلہ پہنچنے کا حکم دیا تھا جنھوں نے معاونت کا وعدہ کیا تھا وہ وہاں نہیں پہنچے۔ اس پر آپ نے ان کوفیوں کی عہد شکنی اور بے وفائی پر اظہارِ افسوس کیا۔ ایک فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس میں ان کی بے وفائی اور مکر و فریب کا ذکر کیا۔ جو لوگ موجود تھے ان میں سے حکم کندی کو معاویہ کے حملہ کو رد کرنے کے لیے چار ہزار لشکریوں کے ساتھ انبار کی طرف روانہ فرمایا۔ جب معاویہ کو اس کی خبر ملی تو اس نے حکم کو پانچ لاکھ درہم بطور رشوت بھیج دیے۔ اور شام کے صوبوں میں سے ایک صوبہ کی گورنری کا بھی لالچ دیا۔ چنانچہ دولت پر نظر پڑتے ہی اور گورنری کے وعدہ کا خیال آتے ہی دین فروشی پر کمر بستہ ہو گیا اور سو ہمراہیوں کے ساتھ معاویہ سے جا ملا۔ جب یہ خبر امام حسنؑ کو پہنچی تو آپ نے اپنے عساکر کو جمع کر کے ان لوگوں کی عہد شکنی، بیوفائی اور دنیا پرستی پر اظہارِ غم فرمایا۔ اور ایک خطبۂ عالیہ میں ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی۔ پھر بنی مراد کے ایک شخص کو چار ہزار لشکر دے کر انبار روانہ کیا اور روانگی سے پہلے اسے تنبیہ کی کہ عہد و پیمان پر قائم رہے گا اور

غداری اختیار نہیں کرے گا اور لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ اب دوسرے آدمی کو بھیج رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ جس آدمی کو بھیجوں گا نتیجہ وہی ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ قبیلہ مراد کا یہ نامراد جونہی انبار پہنچا اور معاویہ کو اطلاع ہوئی اس نے رشوت کی پیشکش کی اور حکومت کی طمع دلائی۔ یہ بھی معاویہ سے جا ملا۔

حضرت امام علیہ السلام نخیلہ سے روانہ ہو کر دیرعبدالرحمٰن میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں سے عبیداللہ ابن عباس، قیس بن سعد اور سعید بن قیس کے ہمراہ بارہ ہزار کا لشکر معاویہ کے مقابلے کے لیے روانہ فرمایا۔ اور فرمایا کہ اگر عبیداللہ کو کوئی عارضہ پیش آجائے تو قیس بن سعد سالار لشکر ہوگا۔ اور قیس کو کوئی ایسی صورت پیش آئے تو سعید بن قیس امیر عساکر منصور ہوگا۔ فوج کو یہ ہدایات دے کر ساباط مدائن کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر آپ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا:۔

خطبہ:۔ بحمداللہ کہ میں خلق خدا کا ہر ایک سے زیادہ خیر خواہ ہوں مجھے کسی مسلم سے بغض نہیں ہے۔ اور نہ میں کسی کی برائی یا کسی سے فریب چاہتا ہوں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ اتفاق باہمی جس کو تم لوگ ناپسند کرتے ہو بہتر ہے۔ اس تفرقہ سے جس کو تم مرغوب رکھتے ہو آگاہ رہو کہ تمہارے لیے تمہاری ہی فلاح و بہبود چاہتا ہوں۔ میرے امر کی مخالفت نہ کرو اور میری رائے کو ٹھکراؤ نہیں، خدا ہم سب کی

مغفرت کرے اور اس امر کی ہدایت فرمائے جس میں اسکی رضا ہو۔"
پس اتنا کہنا تھا کہ جو خوارج و منافقین آپ کے ساتھ تھے انھوں نے چلانا شروع کردیا۔ اور ایک دوسرے سے کہنے لگے امام علیہ السلام معاویہ سے صلح کرنا چاہتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا "یہ شخص کافر ہو گیا ہے" کے نعرے لگنے لگے۔ عیاذاً باللہ۔ پھر یہ لوگ امام حسن علیہ السلام پر حملہ آور ہوئے حضرت کے خیمہ کو لوٹ لیا۔ یہاں تک کہ آپ کے نیچے سے مصلے تک کھینچ لیا۔ ایک شخص عبدالرحمٰن ازدی نے آپ کی چادر تک اتار لی۔ آپ ایک مقام پر تلوار لے کر بغیر ردا زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر ربیعہ ہمدان کے قبیلہ کے چند آدمیوں کے ہمراہ گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہوئے راستہ میں ایک شخص جراح بن سنان اسدی نے حضرت پر حملہ کردیا اور یہ الفاظ کہے۔ "اے حسنؑ! (معاذ اللہ) تیرا باپ مشرک تھا، پھر تو بھی مشرک ہے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے ساتھ زیادہ خوارج ہی تھے۔ یہ لوگ بظاہر امام حسن علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ اور باطناً معاویہ کے ساتھی تھے۔ چنانچہ جناب امیرؑ اور امام حسنؑ کو ایسے الفاظ سے یاد کرنا ان ہی لوگوں کا خاص شعار تھا۔ جب آں حضرت زخمی ہو کر زمین پر گرے تو لوگوں نے ایک چارپائی پر لٹا کر سعید بن مسعود ثقفی والی مدائن کے پاس پہنچا دیا۔ حضور نے کچھ دن علاج کے لیے وہاں قیام فرمایا۔

بحارالانوار اور دمعۃ الساکبہ میں شیخ مفید علیہ الرحمۃ سے منقول ہے کہ کئی ایک رؤسائے قبائل نے خفیہ طور پر معاویہ کو خطوط لکھے کہ ہم تیری

اطاعت کے لیے آمادہ و تیار ہیں اور اسے اس طرف آنے کی دعوت دی۔
اس طرف معاویہ علاقہ مسکن کے ایک گاؤں جو نیبہ میں جا ٹھہرا۔ اس کے مقابلہ کے لیے عبیداللہ بن عباس کا لشکر پہنچ چکا تھا۔
معاویہ نے عبیداللہ کو پیغام بھیجا کہ امام حسن علیہ السلام مجھ سے صلح کر رہے ہیں۔ اگر تو صلح سے پہلے میرے ساتھ مل جائے تو میں دس لاکھ درہم تجھے انعام دوں گا۔ پانچ لاکھ نقد دوں گا اور پانچ لاکھ کوفہ میں داخلے کے وقت دوں گا۔ ورنہ چار و ناچار تجھے میرے ماتحت ہونا پڑے گا۔ اس وقت میرے نزدیک تیرا کوئی وقار نہیں ہوگا۔ چنانچہ عبیداللہ اس دھوکے میں آکر معاویہ کے ساتھ جا ملا۔ بروایت خرائج قیس بن سعد کو معاویہ نے ہر چند اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی مگر کارگر نہ ہوئی۔ پھر معاویہ نے امام حسن علیہ السلام کو خط لکھا کہ میرے ساتھ قطع رحمی نہ کیجئے لوگ آپ کے ساتھ غدر کر رہے ہیں جس طرح کہ وہ آپ کے والد کے ساتھ کر چکے ہیں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ آپ میرے ساتھ صلح کر لیں۔ امام حسن علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے معاویہ کا یہ خط سنایا۔ اس پر سب کہنے لگے کہ کیا ہوا اگر دو آدمیوں نے آپ سے غدر کیا۔ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ نے فرمایا میں جانتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ غدر کرو گے۔ اتمام حجت کے لیے ایک دفعہ پھر تمہاری بات پر اعتماد کرتا ہوں۔ پھر نخیلہ میں دس روز آپ نے قیام فرمایا۔ صرف چار ہزار آدمی آپ کے پاس حاضر ہوئے۔ اس موقعہ پر آپ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا :-

"تعجب ہے ایسی قوم جس کے پاس نہ حیا ہے نہ دین ہے، اگر میں معاویہ سے صلح کرلوں تو تمھیں کبھی خوشی نصیب نہیں ہو گی. اور بنی امیہ تمھیں ایسے عذاب میں مبتلا کریں گے کہ تم تمنا کرو گے کہ کاش ہم ان کی بجائے کسی حبشی لشکر کے ماتحت ہوتے اگر میرے پاس کچھ مخلص مددگار ہوتے تو میں کبھی بھی معاویہ سے صلح نہ کرتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ سلطنت بنی امیہ پر حرام ہے پس تم پر لعنت ہو، اے دنیا پرستو۔"

لیکن اس کے باوجود اکثر اہلِ کوفہ نے معاویہ کو خطوط لکھے کہ ہم تیرے ساتھ ہیں۔ اس پہ بروایت شیخ مفید علیہ الرحمۃ معاویہ نے پھر امام حسن علیہ السلام کو خط لکھا اور دعوتِ صلح دی اور اہلِ کوفہ کے خطوط بھی حضرت کو بھیج دیئے[1]

---

[1] الاعتقال کیہ

امام حسن علیہ السلام سے غداری کے اسباب

۱۔ امیرِ شام معاویہ ملک کے بڑے بڑے رئیسوں اور بارسوخ لوگوں سے قرابت میں دنیا کا لالچ دے رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اشعث بن قیس اور عمرو بن حریث کو مخالفتِ امام حسنؑ پر بھی طمع دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

۲۔ بڑے بڑے فوجی افسروں کو یہ لالچ دیا جا رہا تھا کہ اگر تم امام حسن علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ دو اور مجھ سے آملو، تو میں تمہیں اعلیٰ عہدے تفویض کر دوں گا۔ حتیٰ کہ والی اور گورنر بنا دوں گا۔

۳۔ معاویہ امام حسنؑ کے حامیوں کو دولتِ کثیر بھیج رہا تھا، اور آیندہ کثیر المنفعت انعام و اکرام کے وعدے کر رہا تھا۔

۴۔ وہ امام حسنؑ کے حوصلے پست کر رہا تھا، اور کہہ رہا تھا کہ امام حسنؑ ہم سے صلح کر رہے ہیں۔ تم اگر قبل صلح ہم سے آملو تو تمہارے لیے بہت مفید ہوگا، ورنہ صلح کے بعد ہمارے دل میں تمہاری کوئی قدر و منزلت نہیں ہوگی۔ چنانچہ بسر ابن ارطات نے اس امر کو بہت شہرت دی تھی کہ امام حسنؑ نے تو ہم سے صلح کر لی ہے۔ پھر تم مفت میں لڑ کر اپنی جان کیوں کھو رہے ہو؟

۵۔ بہت سے خوارج اور منافقین امام حسن علیہ السلام کی افواج میں شامل ہو کر ان کے لیے مشکلات پیدا کر رہے تھے۔ المختصر امام حسن علیہ السلام کے لشکر میں چار قسم کے لوگ شریک تھے:۔

۱۔ معاویہ کا فتنہ کالم جو امام حسنؑ کے لشکر میں تشتت و انتشار پیدا کر رہا تھا اور امام حسن علیہ السلام کی افواج کو گمراہ کر رہا تھا۔

۲۔ خوارج و منافقین جو معاذ اللہ امام حسن علیہ السلام، بلکہ ان کے والد بزرگوار علی مرتضیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مشرک و کافر سمجھتے تھے، اگرچہ معاویہ نے ان کا تقرر نہیں کیا تھا مگر مخالفت امام حسنؑ وہ مقصد مشترک تھا جس نے انھیں معاویہ سے ملحق کر دیا تھا۔ اور ان کا امام حسن علیہ السلام سے قلبی عناد معاویہ کی کامیابی کے لیے ایک مستقل سبب ہو گیا تھا۔

۳۔ حریص و طماع لوگ، دولت کی حرص اور عہدوں اور مناصب کی طمع میں معاویہ کی چالوں کا شکار ہو گئے تھے۔

۴۔ خاندانِ رسالت کے مخلص شیعہ اور محب جو دل و جان سے امام حسن علیہ السلام کی کامیابی کے خواہاں تھے، جیسے قیس بن سعد اور حجر بن عدی۔ مگر یہ لوگ تعداد میں بہت کم تھے۔ چنانچہ ان کی قلت کا پتہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے

جسے علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے مفضل بن عمر سے روایت کیا ہے
مصائب و شدائد کی انتہائی شدت میں امام حسن علیہ السلام
نانا کا محبوب نواسا نانا سے اس طرح فریاد کر رہا تھا :۔
"نانا! میں نے امت کی خیر خواہی کے پیش نظر اس امت
کو اس طرح آگاہ کیا۔ اے لوگو! غفلت کی نیند سے
بیدار ہو جاؤ۔ اور ظلمات کی تاریکیوں سے نکلو، قسم ہے
اس ذات کی جس نے دانہ کو شگافتہ کیا۔ اور روح کو پیدا
کیا۔ اور عظمت کو اپنی ردا قرار دیا۔ اگر تم میں سے ایک صاف
دل نیک نیت جماعت میرے ساتھ ہو جائے جس میں
نفاق کی ملاوٹ نہ ہو تو میں بڑھ بڑھ کر جہاد کروں گا اور
اطراف و جوانب کو تلواروں اور نیزوں سے بھرپور کر دوں گا
گھوڑوں کی کثرت سے زمین کو تنگ کر دوں گا۔ خدا کے
بندو! کچھ تو جواب دو۔ خدا تم پر رحم کرے۔ گویا کہ خاموشی
کی لگام ان کے منہ میں تھی اور میری آواز صدا الصحرا رہی۔
اس پر صرف بیس آدمی اٹھے اور انھوں نے عرض کی
یا ابن رسول اللہ! ہمارے نفس اور ہماری تلواریں حاضر
ہیں۔ ہم آپ کے مطیع ہیں اور ہمارے سر تسلیم آپ کے
سامنے خم ہیں۔ پھر میں نے دائیں اور بائیں دیکھا ان
کے علاوہ کسی نے بھی لبیک نہ کہا پس میں نے فیصلہ

کرلیا کہ میرے لیے نانا کا اسوۂ حسنہ مشعلِ راہ ہے، جس طرح انھوں نے ایک مدت تک اللہ کی خفیہ عبادت کی حالانکہ ان کے پاس ۳۹ مسلمان تھے، جب اللہ نے چالیس کی تعداد کو پورا کر دیا تو علانیہ امرِ الٰہی کی تبلیغ کی اور کارِ رسالت کو انجام دیا۔ نانا! اگر میرے پاس مخلص مومنوں کی یہی تعداد ہو جاتی تو میں ایسا ہی جہاد کرتا، جیسا جہاد کرنے کا حق ہے۔"

مُعاہدۂ جنگ بندی

(CEASE FIRE AGREEMENT)

امام حسن علیہ السلام کے لیے حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے کہ آپ معاہدۂ التوائے جنگ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس معاہدۂ التوائے جنگ کو عام طور پر صلح حسنؑ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ صلح نہیں تھی بلکہ صرف معاہدۂ جنگ بندی تھا۔ اس کے بعد گرم جنگ، سرد جنگ یا اعصابی جنگ میں تبدیل ہو گئی جس میں امام حسن علیہ السلام اپنی سیاستِ ربانیہ سے فتح حاصل کر رہے تھے۔ حکومت نے اس اعصابی جنگ کے آئینہ میں جب اپنی شکست دیکھی تو آپ کی زندگی کا زہر سے خاتمہ کر دیا۔ اگر اعصابی جنگ میں امام حسن علیہ السلام کی فتح مبین نہ ہوتی تو امن کی فضا پیدا ہو جانے کے بعد اس عزلت گزیں اور خلوت نشیں امام کو زہر دینے کا المناک واقعہ پیش ہی نہ آتا۔

التوائے جنگ کے اسباب

اگر امام حسن علیہ السلام کو ایسے ناگزیر حالات پیش نہ آتے تو امام حسن علیہ السلام معاہدۂ جنگ بندی کے لیے بھی تیار نہ تھے۔

اب ہم ان اسباب کو پیش کرتے ہیں جن کی وجہ سے امام حسن علیہ السلام نے معاہدۂ جنگ بندی اختیار کیا:۔

۱۔ **قلتِ انصار**۔ اور اس امر کا شاہد وہ خطبہ ہے جسے علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے اعلام دیلمی سے نقل فرمایا ہے:۔

"اب معاویہ مجھے ایسے امر کی دعوت دیتا ہے کہ جس میں نہ عزت ہے اور نہ انصاف ہے۔ اگر تمھیں زندگی عزیز ہے تو معاویہ کی بات کو مان لیا جائے لیکن یاد رکھو کہ یہ زندگی ذلت کی زندگی ہوگی۔ اگر موت کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جاؤ اور اللہ کے راستے میں جان دینے سے نہ گھبراؤ، جہاد کے لیے تیار ہو جاؤ تو میں اس کے لیے آمادہ ہوں۔"

اس پر سب حضرات پکار اٹھے کہ ہمیں ذلت کی زندگی منظور ہے۔ اس امر کی مزید وضاحت اس خط سے بھی ہوتی ہے جو امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کو لکھا ہے:۔

"اے معاویہ۔ خلافت میرا اور میرے اہل بیت کا حق

ہے۔ تجھ پر اور تیرے اہل بیت پر حرام ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنے جدِ پاک سے سنا ہے۔ اگر میرے پاس چند ایسے آدمی ہوتے جو جہاد فی سبیل اللہ میں صابر اور میری امامت کے عارف ہوتے تو میں کبھی تیرے ساتھ صلح کرنے پر آمادہ نہ تھا۔[1]"

یہ بھی ایک دوسرے موقع پر فرمایا:۔

"میرے جدِ پاکؐ کے پاس جب انصار کی کمی تھی تو انہوں نے خاموشی کے ساتھ مکہ کو چھوڑ دیا۔ اسی طرح میرے والد بزرگوار نے اور میں نے خاموشی اختیار کی جبکہ لوگوں نے اغیار کی بیعت کر کے ہمیں چھوڑ دیا۔"[2]

حضرت امام حسن علیہ السلام کی فوج میں منافقین بھی موجود تھے۔ اور خوارج بھی اس کے علاوہ زر و دولت، جاگیر و عہدہ ہائے جلیلہ کے فریب خوردہ انسان بھی موجود تھے۔ اور ان کے عزائم مزعومہ سے امام حسن علیہ السلام اس قدر خائف تھے کہ نماز کے لیے بھی زرہ پہن کر تشریف لاتے تھے ان حالات میں اگر امام حسن علیہ السلام معاہدۂ جنگ بندی نہ کرتے تو سوائے قتل و گرفتاری کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ معاہدہ نہ کرنے کی صورت میں خطراتِ عظیمہ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ مخلصوں کی جو جماعت ان کے ساتھ تھی سب ختم ہو جاتی۔

معاہدۂ جنگ بندی نہ کرنے کی صورت میں معاویہ کے رویۂ

---

[1] بحار الانوار [2] بحار الانوار

استبداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا۔ اس کی غلط کاریوں پر کسی کو اعتراض کرنے کا موقعہ نہ ملتا۔

خود قتل کروا کر مشہور کر دیا جاتا کہ امام حسنؑ کو ان کے شیعوں نے قتل کر دیا۔ اور یہ صورتِ حالات ایسی خطرناک تھی کہ قیامت تک اس کا دفعیہ مشکل تھا۔ ایسی صورت واقعہ سے قتل پر پردے پڑ جاتے اور حق و باطل میں تمیز نہ رہتی۔

اس صورت میں یہ کہہ کر کہ میں شیعیانِ علیؑ کو قتلِ امام کے قصاص میں قتل کر رہا ہوں۔ انھیں قتل کرنا شروع کر دیا جاتا۔ اس طریق سے شیعہ ختم ہو جاتے اور ان کو اپنی صفائی پیش کرنے کا بھی موقع نہ ملتا چنانچہ امام حسن علیہ السلام نے زید بن وہب کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا:۔

"وہ صلح کہ جس سے جان و مال و اہل کی حفاظت ہو۔ اس سے بہتر ہے کہ یہ مجھے قتل کر دیں۔ اور میرے اہل بیت کو ضائع کر دیں۔ اگر میں جنگ کو جاری رکھوں تو یہ لوگ مجھے گرفتار کر کے معاویہ کے حوالے کر دیں گے۔ حالانکہ خدا کی قسم مجھے عزت کی موت ذلت کی زندگی سے عزیز تر ہے۔"

شیعانِ علیؑ کی حفاظت جان کے لیے یہ روش اختیار کی گئی تھی اسی لیے شرائط معاہدہ میں شیعانِ علیؑ کا تحفظ بھی شامل تھا۔ چنانچہ جب صحابیٔ رسول حجر بن عدی نے اس معاہدہ کے وجوہات دریافت کیے تو

آپ نے فرمایا :-

"اے حجر، ہر شخص کی رائے تیری ہی طرح نہیں ہے۔ میں نے سب کچھ تمہاری بقا کے لیے ہی کیا ہے۔"[1]

امام حسن علیہ السلام کو اس معاہدہ میں امتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود ملحوظ تھی۔ چنانچہ حضور نے فوراً ارشاد فرمایا :-

"گو معاویہ مجھ سے حق چھیننا چاہتا ہے مگر میں نے امت کی اصلاح اور فتنہ و فساد کی بیخ کنی کے لیے اس معاہدہ کو ہی مناسب سمجھا اور میں نے امن عامہ کو خونریزی پر ترجیح دی ہے۔"[2]

سلیمان بن صرد خزاعی نے جب اس معاہدہ کے اسباب دریافت کیے تو اس کے جواب میں امام علیہ السلام نے فرمایا :-

"اگر میری کوششیں دنیاوی اغراض، ذاتی خواہشات اور سلطنت ظاہری کے لیے ہوتیں تو یہ معاویہ نہ مجھ سے زیادہ دانا ہے اور نہ زیادہ چالاک ہے۔ بلکہ جو مصالح و مقاصد میرے پیش نظر ہیں ان کو تم نہیں دیکھتے، میں نے امتِ اسلامیہ کو خونریزی سے بچانے کے لیے یہ اقدام کیا ہے۔ چنانچہ امن عامہ کی بحالی کو بھی شرائط معاہدہ میں داخل کر دیا ہے۔"

---

[1] بحار الانوار

[2] بحار الانوار

شرائطِ معاہدۂ التوائے جنگ

معاویہ اور ان کے باپ ابوسفیان کا سابقہ تجربہ بتلا چکا تھا، کہ بنی ہاشم کے خلاف تلوار اٹھانے کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ اس لیے اس نے امام حسن علیہ السلام کے پاس صلح کا پیغام بھیجا۔ اس پیغام میں بھی ایک سیاسی چال مضمر تھی اگر امام حسنؑ یہ معاہدہ نہ کرتے تو حبِ جاہ سے متہم ہوتے اور خونریزی کا الزام ان ہی کی ذات قدسی صفات پر عائد ہوتا۔ معاہدہ کے شرائط بھی بُرے نہ تھے۔ اس لیے امام حسن علیہ السلام نے یہ معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدہ کے مکمل شرائط کو علامہ ابن حجر مکی جیسے اہلِ سنت نے اپنی کتاب صواعق محرقہ میں لکھا ہے اگر ان شرائط کے علاوہ کوئی اور شرائط بھی ہوتے تو وہ ضرور لکھتے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی مصالح کے ماتحت کچھ شرائط بعد میں اضافہ کیے گئے ہیں :-

شرائط

۱- یہ کہ معاویہ حکومت میں کتابِ خدا اور سنتِ رسولؐ اور صحیح راستے پر چلنے والے خلفاء کے طریق پر عمل کرے گا۔

۲- یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کو خلیفہ (باصطلاح اہل سنت) کے نامزد

کرنے کا حق نہیں ہوگا۔

۳۔ یہ کہ شام، عراق، یمن و حجاز سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی۔

۴۔ حضرت علیؓ کے اصحاب و شیعہ جہاں بھی رہیں ان کے جان و مال و ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔

۵۔ یہ کہ معاویہ، حسنؑ بن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ اور خاندان رسولؐ میں سے کسی کو بھی نقصان پہنچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ نہ خفیہ طریق پر نہ علانیہ اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکایا، ڈرایا یا دہشت زدہ نہیں کیا جائے گا۔

یہ معاہدہ ربیع الاول یا جمادی الاول کو عمل میں آیا۔[1]

اگر اس معاہدہ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو حضرت امام حسن علیہ السلام نے وہ مقصد حاصل کر لیا تھا جس کے لیے ان کی اپنے فریق مخالف سے منازعت تھی۔ اہل بیت علیہم السلام کی خاندانی روایات سے یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ وہ حضرات ذاتی اغراض یا شخصی عناد کی وجہ سے کسی سے تصادم روا نہیں رکھتے تھے۔ ان کی اگر کسی سے مخالفت تھی یا لڑائی جھگڑا تھا تو اصولِ شریعت یا مذہب کے لیے ہوتا تھا۔ امام حسن علیہ السلام نے اس معاہدہ کی پہلی شرط سے معاویہ کو پابند کر دیا تھا کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق عمل

---

[1] صواعق محرقہ ابن حجر مکی ص۸۱ طبع مصر

کہ اس سے آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ اصولِ شریعت اور ہیں اور آئینِ حکومت اور ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے آلِ محمدؑ ہمیشہ کوشاں رہے کہ مبادا کبھی ایسا نہ ہو کہ مسلمان حکمرانوں کا طرزِ عمل عین شریعت سمجھ لیا جائے۔ دوسرے آپ نے اس معاہدہ سے ثابت کر لیا کہ اب تک معاویہ جس نہج پہ شام میں حکومت کر رہا تھا وہ کتاب و سنت کے خلاف تھا، اس سے ہر شخص واقف ہے کہ معاہدہ کی بنیادی باتیں وہی ہوتی ہیں جو دونوں فریقوں میں محلِ نزاع و بنائے مخاصمت ہوں، اگر حکومت شام کا سابقہ رویہ کتاب و سنت کے مطابق ہوتا تو اس شرط کی کون سی ضرورت تھی۔

اس کے بعد دوسری شرط یہ تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کو نامزد کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ اسی طرح آپ نے آئندہ زمانہ کے لیے بھی تحفظ کتاب و سنت کا انتظام کر دیا۔ یہ ممکن تھا کہ اس معاہدہ کے بعد امیر شام اپنی بقیہ زندگی میں کتاب و سنت پر عمل پیرا رہتے۔ لیکن بعد میں کوئی ایسا حکمران برسرِ اقتدار آجاتا جو کتاب و سنت کے خلاف عمل کرتا۔ اس لیے امام حسنؑ نے اس معاہدہ سے آئندہ اپنے جانشین بنانے کا حق ہی معاویہ سے سلب کر لیا تھا۔

تیسری شرط تھی شام، عراق، حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لیے امان ہوگی، اس شرط سے بھی یہ امر واضح ہو گیا کہ اس سے پہلے اموی حلقۂ اقتدار میں لوگوں کو امن و امان حاصل نہیں تھا، اگر حاصل ہوتا

تو اس شرط کی بھی ضرورت نہ تھی۔

چوتھی شرط حضرت علیؑ کے شیعہ جہاں بھی رہیں ان کے جان و مال ننگ و ناموس محفوظ رہیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اموی حلقہ اقتدار میں علیؑ کے شیعوں کا جان و مال ننگ و ناموس محفوظ نہیں تھا۔ جناب مالک اشتر کو زہر سے شہید کر دیا۔ حضرت محمد بن ابی بکر کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کی نعش سے خلاف انسانیت سلوک کیا گیا۔ یہ شرط اس لیے رکھی گئی تھی کہ اموی حکمرانوں کو ایسے واقعات دہرانے کا موقعہ نہ ملے

پانچویں شرط تھی حسنؑ ابن علیؑ، ان کے بھائی حسینؑ ابن علیؑ اور خاندانِ رسولؐ میں سے کسی کو بھی نقصان پہنچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔ یہ شرط بتلا رہی ہے کہ اموی سلطنت ایسی ہی کوششوں میں سرگرم عمل تھی اور اس کے سدِباب کے لیے یہ شرط رکھی گئی تھی۔

ان شرائط کے پیش ہونے پر اموی حکمرانوں کا خاموشی سے قبول کرنا۔ بتلا رہا ہے کہ ایسا سب کچھ ہو رہا تھا۔ ورنہ وہ کسی ایک شرط پر تو اعتراض کرتے کہ جب ایسا نہیں ہے تو پھر آپ یہ شرط کیوں عائد کر رہے ہیں۔

بعض کتب تاریخ میں اس معاہدہ میں بعض شرائط کا اضافہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ دینوری کے بیان کے مطابق شرائط معاہدہ اور بھی ہیں اور وہ یہ ہیں :-

ا۔ کسی عراقی کو بیروقتی عداوت کی بنا پر سزا نہ دی جائے۔ اور بلا استثنا سب کو امان دی جائے۔

۲۔ داراب جرد کا خراج حضرت حسنؑ کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔
۳۔ امام حسینؑ علیہ السلام کو دو لاکھ سالانہ وظیفہ دیا جائے۔
۴۔ وظائف میں بنی ہاشم دوسرے لوگوں پر مقدم رکھے جائیں۔

ان شرائط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرائط امام حسنؑ کی شہرت کو نقصان پہنچانے کے لیے وضع کی گئی ہیں ان کی غرض یہ ہے کہ سمجھنے والے یہ سمجھیں کہ امام حسنؑ نے داراب کے خراج اور اپنے بھائی امام حسینؑ کے دو لاکھ کے وظیفہ کے عوض اپنی سلطنت کو معاویہ کے ہاتھ بیچ دیا تھا اور وہ معاشرہ کی طبقہ بندی میں اپنے خاندان کی مالی حیثیت کو بڑھانا چاہتے تھے اور انہیں دوسروں سے زیادہ وظائف دلانا چاہتے تھے۔ اگر ان شرائط میں کچھ حقیقت ہوتی تو صواعق محرقہ کا مولف انھیں ہرگز نظر انداز نہ کرتا۔ نیز جب انھیں معیارِ درایت پر پرکھا جائے تو یہ باتیں خاندانِ رسالت کی روایات کے منافی معلوم ہوتی ہیں اور آلِ محمدؐ کے شعار کے برعکس ایجاد بندگان بنی امیہ معلوم ہوتی ہیں۔ حسنؑ اس باپ کے بیٹے تھے جنھوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں ایک پیسہ بھی اصلاحی بیت المال سے نہ لیا، یہودیوں کے باغوں اور کھیتوں میں محنت مزدوری کر کے اپنی ضروریات زندگی کو مہیا کیا بلکہ اپنے خون پسینہ کی کمائی، ایک ہزار غلاموں کو آزادی کی دولت سے مالا مال کیا اور رعایا میں ہمیشہ مال و دولت مساوات سے تقسیم فرمائی۔ چنانچہ تقسیم بالسویہ کی وہ امتیازی صفت تھی جس کا اعتراف ان کے مخالفوں کو بھی اسی طرح ہے جس

طرح ان کے دامن سے وابستہ شیعوں کو ہے وہ علیؑ جس نے اپنے حقیقی بھائی عقیل کو عام مسلمانوں سے زیادہ کچھ نہ دیا۔ امام حسن علیہ السلام اسی باپ کے بیٹے تھے، وہ دنیا کے مال و دولت کے لیے ہرگز سلطنت نہ چھوڑتے بلکہ ان کی سلطنت سے دست برداری مصالحت کیشی اور امن پسندی کے لیے تھی۔

ان روایات گھڑنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ اگر امام حسن علیہ السلام معاویہ کو جائز خلیفہ نہیں سمجھتے تھے۔ تو معاویہ کے عطیات کیوں قبول فرماتے تھے۔ اصولاً یہ تصرف جائز نہ تھا؛

اگر ان عطیات کے قبول فرمانے کو تسلیم بھی کر لیا جائے، تو امام حسن علیہ السلام امام برحق تھے۔ اس لیے منصوص واجب الاطاعت سلطان تھے۔ معاویہ کا قبضہ شرعاً ناجائز تھا۔ اسے شرعاً تصرف کا کوئی حق نہ تھا۔ امام حسنؑ اسے جائز مصرف پر خرچ کرنے کے لیے لیتے تھے۔ حضرات حسنینؑ اگر معاویہ سے مال وصول فرماتے بھی تھے تو اپنی ذاتی ضروریات یا اپنے اہل و عیال کی ضروریات پر خرچ نہیں کرتے تھے۔ جو کچھ معاویہ سے حاصل کرتے تھے، فقرا، و مساکین پہ صرف فرما دیتے تھے۔[1]

بہرکیف یہ دارابجرد کے خراج کی روایت اور یہ دو لاکھ کا افسانہ بنی امیہ کی اختراع ہے اگر یہ ذواتِ قدسیہ معاویہ سے کچھ حاصل

[1] بحار الانوار

کرتے بھی تھے تو فقرا و مساکین میں تقسیم کرنے کے لیے تھا۔

چنانچہ سید عبدالقادر مرحوم اور پروفیسر محمد شجاع الدین اپنی تاریخ اسلام میں قیام مدینہ کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں:۔

"حکومت سے دست برداری کے بعد حضرت حسنؓ نے مدینہ منورہ کو اقامت کے لیے منتخب کیا آپ نے رمضان ۴۰ھ سے ربیع الاول ۴۱ھ تک کوئی چھ ماہ کے قریب امور خلافت کو (سلطنت) کو انجام دیا۔ مدینہ میں حضرت حسنؓ کے اوقات عبادت، ریاضت اور تعلیم و تبلیغ میں بسر ہوتے تھے۔ معاہدہ کے مطابق جو سالانہ وظیفہ آپ کو وصول ہوتا تھا اس کا زیادہ حصہ (بلکہ تمام کا تمام) مسکینوں اور حاجتمندوں میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔ آپ کے دروازے ہر مفلوک الحال اور مصیبت زدہ پر کھلے رہتے تھے"۔[۱]

عام طور پہ بیان کیا جاتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام اس معاہدہ کے خلاف تھے مگر روایات صحیحہ سے امام حسین علیہ السلام کی مخالفت ثابت نہیں بلکہ اس کے برعکس امام حسین علیہ السلام کی تصدیق ثابت ہے حضرت امام حسن علیہ السلام کی طرح امام حسین علیہ السلام بھی اس معاہدہ سے متفق تھے۔

حضرت حجر بن عدی اور حضرت عبیدہ بن عمر جو اس معاہدہ کے

---

[۱] تاریخ اسلام صفحہ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔

بارے میں اختلاف رکھتے تھے۔ جناب امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

"آپ حضرات نے عزت کے بدلے ذلت کو خرید لیا۔ کم حقوق حاصل کر کے بہت سے حقوق سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اچھا اب آپ بذات خود آج ہماری بات مان لیجیے چاہیے پھر کبھی نہ مانیئے گا، وہ یہ کہ آپ امام حسن علیہ السلام کو اس معاہدہ کے راستہ پر جو انھوں نے اختیار کیا ہے چھوڑ دیجیے لیکن آپ اپنے ساتھیوں کو جو کوفہ میں ہیں یا کوفہ سے باہر جمع کیجیے اور ہم دونوں آدمیوں کو مقدمۃ الجیش کا افسر مقرر کیجیے۔ بس امیر شام کو بھی خبر نہ ہو گی۔ کہ ہم اچانک تلواریں مارتے ہوئے نظر آئیں گے۔"

امام حسین علیہ السلام نے فرمایا:۔

"یہ نہیں ہو سکتا، ہم عہد کر چکے ہیں اور قول و قرار ہو چکا ہے۔ اب عہد شکنی ممکن نہیں ہے۔"

علی بن محمد بن بشیر ہمدانی بھی اس جماعت میں شامل تھے۔ جو اس معاہدہ پر معترض تھے۔ ان کا بیان ہے کہ میں سفیان بن ابی لیلیٰ کی معیت میں مدینہ طیبہ پہنچا۔ ہم امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ آپ کے پاس اس وقت حسیب بن نجنیہ، عبداللہ بن وداک تیمی اور خراج بن مالک خثعمی موجود تھے۔ میں نے کہا۔ السلام

علیک یا مذل المومنین! سلام ہو آپ پر اے مومنوں کو ذلیل کرنے والے! آپ نے فرمایا، علیک السلام' بیٹھو! میں مومنین کی ذلت کا باعث نہیں ہوں۔ میں نے تو ان کی عزت رکھ لی اور ان کو خونریزی سے بچا لیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اب جنگ کا جوش و ولولہ باقی نہیں ہے اور کمزوری نمایاں ہو چکی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اگر جنگ جاری رکھی گئی تب بھی ایک دن یہی ہونا ہے کہ معاویہ کی بادشاہت قائم ہو جائے۔

اب یہ لوگ امام حسن علیہ السلام کے پاس سے اٹھ کر امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور امام حسن علیہ السلام کی پوری گفتگو بیان کی۔ آپ نے فرمایا۔ ابو محمد (امام حسنؑ) نے سچ فرمایا۔ تمھیں لازم ہے کہ تم میں سے ہر شخص خاموش ہو کر گھر میں بیٹھ جائے اور بیٹھا رہے، اسوقت تک جب تک یہ شخص زندہ ہے۔[1]

معاہدۂ جنگ بندی کے بعد

استحکام سلطنت حاصل ہونے کے بعد شرائط معاہدہ سے منحرف ہونے کے لیے کسی احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ امیر معاویہ نے ان شرائط میں سے کسی شرط کو بھی پورا نہیں کیا۔

لم یعف معاویہ لشی مما عاہد علیہ۔[2]

---

[1] الاخبار الطوال مولفہ ابو حنیفہ احمد بن داؤد الدینوری متوفی ۲۸۱ھ صفحہ ۲۲۲ مطبوعہ مصر

[2] تاریخ کامل ابن اثیر، تاریخ طبری، تاریخ مسعودی، تاریخ اعثم کوفی، روضۃ الصفا، روضۃ المنتظر، ریاض النضرۃ، کنز العمال، تذکرہ خواص الامہ۔

معاویہ نے جو جو شرائط معاہدہ کی تھیں کسی پر بھی وفا نہ کی۔ معاہدۂ التوائے جنگ کے بعد معاویہ نے کوفہ میں وارد ہوتے ہی یہ خطبہ پڑھا:۔

"میں نے تم سے اس لیے جنگ نہیں کی کہ تم نماز، روزہ اور حج کے فرائض ادا کرو کیونکہ ان چیزوں کے تم پہلے سے پابند ہو۔ میں تو تمھارے اوپر صرف حکومت کرنے کے لیے تم سے لڑا ہوں، اب حکومت مجھے حاصل ہو چکی ہے۔ خواہ اسے تم نہ چاہو آگاہ ہو جاؤ۔ کہ میں نے حسنؑ کے ساتھ چند شرائط طے کی ہیں اب وہ تمام میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ میں ان میں سے کسی ایک سے بھی وفا نہیں کروں گا۔"[1]

اس معاہدہ کے شرائط طے ہونے کے بعد معاویہ اور امام حسنؑ کوفہ کے قریب انبار میں جمع ہوئے اور وہیں اس معاہدۂ جنگ بندی پر دستخط ہوئے۔ اور لوگوں کی گواہیاں ثبت ہوئیں، مگر معاویہ نے ان شرطوں میں سے کسی کو بھی کبھی پورا نہ کیا۔ یہ معاہدہ ۲۵ ربیع الاول سنہ ۴۱ھ کو لکھا گیا۔ اس کے بعد معاویہ نے لوگوں سے اپنی بیعت لی۔ اس سال کا نام سنۃ الجماعۃ رکھا گیا۔ اس کے بعد معاویہ نے عمرو عاص کی تحریک پر حضرت امام حسن علیہ السلام کو خطبہ ارشاد فرمانے پر مجبور کیا۔ آں حضرت نے منبر پر جا کر ارشاد فرمایا:۔

"اے لوگو! خدا تعالیٰ نے ہم لوگوں میں سے اول کے ذریعہ سے

---

[1] بحار الانوار، الدمعۃ الساکبہ

تمہاری ہدایت فرمائی اور آخر کے ذریعے تمھیں خونریزی سے بچایا معاویہ نے اس امر پر مجھ سے جھگڑا کیا جس کا میں اس سے زیادہ مستحق ہوں لیکن میں نے لوگوں کی خونریزی کی وجہ سے اس امر کا ترک کردینا بہتر سمجھا اتم رنج و ملال نہ کرو کہ میں نے حکومت اس کے نااہل کو دے دی ، اور اس کے حق کو بے موقعہ رکھ دیا۔ میری نیت اس معاملہ میں صرف امت کی بھلائی ہے۔ یہاں تک فرمانا پائے تھے کہ معاویہ نے کہا بس! حضرت اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔" [1]

حضرت کے اس خطبہ کے بعد معاویہ منبر پر گیا اور اس طرح خطبہ پڑھا :-

"الحمد للہ۔ آج تمام امور کا انتظام ہو گیا ہے۔ بہت سے تردد و پریشانی کے بعد حق اپنی جگہ پر آکر ٹھہرا ہے میں نے اس معاملہ کی ابتدا میں جو شرطیں کی ہیں وہ محض باہمی ملاپ اور امت کے ایک زبان ہونے کے لیے تھیں۔ اب خرابیاں جاتی رہیں۔ ہمارا کہنا منظور خلائق ہو گیا اس لیے تمام شرطیں جو میں نے کی تھیں رد کر دی ہیں، اپنے وعدہ کا مجھے اختیار ہے، پورا کروں یا نہ کروں۔ اب کسی کو مجال نہیں کہ میری مخالفت کرے۔ سب پر میری اطاعت و فرمانبرداری لازم ہے۔"

---

[1] تاریخ خمیس ج ۲ ص ۳۲۵۔

اس کی یہ باتیں سنکر سب لوگ برہم ہو گئے۔ اسے .... دیں۔ اور مار ڈالنے کا قصد کیا۔ جس سے معاویہ ڈر گیا اور اپنی گفتگو پر پشیمان ہوا۔ اس کی یہ باتیں سنکر لوگوں نے خدمت اقدس امام حسن علیہ السلام میں عرض کیا کہ جب معاویہ اپنے عہد پہ قائم نہیں رہا۔ تو آپ بھی اس معاہدہ سے انکار کر دیجیے۔ آپ نے فرمایا، مجھے اپنے قول سے پھرنا مناسب نہیں لڑائی جھگڑا نہ کرو اور صبر سے کام لو۔

اس کے بعد امام حسن علیہ السلام مع امام حسین علیہ السلام و حضرت عبداللہؓ ابن جعفر اپنے اہل و عیال سمیت مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہیں رہنے لگے۔ معاویہ سال میں کچھ مال آپ کے پاس بھیج دیتا۔ اور حضرت اسے لے کر غرباء و مساکین میں خیرات کر دیتے۔[1]

خلافت اور معاویہ

معاہدۂ جنگ بندی سے امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کو خلافت سپرد نہیں کی اور نہ ہی اس کی خلافت کو تسلیم کیا۔ جیسا کہ امام حسنؑ کے خط سے جو انھوں نے معاویہ کو لکھا ہے، ظاہر ہے:۔

"اے معاویہ! خلافت میرا اور میرے اہل بیت کا حق ہے۔ تجھ پہ اور تیرے اہل بیت پر حرام ہے۔ جیسا کہ میں نے اپنے ید پاک رسول اللہؐ سے سنا ہے۔"

جسے امام حسن علیہ السلام حرام سمجھتے اور بقول رسولؐ حرام سمجھتے تھے

[1] تاریخ الائمہ صفحہ ۳۲۴ - ۳۲۵

اسے وہ کس طرح تسلیم کر سکتے تھے۔

شیعی نکتہ نگاہ سے تو معاویہ کی خلافت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سنی نکتہ نگاہ سے بھی وہ خلیفہ نہیں تھے۔ جیسا کہ مستند احادیث سے ظاہر ہے۔ یہ احادیث ایسی ہیں جن کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے مقالہ "مسئلۂ خلافت" میں لکھا ہے:۔

"اس بارے میں جو احادیث موجود ہیں وہ کثرت طرق، شہرت متن، قبول طبقات کی بنا پر حد تواتر تک پہنچ چکی ہیں"۔ [1]

احادیث نبویہ بطریق اہل سنت:۔

الخلافۃ بعدی ثلاثون عاماً ثم ملک بعد ذالک (اخرجہ اصحاب السنن)

خلافت میرے بعد تیس سال ہے۔ اس کے بعد بادشاہ ہیں"۔

حدیث ابوہریرہ:۔

الخلافۃ بالمدینۃ والملک بالشام [2]

"خلافت تو مدینہ میں ہے اور بادشاہت شام میں ہے"۔

ایک حدیث میں ہے "ثم یکون ملک عضوض" "اس کے بعد درندہ بادشاہ ہوں گے"۔ [3]

---

[1] مسئلۂ خلافت ص۱۰

[2] ایضاً [3] ایضاً

[3] مسئلہ خلافت ص۱۰

جلال الدین سیوطی ابن ابی شیبہ کے مصنف سے نقل کر کے لکھتے ہیں
کہ سعید بن جمہان کہتے ہیں کہ ہم نے سفینہ سے پوچھا کہ بنی امیہ اپنے
آپ کو خلفاء میں شمار کرتے ہیں، وہ کہنے لگے بنو زرقاء جھوٹے ہیں۔ یہ سخت
ترین بادشاہوں میں سے تھے۔ جن میں پہلا بادشاہ معاویہ تھا۔[1]

فخرالاسلام بزدوی لکھتے ہیں کہ معاویہ خلفاء میں نہیں تھے۔ ملوک
کے زمرہ میں تھے۔ اس حدیث کی بنا پر کہ آنحضرت نے فرمایا تھا، کہ
خلافت میرے بعد تیس برس تک رہے گی پھر ایک بادشاہ ہوگا۔ تیس
برس جناب امیرؑ و حضرت حسنؑ پر ختم ہو گئے۔ سیوطی تاریخ الخلفاء میں
لکھتے ہیں کہ علماء کا یہی قول ہے۔[2]

معاویہ کے حکومت پر تسلط حاصل کرنے کے بعد سعد بن ابی وقاص
ان کے پاس آئے اور سلام کرتے ہوئے کہا، "السلام علیک ایھا الملک"
اے بادشاہ تم پر سلام ہو۔ معاویہ ہنسے اور کہا، ابواسحٰق! اگر امیرالمومنین
کہہ کر سلام کرتے تو تمہارا کیا نقصان تھا؟ سعد نے جواب دیا کہ یہ بات
تم خوش ہو کر اور ہنس کر کہہ رہے ہو۔ خدا کی قسم یہ چیز کہ جس کے تم مالک
ہو میں اسکا مالک ہونا بھی گوارا نہیں کرتا۔[3]

---

[1] تاریخ الخلفاء، [2] اموی دور خلافت ص۴۰۸ و ص۴۰۹
[3] تاریخ کامل، ج ۳ ص۱۲۳، نصائح کافیہ ص۱۵۸

شہادت سرکارِ امن حضرت امام حسن علیہ السلام

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جناب امام حسن علیہ السلام کو ان کی بیوی جعدہ بنت اشعث نے اموی حکومت کے ایما پر زہر دے کر شہید کیا۔ اس سلسلہ میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ زہر امیر معاویہ کے ایما سے دیا گیا اور بعض کہتے ہیں کہ یزید نے اعلانِ ولیعہدی کے بعد یہ زہر دلایا۔ شیعی نکتہ نگاہ یہی ہے کہ امیر معاویہ نے زہر دلوایا۔

بروایت شیخ مفید علیہ الرحمۃ معاویہ نے جعدہ کی طرف درپردہ ایک لاکھ درہم بھیجا کہ اگر تو امام حسنؑ کو زہر کھلا کر ہمیشہ کے لیے رخصت کر دے تو میں تیرا عقد اپنے بیٹے یزید سے کر دوں گا۔ اسطرح تو ملکہ شام ہو جائیگی۔[1] معاویہ نے مزید وعدہ کیا کہ تیری زہر خورانی سے اگر امام حسنؑ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا تو تجھے پچاس ہزار مزید عطا کر دوں گا۔ اور سواد کوفہ اور بہتی سورا سے دس موضع جاگیریں بھی بخش دوں گا۔[2]

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ معاویہ نے امام حسنؑ کی خاطر ایک زہر قاتل جعدہ کی طرف روانہ کیا اور ایک لاکھ درہم کا بھی وعدہ کیا اب جعدہ کو طمع مال و دولت اور ملکۂ شام ہو جانے کی محبت نے اندھا کر

---

[1] کشف الغمہ ص ۱۶۴، مناقب ابن شہر آشوب ج ۴ ص ۱۰۳، روضۃ الصفا ج ۳ ص ۹ تا ۱۰

[2] الدمعۃ الساکبہ ص ۲۵۱ بحار الانوار ج ۱۰ ص ۱۴۳

دیا۔ امام حسنؑ کو زہر پلا دیا۔ اب معاویہ کا جب مطلب مکمل آیا تو ایفائے عہد کیوں کرتے؟

جعدہ نے حجت خدا کو شہید کر کے جہنم میں خرید یا اور معاویہ کی بے وفائی کے باعث دنیا کی جاہ و حشمت بھی نصیب نہ ہوئی۔ خسر الدنیا والآخرہ [۱]

استیعاب میں ہے کہ امام حسن علیہ السلام کو انکی بیوی جعدہ نے زہر دیا۔ اس میں معاویہ کی سازش تھی۔

مسعودی مروج الذہب میں لکھتے ہیں کہ قتادہ کا قول ہے کہ ان کی بیوی جعدہ نے ان کو زہر دیا، اس میں امیر معاویہ کی سازش تھی۔ انھوں نے پوشیدہ طور پر کہلا بھیجا تھا کہ اگر تم کسی حیلہ سے امام حسن علیہ السلام کو قتل کر دو تو میں تم کو ایک لاکھ درہم دوں گا۔ اور یزید کے ساتھ تمہارا نکاح کر دونگا جب حضرت امام حسن علیہ السلام نے وفات پائی تو معاویہ نے حسب وعدہ ایک لاکھ درہم اس کے پاس بھیج دیے۔ اور کہلا بھیجا کہ میں یزید کی زندگی کا خواہاں ہوں، ورنہ تیرا نکاح اس سے کر دیتا۔ [۲]

ان حقائق کی موجودگی میں اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ زہر خورانی کا کارنامہ خود یزید کا تھا۔ تو یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کی اطلاع امیر شام معاویہ کو نہ ہو اور ان کے ایما کے بغیر ایسا کیا گیا ہو۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کو زہر خورانی میں امیر شام کی شرکت اور بھی تاریخی قرائن سے ثابت ہے۔

---

[۱] بحار الانوار جلد ۱۰ صفحہ ۱۴۷ و ۱۲۸ - الدمعۃ الساکبہ صفحہ ۲۵۱

[۲] اموی دور خلافت ج ا صفحہ ۳۹۷ از افادات علامہ سید محمد باقر نقوی مدیر اصلاح کھجوہ

۱۔ معاہدۂ التوائے جنگ کے بعد گرم جنگ ختم ہو گئی ہے۔ اب سرد جنگ یا اعصابی جنگ شروع ہوئی جب امیر معاویہ کو اس سرد جنگ میں اپنی شکست کا یقین ہو گیا تو انھوں نے سرکار امام حسنؑ کو زہر دلوا دیا۔

۲۔ معاویہ کے تمام افعال خواہ وہ بعد جنگ صفین ہوں یا قبل جنگ صفین صرف ایک ہی اصول کے ماتحت سمجھ میں آ سکتے ہیں کہ وہ ایک پولیٹیکل ذہنیت کے انسان تھے۔ اور اپنے مقاصد کے حصول میں انھوں نے کبھی کسی امر کو مانع وحارج نہیں ہونے دیا۔ اور جس امر اور جس شخص کو اپنی خواہش حکومت میں خارِ راہ سمجھے ناجائز طریقہ سے بھی اسکا کانٹا نکالنے میں دریغ نہیں کیا۔

۳۔ تیسیر الباری شرح صحیح بخاری متعلقہ حاشیہ کتاب الفتن میں مولوی وحید الزماں لکھتے ہیں:۔

"معاویہ نے بعد وفات امام حسنؑ اظہارِ مسرت کر کے یہ بھی کہا تھا کہ امام حسنؑ ایک انگارہ تھے جسے اللہ نے بجھا دیا۔"

۴۔ ابن خلکان لکھتے ہیں:۔

"فاختہ بنت قرظ زوجہ معاویہ نے امام حسنؑ کی خبرِ وفات پر جب معاویہ نے تکبیر کہی تو کہا، افسوس فاطمہ کا بیٹا دنیا سے اُٹھے اور آپ تکبیر کہیں۔ امیر معاویہ نے کہا، کہ میں نے کچھ طعن و تشنیع یا کسی کی دلآزاری کے لیے تکبیر نہیں کہی بلکہ میرے دل کو ایک بڑے خطرہ سے اطمینان ہوا اس لیے میں نے تکبیر کہی۔"[۱]

---

[۱] حیوۃ الحیوان ج ۱ ص ۵۱

تجہیز و تکفین

جنازے پر تیر اندازی

حضرت حسنؓ کا مدینہ میں ماتم حضرت حسنؓ کی رحلت معمولی واقعہ نہ تھا بلکہ صلح و مساعلت کا ماتم تھا۔ حلم و عفو کا ماتم تھا، صبر و تحمل کا ماتم تھا، استغناء و بے نیازی کا ماتم تھا۔ خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ کا ماتم تھا۔ اس لیے آپ کی وفات پر مدینہ میں گھر گھر صفِ ماتم بچھ گئی، بازار بند ہو گئے۔ گلیوں میں سناٹا چھا گیا۔ بنی ہاشم کی عورتوں نے ایک مہینہ تک سوگ منایا۔ حضرت ابوہریرہؓ مسجد میں فریاد و فغاں کرتے تھے اور پکار پکار کر کہتے تھے، لوگو! آج خوب رو لو کہ رسول اللہؐ کا محبوب دنیا سے اُٹھ گیا۔[۱]

جنازے پر انسانوں کا اتنا ہجوم تھا کہ اس سے پہلے مدینہ میں کم دیکھنے میں آیا تھا۔ ثعلبہ بن ابی مالک جو اس تعزیت میں شریک تھے، راوی ہیں کہ حضرت حسنؓ کے جنازے پر اتنا ازدحام تھا کہ اگر سوئی جیسی مہین شے بھی پھینکی جاتی تو زمین پر نہ گرتی۔[۲]

امام حسنؑ نے وصیت فرمائی تھی کہ مجھے حرم نبوی میں سرکار رسالت محمد مصطفےٰ

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۰۱

[۲] تہذیب الکمال ص ۹۸، سیر الصحابہ ج ۶ ص ۱۰۷

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس دفن کرنا۔ چنانچہ امام حسین علیہ السلام نعش کو دفن کرنے کے لیے روضۂ رسولؐ میں لائے مگر بنو امیہ و گروہ عثمانی وغیرہ مانع ہوئے۔ بعض روایات میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ سوار ہو کر آئیں اور فرمایا گھر میرا ہے میں دفن ہونے نہیں دیتی۔ بعض لوگ غل مچا کر کہنے لگے اے عائشہ! کبھی اونٹ پہ سوار ہو کر جنگِ جمل میں لڑتی ہو کبھی خچر پر سوار ہو کر پیغمبرؐ کے نواسہ کے جنازے پر جھگڑتی ہو۔ اور ان کے نانا کے پاس دفن ہونے نہیں دیتیں۔ ہر چند لوگوں نے کہا، مگر ام المومنین حضرت عائشہ نہ مانیں۔ جھگڑا بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ تیر بارانی شروع ہوئی۔ اور کئی تیر امام حسن علیہ السلام کے تابوت میں پیوست ہو گئے۔ مجبوراً لوگوں نے امام حسن علیہ السلام کی نعش مبارک کو بقیع میں لا کر دفن کیا۔[1]

---

[1] کامل ج ۳ ص ۱۸۲ وغیرہ۔ تاریخ ائمہ ص ۳۳۵

اولاد و ازواج

شیخ مفید علیہ الرحمۃ سے منقول ہے کہ امام حسن علیہ السلام کے آٹھ بیٹے اور سات بیٹیاں ہوئیں۔

(۱) زید بن الحسن [illegible] کی دو [illegible]یاں (۱) ام الحسن و (۲) ام الحسین
ام بشیر دختر مسعود عقبہ خزرجی کے وطن سے ہیں۔

(۲) حسن بن حسنؑ کہ جن کو حسن مثنیٰ کہتے ہیں۔
ان کی ماں خولہ بنت منظور فرازیہ ہیں۔

(۳) عمر بن الحسنؑ (۴) قاسم اور (۵) عبداللہ (۶) عبدالرحمن
ان کی ماں ام ولد ہیں۔

(۷) حسین اثرم (۸) طلحہ (۹) فاطمہ
ان تینوں کی ماں ام اسحٰق بنت طلحہ بن عبیداللہ تیمی ہیں۔
ام عبداللہ، فاطمہ، ام سلمہ، رقیہ ان میں سے ہر ایک کی ایک ہی ماں ہیں[۱]

کثرت ازدواج و کثرت طلاق ایک افسانہ ہے جسے امویوں نے وضع کیا ہے۔ امام مسموم پر اتہام ہے، افترا و بہتان ہے۔ اس کی افسانوی حقیقت کو ہم نے اپنی کتاب تاریخ حسن مجتبیٰ میں محققانہ انداز میں بیان کیا ہے جسے اس کا مطالعہ مقصود ہو وہ اسے تاریخ حسن مجتبیٰؑ میں دیکھے۔

ختم شد

---

[۱] ارشاد شیخ مفید علیہ الرحمۃ

(انصاف پریس لاہور)

ہماری مطبوعات

اصول و اصولِ شیعہ } رشحاتِ قلم سرکار حجۃ الاسلام علامہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطار اعلی اللہ مقامہٗ۔ ترجمہ فاضلِ جلیل مولانا سید ابنِ حسن صاحب قبلہ نجفی۔ شرق و غرب کے تمام علمار کی متفقہ رائے ہے کہ شیعہ مذہب کی ابتدا وارتقار اور امامیہ عقائد و مسلمات کے موضوع پر بیسویں صدی کی یہ سب سے زیادہ جامع۔ مستند۔ مدلل۔ سنجیدہ اور بلند پایہ تصنیف ہے۔ اعلیٰ کتابت معیاری طباعت۔ سفید کاغذ۔ مضبوط جلد۔ خوشنما گردپوش۔ قیمت صرف دو روپے ؎

اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ حصہ اوّل

تالیف پروفیسر خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری۔ جو ملکِ عرب دورِ جاہلیت اور عہدِ رسالت کے تمام و کمال حالات پر مشتمل ہے۔ شیعہ طلبار و طالبات کیلئے بہترین تحفہ۔ حجم ۲۷۲ صفحات۔ قیمت صرف ۲ روپے ؎

حصہ دوم۔ بعد وفاتِ رسولؐ کے حالات۔ خلافت کی ابتدا۔ مسئلہ خلافت کے متعلق شیعہ نقطۂ نظر کی وضاحت۔ خلفائے ثلاثہ کے عہد حکومت کے مفصل حالات۔ حجم ۳۵۴ صفحات۔ قیمت صرف تین روپے ؎

گلستانِ حکمت } کلماتِ قصار۔ حضرت علی مرتضیٰؑ کے حکیمانہ اقوال کا مجموعہ۔ تالیف آقای احمد علی سپہر۔ ترجمہ علامہ سید مرتضیٰ حسین فاضل۔ انسا[نی] اور مثالی زندگی کے اصول۔ حجم ۵۰ صفحات۔ قیمت

شہیدوں کی باتیں } شاعرِ اہلبیت حضرت نجم[...] مدظلہٗ۔ اس کتاب میں [...] حضرت امام حسینؑ اور آپکے اصحاب باوفا کے ان [...] کیا گیا ہے جو میدانِ کربلا میں انکی حق ترجمان زبا[ن ...] بلاک کی عمدہ چھپائی۔ دبیز موٹا کاغذ۔ خوشنما سرورق [...]

لغات المذہب } شاعرِ اہلبیت حضرت نجم آفند[ی ...] اپنے بچوں کی مذہبی بنیا[د] مضبوط بنانے کیلئے لغات المذہب کا مطالعہ ضرور کرائیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ قیمت صرف ۸ ر

تبلیغی نوحے } از حضرت مضطر حیدری تلمیذ حضرت نجم آفندی مدظلہٗ۔ مکمل سیٹ:۔
۱۔ طوفانِ غم۔ قیمت ۱۲ر ؎ ۲۔ دیوانِ غم۔ قیمت ۱۰ر
۳۔ طغیانِ غم ۸ر ؎ محصولڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔

ملنے کا پتہ:۔ **رضاکار بک ڈپو۔ لاہور**